شمع فروزاں

(چوتھا حصہ)

اردو کے سب سے کثیر الاشاعت روز نامہ ''منصف'' حیدرآباد اور ملک کے دوسرے معروف اردو اخبارات میں شائع ہونے والے مقبول عام وخاص کالم کے تین سال (9-2007) کے مضامین کا مجموعہ، جس میں ملکی وبین ملکی پس منظر میں نئے سماجی ، معاشی اور سیاسی مسائل پر بصیرت افروز گفتگو کی گئی ہے، دلآویز اُسلوب، عام فہم زبان اور دلچسپ طرزِ بیان ـ

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

بہ اہتمام : المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

ناشر : کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، ضلع سہارنپور (یوپی)

طبع اوّل ، ۲۰۱۰ء ، ۱۴۳۱ھ

نام کتاب : شمع فروزاں (چوتھا حصہ)

مصنف : حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ترتیب وکمپوزنگ : مفتی محمد عبداللہ سلیمان مظاہری

قبا گرافکس، فون: 9704172672 - 91+

اشاعت : ۲۰۱۰ء

صفحات : ۲۸۴

قیمت : ....روپے

بہ اہتمام : المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد (انڈیا)

ملنے کے پتے

- المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد، تعلیم آباد، قبا کالونی، پہاڑی شریف روڈ، حیدرآباد
- مکتبہ نعیمیہ، دیوبند، ضلع سہارنپور (یوپی)
- دکن ٹریڈرس، مغل پورہ، حیدرآباد

فہرست مضامین

ذکر وفکر

نئے مسائل

شمعِ فروزاں

فکر و نظر

مذہب اور قانون

قدرت نے دو قوتیں انسان کے ساتھ رکھی ہیں ، ایک انسان کی خواہشات ، دوسرے اخلاقی جوہر،خواہشات بعض اچھی بھی ہوتی ہیں،اور بعض بُری بھی،خواہشات کی دنیا بہت وسیع ہے ،اگر انسان ہر خواہش پوری کرنے لگےتو وہ گناہ سے بچ نہیں سکتا،مثلاً انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت مند ہوجائے، چاہے اس کے لیے رشوت لینی پڑے، ظلم وزیادتی کا راستہ اختیار کرنا پڑے، دوسروں کی زمینوں اور جائیداد پر ناجائز قبضہ کی نوبت آجائے اور اخلاقی جوہر انسان کو نیکی وبھلائی کی طرف بلاتا ہےاور ظلم وزیادتی اور بُری باتوں سے روکتا ہے،انہیں دونوں قوتوں کو حدیث میں ''لمۂ ملکوتی'' اور ''لمۂ شیطانی'' سے تعبیر کیا گیا ہے،(مشکوٰۃ شریف: ۱/۱۹، باب فی الوسوسة)مہذّب انسانی معاشرہ میں خواہشات کو اخلاق کے دائرہ میں رکھنے کے لیے قانون بنایا جاتا ہے،اس لیے قانون کی بڑی اہمیت ہے،اور اسی پر سماج میں عدل وانصاف کا قائم رہنا موقوف ہے۔

چند روز پہلے ۲۶/ جنوری کی تاریخ گذری ہے، جو ہمارا قومی دن ہے ؛ اس لیے کہ ۱۹۵۰ء میں اسی تاریخ کو دستورِ ہند منظور ہوا تھا،اور ایک آئین کے تحت ملک کے تمام شہریوں نے ایک ساتھ رہنے کا عزم کیا تھا،ہمارے ملک نے نصفِ صدی سے زیادہ اس دستور کا تجربہ کرلیا ہے، جو دنیا کا مفصّل اور طویل دستور سمجھا جاتا ہےاور ۲۳/ ابواب، ۳۹۵/ دفعات اور ۱۲/جدولوں پر مشتمل ہے، یہ ایک کڑوی سچائی ہے کہ دستور بننے اور اس کے نافذ ہونے کے باوجود لاقانونیت ہمارے سماج کا ایک لازمی جز بن گئی ہے، اس پس منظر میں ملک کے بہی خواہوں کو سوچنے کی ضرورت ہے کہ وہ کس طرح لوگوں کے رجحان کو بدلیں،انہیں صحیح رُخ دیں،اور انہیں قانون کا پابند بنائیں؟

قانون کے سلسلہ میں اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قانون کا کام انسانی زندگی کی تہذیب ہے، تہذیب کے معنیٰ '' کانٹ چھانٹ '' کے ہیں ، جیسے مالی پھول پودے لگاتا ہے ؛ لیکن اگر صرف پودے لگا کر چھوڑ دے تو وہ ایک جنگل بن جائے گا ، اسی لیے اس کی کانٹ چھانٹ کی جاتی ہے اور قرینہ کے ساتھ اس کو سنوارا جاتا ہے ، یہی حال انسانی خواہشات وجذبات کا ہے ، انسان کے اندر جو خواہشات رکھی گئی ہیں ، وہ اپنی اصل کے اعتبار سے بری نہیں ہیں ؛ لیکن جب یہ حدِ اعتدال سے گذر جاتی ہیں تو دوسروں کے ساتھ ناانصافی کی صورت اختیار کر لیتی ہیں ؛ اسی لیے قانون کی ضرورت پڑی ہے کہ انسان اپنی خواہشات پر قابو رکھے ، اور اس کو عدل واعتدال کے دائرہ سے باہر نہ جانے دے ، قرآن مجید کی اصطلاح میں اسی کا نام '' تقویٰ '' ہے اور قرآن مجید نے ۷۴ مواقع پر مختلف اسلوب میں تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید کی ہے اور اسے سراہا ہے۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ قانون بنانے کا حق کس کو ہے؟—— ایک جملہ میں اس کا جواب یہ ہے کہ جو علم بھی رکھتا ہو اور عدل وانصاف بھی کرسکتا ہو ، جو شخص کسی کی ضروریات اور اس کے فوائد ونقصانات سے واقف نہ ہو ، وہ اس کے مسائل کے بارے میں یقیناً صحیح رہنمائی نہیں کرسکتا ، مثلاً اگر کمپیوٹر انجینئر سے کہا جائے کہ وہ ڈاکٹروں کے لیے ضابطۂ اخلاق متعین کرے اور ڈاکٹر سے کہا جائے وہ کسی صحافی کے مسائل کو حل کرے تو یہ یقیناً ناسمجھی کی بات ہوگی ؛ اس لیے قانون وہی بنا سکتا ہے ، جو ان لوگوں کی ضروریات اور مصالح ومفاسد سے پوری طرح باخبر ہو ، جن کے لیے قانون بنا رہا ہے ؛ ورنہ اس کا بنایا ہوا قانون ہرگز قابل عمل نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح یہ بات بھی ضروری ہے کہ قانون بنانے والے ان تمام لوگوں کے ساتھ انصاف کرسکیں ، جن کے لیے قانون بنایا گیا ہے ، مثال کے طور پر ہمارے ملک میں مسلمانوں سے کہا جائے کہ وہ اس ملک کا دستور بنائیں تو وہ اپنے طبقہ کی بھلائی دیکھیں گے ، ہندوؤں ، سکھوں اور دوسرے مذہبی گروہوں کے ساتھ وہ انصاف نہیں کرسکیں گے ، یہی حال اس وقت ہوگا جب ہندوؤں یا سکھوں کے ہاتھ میں قانون کی باگ دے دی جائے ، اسی طرح اگر ایک علاقہ کے لوگ قانون بنانے کا اختیار رکھتے ہوں تو وہ دوسرے علاقہ کے لوگوں کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتے ؛ اس لیے یہ ضروری ہے کہ قانون بنانے والی شخصیت علم اور عدل دونوں کی حامل ہو۔

اسی لیے اسلام کی نظر میں اصل قانون بنانے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، اللہ تعالیٰ نے بار بار اپنے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ علیم وخبیر ہے یعنی پوری کائنات اس کے علم میں ہے، اور وہ ذرّہ ذرّہ سے باخبر ہے، اسی طرح اللہ تعالی نے بار بار اپنی اس صفت کو بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ ذرا بھی ظلم نہیں کرتے، اس کی ذات ظلم وتعدی سے ماوراء ہے، یہ بھی اسی حقیقت کا اظہار ہے کہ انسان کے لیے زندگی کا قانون مقرر کرنا اور دستور بنانا خدا ہی کا حق ہے: { **إن الحكم إلا لله** } (الأنعام: ۵۷)، { **ألا له الخلق و الأمر** } (الأعراف: ۵۴) انسان کا بنایا ہوا قانون ہمیشہ ان دو پہلوؤں میں سے کسی پہلو سے ناقص رہے گا، یا تو وہ علم کی کوتاہی پر مبنی ہوگا، یا انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہوگا، اسی لیے قانون میں مذہب کی بڑی اہمیت ہے؛ کیوں کہ مذہب کا رشتہ خدا کی تعلیمات سے جڑا ہوا ہوتا ہے؛ لہذا جو مذہب محفوظ ہوگا، وہ انسانی فطرت سے ہم آہنگ اور انسانی ضروریات کی تکمیل کا اہل ہوگا، قانون جب مذہب سے آزاد ہوتا ہے، تو اپنے اصل مقصد کو کھو دیتا ہے۔

قانون کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی خواہشات بے لگام نہ ہو جائیں؛ لیکن جب مذہب کی دیوار ٹوٹ جاتی ہے، تو پھر خواہشات کے لیے کوئی سرحد باقی نہیں رہتی، انسان اپنے آپ کو آزاد کہتا ہے؛ لیکن حقیقت میں وہ اپنی ہی خواہشات کا غلام ہوتا ہے، یہ غلامی بعض اوقات انسانوں کی غلامی سے بھی زیادہ نقصان دہ ہوتی ہے؛ کیوں کہ یہ انسان کو فطرت کا باغی بنا دیتی ہے، اور فطرت سے بغاوت کرنا چٹان سے سر ٹکرانے کے مترادف ہے۔

اس کی مثال آج کی مغربی تہذیب ہے، مغرب نے آج قانون کو مذہب واخلاق کی حدود سے آزاد کر دیا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو چیزیں انسان کے لیے واضح طور پر مہلک اور نقصان دہ ہیں، ان کو بھی جائز ٹھہرا لیا گیا ہے، مثال کے طور پر انسان کا ہوش وحواس کی حالت میں ہونا فطرت کے مطابق ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص بے ہوش ہو جائے تو اس کے تمام متعلقین بے قرار ہو جاتے ہیں، شراب اور دوسری منشیات کا کام بھی یہی ہے، کہ وہ کچھ وقفہ کے لیے انسان کے عقل وشعور کو معطل کر کے رکھ دیتی ہیں، نیز وہ جسم کے بہت سے اعضاء کے لیے انتہائی نقصان دہ ہیں؛ بلکہ اکثر حالات میں وہ ایسے زہر کا کام کرتی ہے، جو بہ تدریج انسان کو ہلاکت کی طرف لے

جا تا ہے؛اس لیے ساری میڈیکل دنیا نشہ آور چیزوں کے نقصان دہ ہونے پر متفق ہے،مگر اس کے باوجود آج دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک نے شراب کو سندِ جواز دے دیا ہے۔

اسی طرح اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ خدا نے مرد وعورت کو ایک دوسرے کی صنفی ضرورت کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے؛اس لیے ہمیشہ سے مرد وعورت کا ایک دوسرے سے نکاح ہوتا رہا ہے ؛ کہ اس میں ایک دوسرے کی ضرورت کی تکمیل بھی ہے اور نسلِ انسانی کی افزائش بھی ، دنیائے طب کے تمام لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ اس کے برخلاف مرد یا عورت کا اپنی ہی جنس سے صنفی خواہش کو پوری کرنا نہایت ہی نقصان دہ ہے،اور یہ ایڈس جیسی خطرناک ولا علاج بیماری کا سبب بنتا ہے،اس کے باوجود آج اکثر مغربی ملکوں نے اس باغیانہ طریقۂ کار کو جائز قرار دیا ہے ؛ اس لیے یہ حقیقت ہے کہ قانون اگر مذہب سے آزاد ہوجائے تو بے سمتی اختیار کر لیتا ہے اور لا قانونیت خود ایک قانون بن جاتی ہے ؛اسی لیے یہ بات ضروری ہے کہ جمہوری ممالک بھی مذہب اور اخلاق کی مسلّمہ اقدار کے دائرہ میں رہتے ہوئے قانون بنائیں،زنا اور جنسی انحراف کی ممانعت ،عریانیت اور منشیات کا مذموم ہونا تمام مذاہب کی مشترک تعلیمات ہیں،اور یہ قانونِ فطرت کے عین مطابق ہے،ایسی چیزوں کو جائز قرار دینا آزادی کے نام پر ہوس کی غلامی ہے۔

قانون پر عمل کرنے کے لیے عام طور پر چار محرکات ہوتے ہیں،قانون کا خوف،ضمیر کی آواز،سماج کا خوف،خدا اور آخرت کا تصور،اس کی تفصیل یہ ہے کہ قانون جب بھی کسی چیز کا حکم دیتا ہے،یا کسی بات سے منع کرتا ہے،تو اس کی مخالفت کے لیے سزا بھی تجویز کرتا ہے،سزا کا خوف انسان کو قانون کی مخالفت سے باز رکھتا ہے؛لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ قانون کا خوف اسی وقت تک ہوتا ہے، جب تک کہ قانون کی آنکھ دیکھ لے، جب کوئی دیکھنے والی آنکھ اور ٹوکنے والی زبان موجود نہ ہو تو انسان قانون کی خلاف ورزی پر جری ہوجاتا ہے،دوسرا محرّک ضمیر کی آواز ہے،اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرتِ سلیم پر پیدا فرمایا ہے؛اس لیے فطری طور پر وہ گناہ سے شرم محسوس کرتا ہے اور اس کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگتا ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان جرم کو چھپا کر کرنا چاہتا ہے، بہت سے قاتلوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ عدالت سے تو بری ہوگیا؛لیکن اندرونی احساسِ ملامت کی وجہ سے مختلف نفسیاتی امراض نے اسے گھیر لیا،اور کبھی کبھی تو یہ احساس اتنا شدید ہوجاتا ہے کہ مجرم پاگل ہو

جاتا ہے ؛ اس لیے گناہ سے روکنے کا یہ ایک اہم محرّک ہے ، غور کیجئے تو کسی بھی سماج میں سنگین مجرموں کی تعداد ایک دو فی ہزار سے زیادہ نہیں ہوتی ، باقی لوگ جو جرم سے باز رہتے ہیں ، وہ زیادہ تر اسی محافظ کی وجہ سے جو انسان کے سینہ کے اندر ضمیر کی صورت بیٹھا رہتا ہے ؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خواہشات کا غلبہ ، جذبات کا اشتعال ، اور اس کے ساتھ ساتھ سزا سے بچ جانے کا اطمینان انسان کے لیے جرم کے ارتکاب کو آسان کر دیتا ہے ، اور بہت سی دفعہ اس کے مقابلہ ضمیر کی آواز دب کر رہ جاتی ہے ۔

قانون شکنی سے بچنے کا تیسرا محرّک سماج کا خوف ہے ، انسان کے لیے سماج کی حیثیت حصار کی ہے ، وہ اس حصار کے اندر رہ کر ہی زندگی گذار سکتا ہے ؛ اسی لیے اسے ''سماجی حیوان'' کہا جاتا ہے ، انسان چاہتا ہے کہ وہ اپنے سماج میں اس طرح رہے کہ لوگ اس پر اعتماد کریں ، اس کا احترام کریں اور وہ لوگوں کے محبوب بن کر رہے ، نفرت و بے اعتمادی کے ماحول میں انسان کی زندگی بے سکون ہو جاتی ہے اور سکون ہی انسان کے لیے سب سے زیادہ مطلوب شئ ہے ؛ لیکن جب ایک دفعہ انسان کا مجرمانہ چہرہ سماج کے سامنے آجاتا ہے ، تو پھر جھجک ختم ہو جاتی ہے اور انسان سوچنے لگتا ہے کہ جب کردار کا چہرہ داغدار ہو ہی چکا ہے ، تو ایک داغ لگے یا دس ، اس سے کیا فرق پڑتا ہے ؟ یہ سوچ سماجی خوف کو کم کر دیتی ہے ۔

قانون شکنی کو روکنے والا تیسرا محرّک خدا کا خوف اور آخرت کی جوابدہی کا احساس ہے ، یہ خوف رات کی تاریکی اور گھر کی تنہائی میں بھی انسان کے ہاتھ تھام لیتا ہے اور اس کو جرم سے باز رکھتا ہے ، رسول اللہ ﷺ کے عہد میں متعدد ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ جن لوگوں سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ، انہوں نے — یہ جاننے کے باوجود کہ اس غلطی کی سزا نہایت ہی سنگین اور سخت ہے ، — خدا کے سامنے جوابدہی کے احساس کے تحت خود حاضر ہو کر غلطی کا اعتراف کیا ، اور خواہش کی کہ اس پر سزا جاری کر دی جائے ، یہی وجہ ہے کہ آج کے دورِ انحطاط میں مذہبی شخصیتوں کے یہاں جرم کا تناسب سب سے کم ہے ، اخبارات میں بعض اوقات مذہبی شخصیتوں سے متعلق بعض افسوس ناک خبریں آجاتی ہیں ؛ لیکن مجموعی تعداد کے لحاظ سے ان کا تناسب بہ مقابلہ دوسرے لوگوں کے بہت کم ہوتا ہے ، اگر کپڑا سیاہ ہو جائے اور اس پر روشنائی کی ایک دوات بھی ڈال دی جائے ، تو بدنمائی نہیں

ہوتی ؛ لیکن سفید کپڑے کو بدنما کرنے کے لیے ایک قطرہ کا گر جانا بھی کافی ہوتا ہے، یہی مثال مذہبی شخصیتوں اور معاشرہ کے دوسرے گروہوں کی ہے، پس یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ مذہب انسان کو پوری طرح قانون کی خلاف ورزی سے روک دیتا ہے ؛ لیکن یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ قانون کی خلاف ورزی سے بچانے کا سب سے مؤثر محرّک ہے!

اس لیے قانون کا مذہب سے گہرا تعلق ہے، کم سے کم ایک محب وطن ہونے کی حیثیت سے ہندوستان کے بارے میں ضرور یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مغرب کی پیروی میں اور امریکہ و یورپ کے دباؤ سے متأثر ہوکر ایسے قوانین نہیں بنانے چاہییں، جو مذہب اور اخلاق کے دائرہ سے باہر ہو جائے، جن سے مسلّمہ قدریں ٹوٹ جائیں، اور جو فطرت سے بغاوت کے دائرہ میں آجائے، اسی میں ملک کی بھی بھلائی ہے اور انسانیت کی بھی۔

۹/فروری ۲۰۰۷ء

تکفیر اور علماء ومشائخ کی ذمہ داریاں

اس بات سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ اس وقت اتحاد واجتماعیت مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی ضرورت ہے، یہ ضرورت عالم اسلام میں بھی ہے اور اسی قدر ضرورت ان مسلمانوں کے لیے بھی ہے، جو غیر مسلم اکثریت ممالک میں اقلیت کی حیثیت سے زندگی گذار رہے ہیں اور یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ امت کو جوڑنے اور ان کو متحد کرنے میں علماء، مشائخ اور مذہبی قائدین کا بڑا اہم کردار ہے، علماء اور مذہبی قائدین کی بے اعتدالی امت میں اختلاف وانتشار کا ایک اہم سبب ہے اور اس بے اعتدالی کا سب سے نمایاں پہلو مسلمانوں کو کافر قرار دینے میں کچھ تشدد پسند لوگوں کی جسارتِ بے جا ہے، اگر دوسروں کو کافر ومشرک ٹھہرانے میں احتیاط واعتدال کا رویہ اختیار کیا جائے، تو امت کے موجودہ اختلاف میں شاید پچھتر فیصد کمی واقع ہو جاتے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ ایمان بہت بڑی نعمت ہے، اس سے چونکہ دنیا وآخرت کی فلاح ونجات متعلق ہے، اس لئے خدا نے ایمان لانے کو ایک آسان عمل بنایا ہے، کوئی بھی شخص جو اللہ تعالیٰ کی توحید، رسول اللہ ﷺ کی رسالت، اور آخرت پر یقین کا اظہار کرے، وہ اسلام کے دائرہ میں آگیا، جیسے ہی اس نے زبان سے توحید ورسالت کی شہادت دی، اس پر مسلمانوں کے احکام جاری ہوں گے، یہاں تک کہ اس کے دل میں جو کچھ ہے، اسے کھرچ کر دیکھنے کا بھی ہمیں حق نہیں ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی ملاقات پر، اس کے رسولوں پر اور دوبارہ اٹھائے جانے پر یقین رکھو'' (بخاری، حدیث نمبر: ۳۷، باب : سوال جبريل عليه السلام النبي ﷺ عن الإيمان و الإسلام والإحسان وعلم الساعة)

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کچھ لوگ منافق تھے، جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے؛ لیکن بہ باطن وہ مسلمان نہیں تھے، حضور ﷺ نے ان کے ساتھ مسلمانوں ہی کا سا معاملہ فرمایا، آپ ﷺ کو من جانب اللہ ان کے اسماء بتادیئے گئے تھے، اس کے باوجود آپ ﷺ نے عام صحابہ ؓ پر اس کو آشکارا نہیں فرمایا؛ تاکہ کہیں لوگ ان کے ساتھ کلمہ گو ہونے کے باوجود وہ برتاؤ نہ کرنے لگیں، جو کسی مسلمان کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا۔

ایمان لانا جتنا آسان ہے اور مسلمان ہونے کا حکم لگانا جتنا سادہ اور سہل ہے، کسی شخص کو دائرۂ ایمان سے باہر قرار دینا اسی قدر نازک بات ہے، اور اس میں نہایت احتیاط برتنے کا حکم ہے، جب تک کسی شخص کے کفر کا یقین نہ ہوجائے، اس پر کافر ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''جب کوئی شخص مسلمان کو کافر کہتا ہے تو یہ کفر اسی کی طرف لوٹ کر آجاتا ہے'' (مسلم، حدیث نمبر: ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، کتاب الإیمان، باب بیان حال الإیمان)

اسی لئے فقہاء نے تکفیر کے سلسلہ میں بڑی احتیاط کا حکم دیا ہے؛ چنانچہ معروف حنفی فقیہ علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں: ایسے شخص کے کافر ہونے کا فتویٰ نہیں دیا جائے، جس کے کافر ہونے میں اختلاف ہو، اگر چہ کوئی ضعیف روایت ہی کیوں نہ ہو؛ اس لیے کہ کفر بہت سنگین چیز ہے۔

(رسم المفتي: ص: ۱۹۰، مطبوعہ زکریا، دیوبند)

اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کا ایک دلچسپ واقعہ بھی قابل ذکر ہے، جسے علامہ ابن نجیم مصریؒ نے نقل کیا ہے:

> ''امام ابوحنیفہؒ سے ایک شخص کے بارے میں پوچھا گیا، جس نے کہا تھا کہ مجھے جنت کی امید نہیں، جہنم کا خوف نہیں، اللہ کا ڈر نہیں، مردار کھاتا ہوں، قراءت اور رکوع، سجدے کے بغیر نماز پڑھ لیتا ہوں، اَن دیکھی چیزوں کی گواہی دیتا ہوں، حق کو ناپسند کرتا ہوں اور فتنہ کو پسند کرتا ہوں، آپ کے شاگردوں نے کہا اس شخص کا معاملہ تو بڑا مشکل ہے، امام

صاحب نے فرمایا: یہ شخص اللہ سے امید رکھتا ہوگا نہ کہ جنت سے اور اللہ سے ڈرتا ہوگا نہ کہ دوزخ سے، اس بات کا خوف نہیں رکھتا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اس پر ظلم کرتے ہوں گے، مچھلی اور ٹڈی کھاتا ہوگا، نماز جنازہ پڑھتا ہوگا، اللہ کے ایک ہونے کی گواہی دیتا ہوگا، موت کو ناپسند کرتا ہوگا جو کہ حق ہے، مال و اولاد سے محبت کرتا ہوگا، جو قرآن کے بیان کے مطابق فتنہ ہیں، پوچھنے والا شخص کھڑا ہوا، اس نے آپ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ علم سے معمور ظرف ہیں'' (الأشباه و النظائر مع الحموي : ۳/۳۶۸ ، باب الفن السابع ، الحکایات و المرسلات)

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کلمۂ شہادتین کے پڑھنے سے انسان اسلام کے دائرہ میں آتا ہے، اور عملی زندگی میں اس کے مسلمان ہونے کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھے، کعبۃ اللہ کو قبلہ تسلیم کرے اور مسلمانوں کا ذبیحہ حلال سمجھے، چنانچہ حضرت انس ﷺ نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے:

''جس نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی ، ہمارے قبلہ کا استقبال کیا اور ہمارے ذبیحہ کو کھایا وہ مسلمان ہے، اس کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا عہد ہے'' (بخاری، حدیث نمبر: ۳۹۳، کتاب الصلاۃ، باب فضل استقبال القبلۃ)

اسی حدیث کو بنیاد بنا کر امام عبدالوہاب شعرانی نے اپنی معروف کتاب ''الیواقیت والجواہر'' میں فرقِ ضالہ پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے: ''مذاہب اسلامیہ میں سے کسی کو بھی کافر قرار نہیں دیا جائے گا، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جس نے ہماری طرح نماز پڑھی، قبلہ کا استقبال کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا، تو اس کو وہ حقوق حاصل ہوں گے، جو ہمیں حاصل ہیں، اور اس پر وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو ہم پر ہیں'' (الیواقیت والجواہر: ۲/۱۲۵، مبحث: ۵۸

(

اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ صحابہ کے اخیر دور میں ہی ان مختلف فرقوں کا ظہور ہو چکا تھا، جن کو راہِ حق سے منحرف سمجھا گیا؛ لیکن صحابہ ﷺ نے ان کو کافر کہنے میں یا ان پر کفر کا حکم لگانے میں احتیاط سے کام لیا، سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد میں خوارج کا ظہور ہوا، یہ اس عہد کے صحابہ ﷺ کے ان دونوں گروہوں کی تکفیر کرتے تھے، جو حضرت علی ﷺ کے ساتھ تھے یا ان کے مخالف تھے؛ لیکن حضرت علی ﷺ نے ان پر کفر کا حکم لگانے میں احتیاط برتی؛ البتہ فرمایا کہ اگر وہ فساد مچائیں گے تو ہم ان سے جہاد کریں گے، پھر آپ ﷺ نے ان سے جہاد فرمایا، اور جہاد میں فتح یاب بھی ہوئے؛ لیکن مفتوحین اور ان کے اموال کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کیا جو غیر مسلموں کے ساتھ کیا جاتا ہے، یعنی آپ نے ان کی خواتین کو باندی اور ان کے مال کو مالِ غنیمت کا درجہ نہیں دیا۔

بعد کے فقہاء کے یہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں، اہلِ سنت والجماعت، معتزلہ اور مرجیہ نامی فرقوں کے درمیان بڑی کشمکش رہی ہے، اس کشمکش نے بعض اوقات اربابِ اقتدار کو بھی متاثر کیا اور حکومت کے سہارے فریقِ مخالف کو تکلیف پہنچانے کی کوششیں بھی کی گئیں؛ لیکن معتزلہ اور مرجیہ کو صریحاً کافر کہنے سے احتیاط برتی گئی، اسی طرح خود اہل سنت میں اشاعرہ، ماتریدیہ اور حنابلہ کے درمیان سخت اعتقادی اختلافات رہے، اور اس کا اثر راویوں سے متعلق محدثین کی آراء پر بھی پڑا؛ لیکن ایک دوسرے کی تکفیر سے ہر ایک نے اجتناب کیا، اسی طرح اہل تشیع کے بارے میں فقہاء متقدمین کا عام نقطۂ نظر یہی رہا کہ جو لوگ تحریفِ قرآن کے قائل نہیں ہیں ان کی تکفیر نہیں کی جائے گی، چنانچہ امام عبدالوہاب شعرانی نے معتزلہ، نجاریہ، روافض، خوارج اور مشبہہ وغیرہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ سب مسلمان ہیں، ان پر کفر کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، اس سلسلہ میں انہوں نے شیخ ابوطاہر قزوینی کے حوالہ سے کہا ہے:

> ''وہ بلاشبہ حضور ا کی امت اجابت میں ہیں، لہذا ان کو کافر کہنا ظلم وتعدی کی بات ہے'' (حوالہ سابق)

امام ابوالحسن اشعری کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے اپنی وفات کے وقت کہا:

> ''تم لوگ مجھ پر گواہ رہو کہ میں اہل قبلہ میں سے کسی کو بھی گناہ کی وجہ

سے کافر قرار نہیں دیتا، اس لیے کہ میں ان سب کو دیکھتا ہوں کہ ایک ہی معبود کی طرف رخ کرتے ہیں اور اسلام ان سب کو شامل ہے''

(الیواقیت للشعرانی: ۲/ ۱۲۶، مبحث: ۵۸

)

امام شافعیؒ کا قول منقول ہے:

''جو لوگ مخالف ظاہر تاویل کرتے ہیں، ان کے اس گناہ کی وجہ سے انہیں کافر قرار نہیں دیا جاسکتا'' (الیواقیت للشعرانی: ۲/ ۱۲۶، مبحث: ۵۸)

اسی طرح شوافع قریب قریب اس بات پر متفق ہیں کہ خوارج کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔

(دیکھئے: الصواعق المحرقة: ص: ۱۵۲، لابن الحجر الهيثمی)

علامہ ابن عابدین شامیؒ خوارج کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''جمہور تابعین اور علماء اہل حدیث کے نزدیک خوارج کا حکم باغیوں کا سا ہے...... اور بعض علماء حدیث ان کو کافر قرار دیتے ہیں...... علامہ ابن منذر کا بیان ہے کہ میں کسی فقیہ کو نہیں جانتا جس نے ان کو کافر قرار دینے کے سلسلے میں علماء حدیث کی موافقت کی ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ خوارج کے کافر نہ ہونے پر فقہاء کا اجماع ہے اور ''محیط'' نامی کتاب میں ذکر کیا گیا ہے کہ بعض فقہاء اہل بدعت میں سے کسی کو کافر قرار نہیں دیتے اور بعض ان لوگوں کو کافر قرار دیتے ہیں جو اپنی بدعت میں کسی دلیل قطعی کی مخالفت کے مرتکب ہوں، اس رائے کو مصنف نے اکثر اہل سنت کی طرف منسوب کیا ہے؛ لیکن پہلی روایت زیادہ صحیح ہے (یعنی کافر نہ قرار دیئے جانے کی) یہ فقہاء مجتہدین کا کلام نہیں، دوسروں کا کلام ہے اور ان کے کلام کا اعتبار نہیں، مجتہدین سے وہی بات منقول ہے جو ہم نے ذکر کی اور علامہ ابن منذر مجتہدین کی آراء سے زیادہ واقف ہیں''

(رد المحتار: ٦ / ٤١٣

(

علامہ شامیؒ نے اسی پس منظر میں کئی جگہ روافض کے بارے میں اہل سنت کا نقطۂ نظر یہی نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خدا ہونے کے قائل نہیں ہیں، ان کو کافر نہیں کہا جائے گا۔ (دیکھئے: ردالمحتار: ۳/ ۲۹۳، ۶/ ۴۱۳)

فقہاء نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ جس بات کے کفر ہونے پر اتفاق نہ ہو اس کی بنیاد پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جا سکتا، چنانچہ علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

"و اعلم أنه لا يفتی بكفر مسلم أمكن حمل كلامه علی محمل حسن أو كان في كفره خلاف ولو كان ذلک رواية ضعيفة"

(درمختار مع الرد: ۴/ ۲۲۴)

"کسی ایسے مسلمان پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا، جن کے کلام کا بہتر مفہوم بن سکتا ہو، یا اس کے کفر میں اختلاف ہو، چاہے اس سلسلہ میں فقہاء کا ضعیف قول ہی کیوں نہ ہو"

موجودہ دور میں علماء کی توجہ دعوتِ اسلام کی طرف سے تو ہٹ گئی، اور مسلمان بنانے کا جو فریضہ ان پر عائد ہوا تھا، ان سے تو انہوں نے منہ موڑ لیا، فتنہ ارتداد اور قادیانیت وغیرہ سے امت کو بچانے کی کما حقہ فکر تو نہیں کی گئی؛ لیکن مسلمانوں کو کافر کہنے میں وہ بہت تیز دست ہو گئے، اہل سنت اور اہل تشیع نے ایک دوسرے کو کافر کہا، (بعض مقلدین نے سلفی حضرات پر کفر کا فتویٰ لگایا اور سلفی حضرات نے مقلدین کو —— جو امت کا سوادِ اعظم ہیں —— مشرک قرار دیا)، ہندوستان میں یہی صورتِ حالت بعض اور گروہوں کے درمیان پیش آئی، یہاں تک کہ مختلف مسلم تنظیمیں جو دعوت واصلاح کے لئے اٹھی تھیں، وہ بھی ایک دوسرے کو زائغ وضال کہنے پر کمر بستہ ہیں۔

علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ مخالف نقطۂ نظر کے حاملین پر کفر کا حکم لگانے سے احتراز کریں، اور جب تک کسی گروہ کے بارے میں یہ بات ثابت نہ ہو جائے کہ وہ قطعیاتِ دین اور ضروریاتِ دین کے منکر ہیں، اس وقت تک تکفیر سے پوری طرح گریز کریں؛ کیوں کہ مسلمان یا کافر سمجھنے کا

تعلق صرف زبان کے بول سے ہی نہیں ہے؛ بلکہ برتاؤ اور سلوک سے بھی ہے، اور برادرانہ برتاؤ اور سلوک کے ذریعہ ہی تعلقات استوار ہوتے ہیں، رواداری کے جذبات پروان چڑھتے ہیں اور امت میں اتحاد پیدا ہوتا ہے۔

یکم جون ۲۰۰۷ء

تہتر فرقے

اس وقت پوری دنیا میں مسلمان جن حالات سے گذر رہے ہیں، گذشتہ تاریخ میں شاید ہی اس کی کوئی مثال مل سکے، اس کے بہت سے اسباب ہیں، کچھ ہماری کوتاہیاں اور حکمِ خداوندی سے سرتابیاں ہیں، کچھ دشمنانِ اسلام کی سازشیں اور کارستانیاں ہیں، ان اسباب کا اگر گہرائی کے ساتھ تجزیہ کیا جائے، تو ایک واضح سبب مسلمانوں کا باہمی اختلاف وانتشار ہے، قطرہ جب سمندر میں ہوتا ہے، تو وہ بجائے خود ایک سمندر ہوتا ہے، وہ متلاطم موجوں کا ایک حصہ ہوتا ہے اور جب سمندر سے الگ ہوتا ہے تو ایک قطرۂ بے جان بن جاتا ہے، جو ہوا کے جھونکوں میں تحلیل ہو کر رہ جاتا ہے، پتھر کے ذرات جب پہاڑوں اور چٹانوں کا جز ہوتے ہیں، تو بجائے خود گویا چٹان ہوتے ہیں؛ لیکن جب یہ ذرات چٹانوں سے الگ ہوتے ہیں تو اس کی حیثیت ایک ذرۂ بے مقدار کی ہوتی ہے، جس کا مقدر انسانوں اور جانوروں کے قدموں میں پامال رہنا ہے، یہی حال قوموں اور امتوں کا ہے، اتحاد انہیں ناقابلِ تسخیر طاقت بنا دیتا ہے، اس کی طرف دشمن آسانی سے نگاہِ حرص اٹھا نہیں سکتا ؛لیکن جب وہ انتشار اور بکھراؤ سے دوچار ہوتی ہیں، تو نہ اس کی کوئی قیمت ہوتی ہے نہ طاقت وقوت ،اور ذلت ورسوائی ان کا مقدر ہو جاتی ہے، تقریباً گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے امت اسی صورت حال سے دوچار ہے، خلافت عثمانیہ ترکی کا سقوط کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا، یہ اپنے اثرات ونتائج کے اعتبار سے مملکت اسرائیل کی تشکیل اور بیت المقدس پر یہودیوں کے قبضہ سے بھی زیادہ افسوس ناک اور دوررس نتیجہ کا حامل واقعہ تھا؛ کیوں کہ اس واقعہ نے امت کی اجتماعیت کو ختم کر کے رکھ دیا اور مسلمانوں کے انتشار اور بکھراؤ کی ایک ایسی تاریخ کا آغاز ہوا، جس کا ہر آنے والا صفحہ پچھلے صفحہ سے زیادہ المناک ہے۔

یورپ اور دوسرے لفظوں میں صلیبی اور صہیونی طاقتوں نے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ

مسلمانوں کو بانٹنے اورانہیں چھوٹی چھوٹی ٹکریوں میں تقسیم کرنے کی سازش رچی ، یہ بکھراؤ کئی جہتوں سے پیدا کیا گیا،سب سے زیادہ علاقائیت اور وطنیت کے بت کونمایاں کیا گیا؛ تاکہ عالمِ اسلام چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم ہوجائے ،عربی وعجمی تعصّبات کی آگ بھڑکائی گئی ، یہاں تک کہ پورے عالمِ عرب میں ترکوں کے خلاف بغاوت اٹھ کھڑی ہوئی ، پھر عربوں کوچھوٹی چھوٹی علاقائی شناخت کے ساتھ ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار کردیا گیا ، اس طرح مصر ، شام ، اردن ، سوڈان اور دسیوں چھوٹی چھوٹی بے وزن ، کمزور اور اپنی حفاظت کی طاقت سے محروم ریاستیں وجود میں آگئیں ، نیز استعماری قوتوں نے ان کوآزاد کرتے ہوئے سرحدی جھگڑے بھی باقی رکھے ؛ تاکہ یہ باہمی آویزشوں سے کبھی نجات نہ پاسکیں۔

دوسری طرف نسلی اختلافات کوبھی ابھارا گیا،عرب اور غیرعرب کی تفریق اتنی بڑھادی گئی کہ آج بھی بہت سے عرب ملکوں میں نسلی اور قبائلی تعصب کے مقابلہ اسلامی اخوت ایک بے جان شئے معلوم ہوتی ہے،اسی اختلاف نے پڑوسی ملک پاکستان کودولخت کردیا اور زبردست خوں ریزی اور برادرکشی کے ساتھ بنگلہ دیش وجود میں آیا ، پاکستان میں اب بھی سرحدی ، سندھی ، پنجابی ، بلوچی اور مہاجر کا اختلاف پوری قوت کے ساتھ موجود ہے اور اس نسلی جھگڑے نے کشت وخون کے جو بازار گرم کیے ہیں ، اس سے ہر صاحبِ نظر واقف ہے ، یہی لڑائی اس وقت سوڈان کی سا لمیت کو خطرہ میں ڈالے ہوئی ہے ، اسی جھگڑے نے افغانستان میں ظالم و جابر اور بدکردار و بد اطوار استعماری طاقتوں کوتسلط کا موقع فراہم کیا ہے اور آج ان خوں آشام قوتوں سے کسی گروہ کی جان و مال اور عزت وآبرمحفوظ نہیں ہے ، یہ علاقائی اورنسلی اختلاف ان مسلمانوں کوبھی متاثر کررہا ہے ، جوغیر مسلم ممالک میں آباد ہیں ، خاص کر جہاں وہ تارکینِ وطن کی حیثیت سے گئے ہیں ، وہاں ان کے درمیان ارتباط اور برادرانہ تعلقات کا فقدان ہے۔

لیکن اختلاف کی جو بنیاد ان سب سے زیادہ گہری ہے ، وہ مذہبی اختلاف ہے ،اس اختلاف سے جوزخم پیدا ہوتا ہے وہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مندمل نہیں ہو پاتا ؛ بلکہ اس کی گہرائیاں بڑھتی جاتی ہیں ، پُرجوش مقررین ، جھگڑالو مناظرین اور لوگوں کے جذبات سے فائدہ اٹھانے والے اہلِ قلم اس فاصلہ کو بڑھاتے جاتے ہیں ، یہاں تک کہ ان کے درمیان اتنی اونچی

دیواریں کھڑی ہوجاتی ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتے ،طوفان آتے ہیں ؛لیکن یہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے ، سیلِ بلاخیز ٹوٹ پڑتا ہے ؛لیکن وہ بنیان مرصوص (سیسہ کی دیوار) بن کر اس کو روک نہیں سکتے ، وہ خود اپنے اختلاف کے ذریعہ دشمن کی طاقت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں اور اپنے آپ کو کمزور کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں ۔

اس مذہبی اختلاف کے لیے چونکہ ملک اور حکومت کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے اس کا اثر دو ملکوں اور دو قوموں کے تعلقات پر تو پڑتا ہی ہے، محلہ محلہ اور شہر شہر اس کی آگ بھڑک اٹھتی ہے، اس وقت عراق کو تقسیم کرنے کے لیے مغربی طاقتوں نے یہی چال چلی ہے، ایک طرف عربوں اور کردوں کے درمیان نسلی جھگڑا کھڑا کر دیا گیا، دوسری طرف خود عربوں کو اہلِ سنت اور اہل تشیع میں اس طرح تقسیم کر دیا گیا اور ماضی کے واقعات کو دہرا کر اسے اتنی ہوا دی گئی کہ آج پورا عراق نفرت کی آگ میں سلگ رہا ہے اور دونوں فرقوں کے مقدس مقامات ان شعلوں میں جل رہے ہیں، خود ہمارے ملک ہندوستان میں اول تو مسلمانوں کو اہلِ سنت اور اہل تشیع میں اس طرح تقسیم کیا گیا کہ ان کی آبادیاں ایک دوسرے سے الگ ہوگئیں، ان کے فیصلے باہمی اعتماد و اشتراک کے بغیر ہونے لگے، پھر اہلِ سنت کو مقلدین اور غیر مقلدین کے گروہوں میں بانٹا گیا، اس وقت کچھ لوگ دانستہ یا نادانستہ مغربی طاقتوں کا آلۂ کار بن کر اختلافات کو ہوا دے رہے ہیں اور نفرت کے سوداگر بنے ہوئے ہیں، پھر خود مقلدین میں دیوبندی اور بریلوی مکتب کے دو اہم مکاتب ہیں اور ان کے درمیان بھی اختلافات اپنی انتہاء کو پہنچے ہوئے ہیں ؛ بلکہ بعض لوگوں نے اس اختلاف کے بڑھانے اور نفرت کے قائم رکھنے ہی کو اپنی روزی روٹی کا سامان اور گذر اوقات کا ذریعہ بنا رکھا ہے ،انہیں نہ ان حالات کا ادراک ہے، جن سے اس وقت امت دو چار ہے اور نہ ان مسائل کی فکر ہے، جو پوری دنیا کے مسلمانوں کو پیش آرہے ہیں، یہ وہ پہلو ہے جس پر علماء اور مذہبی قائدین کو ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

مذہبی اختلاف کی بنیادی طور پر دو نوعیتیں ہیں، ایک وہ اختلاف ہے جس کا تعلق عقیدہ سے ہے، دوسرے وہ جس کا تعلق فروعی مسائل جیسے عبادات و معاملات کے احکام وغیرہ سے ہے، یہ دوسرے قسم کے اختلاف ہمیشہ سے علماء کے درمیان قابلِ برداشت رہے ہیں ؛ کیوں کہ رسول اللہ

ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اجتہاد میں اگر غلطی ہو جائے، تب بھی ایک اجر سے خالی نہیں؛ اس لیے اجتہادی مسائل میں اختلاف کو ہر دور میں اہلِ علم نے گوارا کیا ہے؛ بلکہ اسے محمود سمجھا ہے؛ کیوں کہ اس سے فراخی کی راہ کھلتی ہے اور امت کی دشواریوں کو حل کرنے میں سہولت بہم پہنچتی ہے، اس اختلاف کو عربی زبان میں ''مذاہب'' یعنی مختلف 'مکاتب فقہ' کا نام دیا جاتا ہے، دوسرا اختلاف وہ ہے جس کا پہلے ذکر آیا، یعنی اعتقادی امور میں اختلاف، اس اختلاف سے فرقے وجود میں آتے ہیں، جیسے اہل سنت اور اہل تشیع ہیں کہ ان کے درمیان اصول وعقائد میں اختلاف ہے، اصولی اختلاف میں بعض ایسے ہو سکتے ہیں، جو واقعی کفر تک پہنچا دیتے ہیں؛ لیکن اکثر اختلافات کی نوعیت ایسی ہے جسے انحراف اور فکری گمراہی قرار دیا جا سکتا ہے؛ لیکن وہ بالکل کفر کے درجہ میں نہیں ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک حدیث زبان زد خاص وعام ہے اور اسے کفر واسلام کی بنیاد سمجھا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہودیوں کے اکہتر یا بہتر فرقے ہوئے اور نصرانیوں کے بھی؛ لیکن میری امت کے تہتر فرقے ہو جائیں گے، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۵۹۶) بعض روایتوں میں اس کی مزید توضیح آئی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''میری امت پر بھی وہی حالات آئیں گے جو بنی اسرائیل پر پیش آئے، برابر، قدم بہ قدم، یہاں تک کہ اگر ان میں کوئی ایسا شخص ہوگا، جس نے اپنی ماں کے ساتھ اعلانیہ نکاح کیا ہو تو میری امت میں بھی ایسا واقعہ پیش آئے گا، بنی اسرائیل تو اکہتر فرقوں میں تھے؛ لیکن میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے اور یہ سب دوزخی ہوں گے سوائے ایک فرقہ کے، عرض کیا گیا کہ وہ ایک فرقہ کون سا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس طریقہ پر آج میں ہوں اور میرے اصحاب'' (نسائی عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ، حدیث نمبر: ۴۴۴)

اس طرح کی روایتیں مختلف کتبِ احادیث میں متعدد صحابہ سے منقول ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے تہتر فرقوں میں سے ایک فرقہ ناجی ہوگا اور باقی دوزخی ہوں گے، اہلِ علم نے اس پر بھی بحث کی ہے کہ تہتر فرقوں سے کون مراد ہیں، ان میں چھ بنیادی فرقوں کا ذکر کیا گیا ہے،

جو مسئلۂ تقدیر یا عظمتِ صحابہ یا دین میں اعمال کی اہمیت کے بارے میں اہلِ سنت کے نقطۂ نظر سے اختلاف رکھتے ہیں، پھران کی بارہ بارہ شاخیں ہیں، (دیکھئے: تلبیس ابلیس، ص: ۱۶۹) یہ فرقے عام طور پر ناپید ہو چکے ہیں، صرف روافض یعنی اہل تشیع موجود ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرقہ ناجیہ کی تعریف اس گروہ سے کی ہے جو آپ ﷺ کے اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقہ پر ہو، یہی راہ ہے جو اہل سنت والجماعت نے اختیار کی ہے، جس میں 'سنتِ نبوی' دین وشریعت کی اساس ہے اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم بشمول اہل بیت کی عظمت تسلیم شدہ ہے اور ان کی نقل کی ہوئی باتوں پر اعتماد واعتبار عقائد واعمال کے سلسلہ میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں؛ اسی لیے انہوں نے اپنے لیے اہل سنت والجماعت کا لقب اختیار کیا ہے، یعنی وہ گروہ جو رسول اللہ ﷺ کی سنت اور جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقہ پر قائم ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ بقیہ فرقے کیا اسلام کے دائرہ سے باہر ہیں؟ کیا ان کے دوزخی ہونے کا مطلب ان کا کافر ہونا اور ہمیشہ ہمیش کے لیے جہنم رسید ہونا ہے؟ اگر علماء ان نکات پر غور کریں تو شاید مذہبی معاملات میں اس درجہ کی شدت پیدا نہ ہو، جو اس وقت پائی جاتی ہے، حضور ﷺ کے ارشاد سے واضح ہے کہ یہ سب کے سب گروہ آپ ﷺ کی امت ہی کے دائرہ میں ہوں گے، ان کا شمار آپ ﷺ کی امتِ اجابت میں اور امت مسلمہ میں ہوگا، چنانچہ علامہ مناوی فرماتے ہیں:

''وأراد بالأمة من تجمعهم دائرة الدعوة من أهل القبلة''

(فيض القدير: ۲/۲۰)

علامہ خطابی نے اس حدیث سے یہ بات اخذ کی ہے کہ ان فرقوں میں سے کوئی اسلام سے خارج نہیں قرار دیا جائے گا؛ اس لیے کہ حضور ﷺ نے ان سب کو اپنی امت میں شامل فرمایا ہے اور اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص قرآن وحدیث کی کسی بات کی تاویل کرتا ہے تو گو وہ تاویل درست نہ ہو، پھر بھی وہ ملتِ اسلامیہ کے دائرہ سے باہر نہیں ہوگا:

''فيه دلالة على أن هذه الفرق كلها غير خارجين من الدين الخ

''(بیهقی: ۱۰/۲۰۸، حدیث نمبر: ۲۰۶۹۰، کتاب الشهادات، باب ماترد

به شهادة أهل الأهواء)

اسی سے دوسرا نکتہ بھی واضح ہوگیا کہ ان فرقوں کے جہنمی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ ہمیشہ ہمیش کے لیے دوزخی ہیں؛ بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان حضرات کو نجاتِ اولیں حاصل نہیں ہوگی؛ بلکہ وہ اپنے گناہوں کی سزا پا کر پھر جنت کے مستحق ہوں گے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کی امتِ اجابت میں سے ہر شخص مآل کار جنت میں داخل ہوگا، اس کو اس بات سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ متعدد روایتوں میں اس کے برعکس یہ الفاظ آئے ہیں کہ میری امت کے ستر سے زیادہ فرقے ہو جائیں گے، یہ سب کے سب جنتی ہوں گے سوائے ایک فرقہ کے اور وہ زندیقوں کا گروہ ہے:

"تفترق أمتي على بضع و سبعين فرقة كلها في الجنة إلا فرقة واحدة و هي الزنادقة" (الموضوعات لابن الجوزی: ۱/ ۲۶۷) "لا يصح عن رسول الله ﷺ" (حوالہ سابق) "لا أصل له" (المصنوع في معرفة الحديث الموضوع: ۱/ ۸۰، اللالي المصنوعة في الأحاديث الموضوعة لجلال الدين سيوطي: ۱/ ۲۷۷)

اس روایت کو ابن نجار، دیلمی اور حاکم جیسے محدثین نے نقل کیا ہے، نیز یہ روایت مسند فردوس میں بھی آئی ہے اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح یعنی معتبر قرار دیا ہے، (کشف الخفاء: ۱/ ۱۶۷ ، حدیث نمبر: ۴۴۶) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ وغیرہ اس حدیث کے راوی ہیں، اہلِ علم نے اس تضاد کو دور کرتے ہوئے جو بات کہی ہے، وہ یہ کہ پہلی حدیث میں جنتی ہونے سے مراد شروع سے جنتی ہونا ہے اور دوسری حدیث میں انجام کار جنت میں جانا ہے:

"... و لعل وجه التوفيق أن المراد بأهل الجنة في الرواية الثانية و لو مآلا" (کشف الخفاء: ۱/ ۱۶۷، حدیث نمبر: ۴۴۶)

پس تہتر فرقوں والی روایت جو واعظین و مقررین کی زبان زد ہیں، جس کو امت کے درمیان فرقہ بندی کو فروغ دینے اور اختلاف کو گہرا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اگر اس کے الفاظ

کی گہرائی میں جھانک کر دیکھا جائے، تو اس میں افتراق کے بجائے اتحاد کا، نفرت کے بجائے محبت کا اور تکفیر میں بے احتیاطی کے بجائے احتیاط واعتدال کا سبق موجود ہے، کاش ہمارے واعظین وخطباء، علماء ومشائخ اور مذہبی قائدین اس پہلو پر توجہ دیں!

۳/ اگست ۲۰۰۷ء

ہندوستان کی آزادی میں علماء کا کردار

آج ہمارا ملک آزاد ہے، اس کے در و بست آزاد ہیں، ہم خود اس کی تقدیر کے مالک ہیں اور اس کے سیاہ و سفید کا فیصلہ کرتے ہیں؛ لیکن ہماری تاریخ میں ایک ایسا دور بھی گذرا ہے، جب ہم خود اپنے وطن میں غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے، ہم اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں تھے ——— ہمیں یہ آزادی کیونکر حاصل ہوئی ؟ اس آزادی کے جبین و عارض پر کس کس کے خونِ شہادت کی سرخی ہے؟ ضروری ہے کہ ہم اپنی تاریخ کے ان سپوتوں، مادر وطن کے لائق فرزندوں اور اس کی عزت و ناموس کے ان پاسبانوں کی یاد تازہ کریں۔

ہندوستان کی آزادی کی تاریخ دنیا کے تمام انقلابات سے اس حیثیت سے جداگانہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں مذاہب اور مذہبی قائدین کا نمایاں کردار رہا ہے، بابائے قوم مہاتما گاندھی جی، مفسر قرآن مولانا ابوالکلام آزاد اور سکھ مذہبی رہنما تارا سنگھ یہ سارے لوگ وہ تھے، جو مذہب کی آغوش میں پلے اور ساری زندگی مذہب کے زیر سایہ گذار دی، ——— اسی پس منظر میں اس وقت ہمارا موضوع ہندوستان کی آزادی میں ''مسلمان علماء'' کا کردار ہے؟

1600ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں قدم رکھا اور بتدریج اپنی فوج اور پولیس بھی رکھنی شروع کردی، یہاں تک کہ ہندوستانیوں سے انگریزوں کا پہلا معرکہ 1757ء میں پلاسی کے میدان میں پہلے شہید آزادی سراج الدولہ کے ساتھ ہوا، یہ گویا انگریزوں کی طرف سے اس امر کا اعلان تھا کہ وہ اس ملک میں محض تجارت پر قناعت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں؛ بلکہ اس ملک کی سیاسی تقدیر بھی اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔

انگریزوں سے دوسرا بڑا معرکہ 1764ء میں بکسر کے میدان میں میر قاسم کے ساتھ ہوا اور اس میں بھی میر قاسم کو شکست ہوئی، ادھر جنوب میں فرمانروائے میسور سے انگریزوں کی تین

جنگیں ہو چکی تھیں، جن میں دوبار انگریز شکست کھا چکے تھے، 1799ء میں آخری معرکۂ میسور ہوا اور بعض مسلم والیانِ مملکت کی غداری و جفا کاری کے باعث یہ معرکہ بھی ہندوستانیوں کے خلاف رہا، اسی معرکۂ میسور نے 1806ء میں اس تحریک کی صورت اختیار کی جو ''غدر ویلور'' کہلاتا ہے، اور جس کو بعض مؤرخین نے 1857ء کی تحریک حریت کا ریہرسل قرار دیا ہے، بقول جنرل برگس:

> ''جنوب میں ہمارے اقتدار کو مٹانے کے لئے غیر مطمئن مسلمانوں کی طرف سے یہ پہلی کوشش تھی، اسی طرح آپ کو تاریخ میں یہ واقعہ بھی ملے گا کہ 1857ء کے واقعہ میں سرنگا پٹنم کے مسلمانوں نے سلطان ٹیپو شہید کی قبر پر جا کر مجاہدین کی فتح کے لئے دعاء کی''
>
> (مقالہ: کے، ایم اشرف، انقلاب 1857ء)

جہاں مرشد آباد اور بکسر کی شکست نے بنگال سے نواحِ دہلی تک انگریزوں کو غلبہ عطا کر دیا، وہیں میسور کی فتح نے جنوب میں انگریزوں کے لئے مزاحمت ختم کر دی اور حقیقت یہ ہے کہ خود دہلی میں بھی مغلیہ حکومت کی شمع سحری 16/ستمبر 1803ء ہی کو بجھ گئی تھی، جس دن شہنشاہ عالم نے برطانیہ کی سرپرستی قبول کر لی تھی۔

ہندوستانی کسانوں پر ٹیکسوں کا ناواجبی بوجھ، مقامی صنعتوں کی تباہی و بربادی اور ملک کے اصل باشندوں کے ساتھ تذلیل و تحقیر کے سلوک نے محبانِ وطن کو بے چین و بے قرار کر دیا اور یہ بے قراری آخر 1857ء کی تحریک کی صورت آتش فشاں بن کر پھوٹ پڑی، یہ وہ نشہ تھا جس نے ہندو اور مسلمان، برہمن اور شودر، زمیندار اور جاگیردار اور زارع و کاشتکار سبھوں کو ایک صف میں لا کھڑا کیا، غور کیا جائے اور بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو آزادی کے لیے ان تمام اہم معرکوں میں مسلمان پیش پیش تھے اور انہوں نے دشمنانِ وطن کو خونِ جگر کے جام بھر بھر کر دیئے کہ ان کی تشنہ کامی دور ہو اور وطن عزیز کی عزت و آبرو سلامت رہ جائے۔

انگریزوں نے ہندوستان میں جو علاقے چھینے تھے، ان میں مراٹھوں، راجپوتانہ اور پنجاب کا علاقہ چھوڑ کر قریب قریب سبھی مسلمانوں ہی کے زیر اقتدار تھے؛ اس لئے مسلمان ہی ان کا زیادہ نشانہ تھے اور فطری طور پر مسلمان ہی ان سے نبرد آزما بھی تھے، سر ولیم میور نے جو انٹلی

جنس ریکارڈ جمع کیا ہے، اس کے مطابق ''بدذات مسلمانوں کو عبرت دلانے کے لئے، جھجر، بلب گڑھ، فرخ نگر کے نوابوں اور 24 شہزادوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا'' (سر ولیم میور: انڈین ملٹری انٹلیجنس ریکارڈ ۱/ ۲۷۳، 1902ء)، مسلمانوں کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں یا تباہ کر دی گئیں اور مسلمانوں سے ان کی غیر منقولہ جائداد کا 35% بہ طور تعزیری جرمانہ وصول کیا گیا، جب کہ ہندوؤں کو 10% فیصد کے ساتھ چھوڑ دیا گیا، اور جب دوبارہ دہلی فتح ہوا تو ہندوؤں کو تو چند ہی ماہ میں واپسی کی اجازت مل گئی؛ لیکن مسلمان 1859ء سے پہلے نہ لوٹ سکے، ریکس کا بیان ہے: ''مسلمان باغی کا مترادف کلمہ تھا''۔

(انقلاب 1857ء)

1857ء کے انقلاب کے بارے میں پنجاب کی انگریزی سرکار نے شروع ہی سے اعلان کر دیا تھا کہ بغاوت کا آغاز دراصل ہندوستانیوں اور مسلمانوں کی طرف سے ہوا، مسلمانوں کو بہ قول کیو براؤن بغاوت کا محرک سمجھا جاتا تھا اور ہندوؤں کو ان کا آلۂ کار، سندربن کے انگریز کمشنر نے باضابطہ گورنمنٹ گزٹ میں اعلان کیا کہ جو ملازمتیں خالی ہوتی ہیں، ان پر سوائے ہندوؤں کے کسی کا تقرر نہ کیا جائے؛ (انقلاب 1857، ص: ۳۵) اس لیے یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا سب سے نمایاں حصہ رہا ہے اور انہوں نے اس میں پیش قدمی بھی کی ہے، اور چونکہ ہر دور میں مسلمان ہر نئے قدم کے لیے علماء کی طرف دیکھتے رہے ہیں اور ان کے اشارۂ انگشت میں اپنے لیے دین و دنیا کی بھلائی تصور کی ہے، اس لیے ان کی ہر تحریک کا رشتہ علماء ہی سے جا کر جڑتا ہے۔

1806ء میں حالانکہ دہلی میں علامتی طور پر مغلیہ بادشاہت کا ایک بے جان ڈھانچہ موجود تھا، پھر بھی شاہ عبد العزیز صاحبؒ نے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ دیا تھا، یہ گویا بالواسطہ انگریزوں کے خلاف جنگ کی ترغیب ہی تھی، شاہ عبد العزیزؒ اپنی ذات سے ایک انجمن اور دلی میں طالبانِ علوم اسلامی کا مرجع و ماویٰ تھے، شاہ محمد اسحاق آپ کے خلف ارشد تھے، شاہ محمد اسحاقؒ نے 1844ء میں مکہ مکرمہ ہجرت کی، آپ کے ہجرت کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے آپ کی تمام املاک ضبط کر لیں، اس ضبطیٔ جائداد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی کوئی اندرونی

تحریک علماء کی انگریزوں کے خلاف چل رہی تھی اور خفیہ طور پر اپنا کام کر رہی تھی۔

شاہ عبدالعزیز ہی نے سید احمد شہید کو نواب امیر علی خاں کی فوج میں عسکری تربیت کے لیے 1810ء میں روانہ کیا تھا، جب نواب نے انگریزوں سے معاہدہ کرلیا تو سید صاحب واپس آ گئے، پھر سید احمد شہید کی تحریک شروع ہوئی، یہ تحریک بظاہر رنجیت سنگھ والیٔ پنجاب کے ظلم و بربریت کے خلاف نظر آتی ہے؛ لیکن درحقیقت یہ سید صاحب کا پہلا ہدف تھا، اصل ہدف انگریز ہی تھے اور غالباً سید صاحب کا خیال تھا کہ رنجیت سنگھ کو شکست دینے کے بعد سرحد کا علاقہ وہ موزوں تر علاقہ ہو سکتا ہے، جہاں سے انگریزوں پر وار کرنا مناسب ہوگا، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جب سید صاحب نے سرحد کی طرف اپنے جاں نثاروں کے ساتھ کوچ کیا، تو گوالیار بھی تشریف لے گئے، جہاں مہاراجہ گوالیار نے آپ کا پرتپاک استقبال کیا اور اعزاز و اکرام کے ساتھ واپس کیا، آپ نے سرحد سے مہاراجہ گوالیار اور اس کے معتمد خاص غلام حیدر کو خط لکھا اور اس میں انگریزوں کی مخالفت کی ترغیب دی، آپ کے خط کا پہلا فقرہ ہی اس طرح ہے:

بیگا نگان بعید الوطن ملاک زمین و زماں
گردیدہ و تاجران متاع فروش بہ پایۂ سلطنت

(نقوش حیات: ۲ / ۱۳، علماء ہند کا شاندار ماضی: ص: ۱۷۴)

آپ نے اپنے خط میں یہ بھی یقین دہانی کرائی کہ جب ملک بیگانے دشمنوں سے خالی ہو جائے گا تو سیادت و ریاست ارباب حکومت کو مبارک ہو، مجھے اس سے کوئی غرض نہ ہوگی، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کے ذہن میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا تصور موجود تھا، گو آپ رنجیت سنگھ سے نمٹنے کو اس وقت زیادہ بڑی ضرورت تصور کرتے تھے؛ اس لیے معرکۂ بالاکوٹ کے بعد ہمیں کلکتہ سے دہلی تک ہر جگہ انگریزوں کے خلاف علم بغاوت سید صاحب کے خلفاء و متوسلین کے ہاتھوں میں نظر آتا ہے، خود دکن میں 1838ء میں اسی حلقہ کے مولانا ولایت علی اور مولانا سلیم تشریف لائے اور نظام دکن کے بھائی مبارز الدولہ نے ایک طاقتور خفیہ تنظیم قائم کی، جو تختۂ حکومت پلٹنا چاہتی تھی، بالآخر 1839ء میں مبارز الدولہ کی اس تحریک کا برطانوی

ریذیڈنٹ نے پتہ چلایا، قلعۂ گولکنڈہ میں قید کئے گئے اور 1851ء میں راہی بہ بقاء ہوئے۔

(انقلاب 1857، ۱/ ۱۰۸)

1857ء کی تحریک آزادی میں جب جانبازانِ حریت میرٹھ سے دہلی آئے اور ۱۱/ جون 1857ء کو علماء سے اس جنگ کی بابت استفسار کیا تو جن علماء نے فتویٔ جہاد پر دستخط کیا، ان میں اکثر وہی علماء تھے، جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے حلقہ سے تعلق رکھتے تھے، اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ 1857ء سے پہلے ہی سے علماء انگریزوں کے خلاف مہم جوئی اور منصوبہ بندی میں مصروف تھے، ہندوستان کی آزادی کی باضابطہ لڑائی مئی 1857ء میں شروع ہوتی ہے، جب انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کی پہلی مہم ناکامی سے دوچار ہوئی ہے، اس ناکامی کے بعد ایک ایسی قیامت آئی کہ پوری جنگ آزادی میں اس کی مثال نہیں ملتی، مغرب کے علمبرداران تہذیب اور مصلحین درس انسانیت نے دہلی میں برسر راہ جگہ جگہ پھانسی کے پھندے نصب کردیئے، جو شبانہ روز ہندوستانیوں کے سر سے آراستہ کئے جاتے، میرٹھ سے دہلی تک سینکڑوں درخت تھے، جو تختۂ دار کا کام کرتے تھے، معززین ورؤسا کو توپ کے دہانے پر باندھ دیا جاتا، توپ داغی جاتی اور کاغذ کے ٹکڑوں کی طرح گوشت کی بوٹیاں بکھر جاتیں، ان شہداء میں علماء سینکڑوں کی تعداد میں تھے، جن میں بہتوں کے نام تاریخ میں محفوظ ہیں اور ان سے زیادہ وہ ہیں، جو تاریخ کے دفینوں میں ہیں۔

جب یہ آتش انتقام کچھ ٹھنڈی ہوئی اور ہندوستانیوں کو سانس لینے کا موقع ملا تو پھر جذبہ آزادی نے انگڑائی لی، اس وقت ملک کے طول وعرض میں ایک سناٹا اور سکوت تھا، صرف سید احمد شہید کی جماعت کے بچے کچھے لوگ تھے، جن کے سینے اب بھی جذبۂ جہاد سے معمور تھے، یہ حضرات زیادہ تر 'پٹنہ' کے محلہ 'صادق پور' سے تعلق رکھتے تھے اور سرحد کی طرف انگریزوں اور ان کے وفاداروں سے نبرد آزما تھے، مولانا ولایت علی صادق پوری نے ہزارہ میں ایک آزاد مملکت کی بنیاد رکھ دی تھی، مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی اور مولانا محمد جعفر تھانیسری وغیرہ اس مہم میں پیش پیش تھے، چنانچہ انگریزوں کے خلاف ''انبالہ سازش کیس 1863ء'' میں مولانا یحیٰ علی عظیم آبادی اور مولانا محمد جعفر تھانیسری کے لیے سزائے موت اور مولانا عبدالرحیم عظیم آبادی کے لیے ''حبس دوام بہ عبور دریائے شور'' کا فیصلہ ہوا اور ان سبھوں کی جائداد بھی ضبط ہوگئی، بعد کو مولانا محمد

یحییٰ اور مولانا محمد جعفر کی سزا بھی ''حبس دوام'' سے تبدیل ہوگئی، اس کے بعد اس تحریک کی باگ ڈور مولانا احمد اللہ عظیم آبادی نے اپنے ہاتھوں میں لی، ان پر بھی مقدمہ چلایا گیا اور فروری 1865ء میں ان کے لیے ''پھانسی مع ضبطیٔ جائداد'' کا فیصلہ ہوا، مگر بعد کو ان کی سزائے موت بھی عمر قید میں تبدیل ہوگئی اور جون 1865ء کو کالا پانی بھیج دیئے گئے، مولانا ولایت علی کے ایک خلیفہ مولانا عبدالرحیم لکھنوی نے مالدہ ضلع کے ایک گاؤں میں جہاد کی ترغیب کا ایک مرکز قائم کیا، وہ یہاں سے سرحد اور پٹنہ کو امداد بھی بھیجا کرتے تھے، وہ بھی گرفتار کر لئے گئے، اس کے بعد ان کے صاحبزادہ مولانا امیر الدین نے یہ ذمہ داری سنبھالی، ان کے خلاف بھی ''حبس دوام مع ضبطیٔ جائداد'' کا فیصلہ ہوا اور مارچ 1872ء میں وہ کالا پانی بھیج دیئے گئے۔

عظیم آباد ہی میں دوسرا مقدمۂ بغاوت 1871ء میں قائم ہوا، اس مقدمہ کے ملزمین میں مولانا مبارک علی اور مولانا تبارک علی تھے، مولانا تبارک علی پر انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے اور ایک کمان کی سالاری کا الزام تھا، دونوں کے خلاف حبس دوام مع ضبطیٔ جائداد کا فیصلہ ہوا، مولانا مبارک علی کا تو پہلے ہی انتقال ہوگیا اور مولانا تبارک علی کالا پانی بھیج دیئے گئے —— اسی دور کے مجاہدین آزادی میں مفتی عنایت احمد کاکوروی اور مفتی صدر الدین آزردہ تھے، جو بڑے پایہ کے علماء میں تھے، عربی گرامر پر مشہور کتاب ''علم الصیغہ'' مولانا نے جزیرۂ انڈمان میں اسارت کے دوران ہی تالیف فرمائی تھی، معروف محدث مولانا رشید احمد گنگوہی بھی چھ ماہ جیل میں رہے، مولانا فضل حق خیر آبادی جو اپنے وقت کے امام المعقولات تھے، فتویٰ جہاد کے جرم میں 1859ء میں گرفتار کئے گئے، مقدمہ چلا، جج آپ کے علمی مقام سے واقف تھا اور چاہتا تھا کہ آپ اس فتویٰ سے انکار کر جائیں؛ لیکن مولانا اس کے لیے آمادہ نہیں ہوئے، آخر سزا ہوئی اور کالا پانی بھیجے گئے، ان سے غلاظتوں کے اٹھانے کا کام لیا جاتا، وہیں پیوند خاک ہوئے، نواب مصطفی خاں شیفتہ کی شہرت ایک شاعر کی حیثیت سے ہے، مگر اصل میں وہ بلند پایہ عالم بھی تھے، اور شیخ عبداللہ سراج حنفی مکی اور شیخ محمد عابد سندھی جیسے اہل علم سے شرف تلمذ رکھتے تھے، یہ بھی سات سال قید فرنگ میں رہے، اسی خونچکاں دور میں دہلی سے مسلمانوں کی ایک جمعیت جمنا پار لے جائی گئی اور انہیں لائن میں کھڑا کر کے گولی سے اڑا دیا گیا، ان شہداء حریت میں مولانا فضل حق خیر آبادی کے رفیق مولانا

امام بخش صہبائی بھی تھے۔

مولانا رضی اللہ بدایونی عربی و فارسی کے بڑے ماہر شمار کئے جاتے تھے، گرفتار ہوئے اور خود عدالت میں اپنے جرم کا اقرار کیا، انگریز کلکٹر خود بھی چاہتا تھا کہ مولوی صاحب جرم سے انکار کردیں، مگر فرمانے لگے کہ میں تمہاری وجہ سے ایمان اور آخرت خراب کرلوں؟ اس کے بعد گولی سے اڑا دیئے گئے، اسی دور میں مولانا محمد حسین (رائے بریلی)، مولانا ریاض الحق (بنگال)، مولوی علاء الدین (حیدرآباد) اور مولوی علاء الدین (پٹنہ) بھی نذر زنداں ہوئے، آخرالذکر نے تختۂ دار کو زینت بخشی اور باقی نے کالے پانی ہی میں جان جاں آفریں کے سپرد کردی، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے شاملی میں انگریزی فوج پر حملہ کیا اور وارنٹ کے باوجود گرفتار نہ ہو سکے، شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی پر بھی وارنٹ تھا؛ لیکن مکہ ہجرت کر گئے، یہی حال مشہور عالم مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا ہوا۔

اس طرح انیسویں صدی کے وسط سے اس کے مکمل ہونے تک حقیقت یہ ہے کہ جنگ آزادی کی رکاب مسلمان علماء ہی کے ہاتھوں رہی، اور انہی کے خون ولہو سے اس مہم میں حرارت و گرمی پیدا ہوتی رہی، اس دور میں اس کا بنیادی مرکز ''سرحد'' کا علاقہ اور صادق پور (پٹنہ) کے علماء رہے، یہ آزادی کا سب سے خونچکاں اور برطانوی بربریت ووحشت کے عروج کا دور رہا ہے، 1912ء میں مولانا حسرت موہانی نے انگریزی مال کے بائیکاٹ کے لیے پورے ملک میں تحریک چلائی، اس پر علماء کے فتاویٰ حاصل کئے، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے اس تحریک میں نہایت سرگرم حصہ لیا اور اس کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔

بیسویں صدی کے ایک دہے کے بعد یعنی 1915ء میں علماء کے زیر سایہ وہ عظیم الشان تحریک شروع ہوئی جس کو ''ریشمی رومال تحریک'' کہا جاتا ہے، اور جو بہ فیصلۂ تقدیر ناکام ہوگئی، اس کے ذریعہ کابل کی طرف سے ہندوستان پر حملہ اور ملک میں بہ یک وقت چہار طرفہ بغاوت کا منصوبہ تھا، اسی دور میں جلاوطن حکومت قائم ہوئی، جس کے صدر راجہ مہندر پرتاب تھے، مولانا برکت اللہ وزیر اعظم، مولانا عبید اللہ سندھی وزیر داخلہ اور مولانا بشیر وزیر دفاع تھے، کابل میں خدائی فوج قائم ہوئی، جس میں مولانا سیف الرحمن اور مولانا منصور انصاری وغیرہ شامل تھے، اس

تحریک کے سرخیل اور دل ودماغ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی تھے، ''ریشمی رومال تحریک'' کے افشاء کے بعد مولانا موصوف حجاز سے گرفتار ہوئے اور مالٹا میں پانچ سال اسیر رہے، اس دور میں دارالعلوم دیوبند نے قیادت وسیادت کا کردار انجام دیا اور اس کے درجنوں فرزندوں نے آزادی کی اس تحریک میں روح پھونک دی، مولانا عزیز گل پشاوری، مولانا آزاد سبحانی، مولانا احمد اللہ پانی پتی ،مولانا فضل ربی پشاوری، مولانا محمد احمد چکوالی، مولانا محمد مبین دیوبندی، مرحوم محمد ابراہیم راندیری و غیرہ مجاہدین آزادی اسی مرکزعلم ودین سے تعلق رکھتے تھے، اس کے علاوہ ریشمی رومال تحریک میں مولانا احمد علی لاہوری، مولانا سید ہادی حسن، مولانا ظہور محمد خاں، مولانا غلام محمد دین پوری، مولانا ابوالحسن تاج محمود (سکھر)، مولانا محمد صادق اور مولانا جلیل احمد کیرانوی وغیرہ اس زمانہ کے مشاہیر مجاہدین آزدای میں تھے، جن کے نام تک سے آج نئی نسل کے کان ناآشنا ہیں۔

ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں ایک اہم کردار 'خلافت تحریک' کا بھی ہے، جس نے ملک کو شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک انگریزوں کے خلاف ''بنیان مرصوص'' بنادیا تھا اور ہندو، مسلم اتحاد کی لہر پیدا کردی تھی، یہ تحریک گو 1920ء میں شروع ہوئی اور 1942ء میں ختم ہوگئی؛ لیکن اس نے ہندوستانیوں کے دل سے حکمرانوں کی ہیبت اور فرمانرواؤں کا خوف نکال کر رکھ دیا اور نیا عزم وحوصلہ اور نئی ہمت وامنگ عطا کی، خود گاندھی جی کو اعتراف تھا کہ خلافت ہی کی تحریک ہے، جس نے قوم کو بیداری عطا کی ہے، اس تحریک کے اصل مؤسس علماء ہی تھے، جن میں مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کا نام سرفہرست ہے، جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد ہی خاص اس لیے پڑی کہ وہ مسلمانوں کو شمع آزادی کا پروانہ بنائے رکھے، اور اس مقصد کے لیے جینا مرنا سکھائے، جمعیۃ علماء کے اولین محرک مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ تھے، جو شیخ الہند مولانا محمود حسن سے بڑا تعلق رکھتے تھے، اور مولانا ابوالکلام آزاد اہم امور پر ان سے مشورہ لیا کرتے تھے، مولانا نے سب سے پہلے بہار میں ''انجمن علماء بہار'' قائم کی اور خلافت کمیٹی کے پہلے اجلاس منعقدہ بمبئی 1920ء میں جمعیۃ کے قیام کی تحریک کی۔

1920ء میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے ترک موالات سے متعلق فتویٰ مرتب کیا، جس پر وقت کے پانچ سو ممتاز علماء نے اپنی تصدیقی دستخط ثبت کئے، ان میں جہاں ایک طرف

دیوبند کے مفتی کفایت اللہؒ اور مولانا احمد سعید کے دستخط تھے، وہیں ندوہ سے علامہ سید سلیمان ندوی کے، اور جہاں غیر مقلد حضرات کی طرف سے مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبدالحکیم گیاوی مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی اور مولانا داؤد غزنوی نے اس فتویٰ کی تائید کی، وہیں بریلوی مکتبۂ فکر سے مولانا فاخرالہ آبادی اور مولانا عبدالماجد بدایونی نے حق نمائندگی ادا کیا۔

تحریک ترک موالات ہی کے موقع سے علامہ شبلیؒ نے وہ مشہور نظم کہی، جس میں انگریزوں کو چیلنج بھی تھا اور ہندوستان کے حال زار پر غم اور افسوس کا اظہار بھی کہ:

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو!
یہ ظلم آرائیاں تاکے ؟ یہ حشر انگیزیاں کب تک ؟
کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی ؟
دکھاؤگے ہمیں جنگ صلیبی کا نشاں کب تک ؟

گاندھی جی کی تحریک نمک سازی اور کھدر پوشی کو بھی علماء نے مذہبی رنگ عطا کیا اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے لاہور کے اجتماع میں 1931ء میں اس حدیث سے اس پر استدلال کیا، جس میں گھاس نمک اور پانی کو مباح الاصل قرار دیا گیا ہے۔

1946ء میں جو ہندوستان چھوڑ دو تحریک شروع ہوئی، کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس کے اصل محرک مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ تھے، ان ہی کی تجویز پر کانگریس اور جمعیۃ العلماء نے اس تجویز کو منظور کیا، جس کے نتیجہ میں مولانا گرفتار ہوئے اور بہت کچھ ابتلاؤں سے گذرے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مکمل آزادی کا نام پہلی دفعہ مولانا محمد علی جوہر ہی کی زبان پر آیا، مولانا نے گول میز کانفرنس لندن میں پوری قوت اور مجاہدانہ جوش کے ساتھ فرمایا:

''میں غلام ہندوستان میں واپس نہیں جاؤں گا، میں یہاں سے اس وقت لوٹوں گا، جب میرے ہاتھ میں ہندوستان کی آزادی کا پروانہ ہوگا ،تم مجھے آزادی کا پروانہ نہیں دے سکتے تو میرے لیے اس سرزمین میں ایک قبر کی جگہ تو دینی ہی پڑے گی''

یہ حقیقت بھی آج کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ 'کانگریس پارٹی' جس کو جنگ آزادی کا ہیرو سمجھا

جا تا ہے، اس کی تاسیس اس جنگ آزادی کے لیے عمل میں نہیں آئی تھی؛ بلکہ خود ایک انگریز کی ایماء پر 7؍دسمبر 1884ء کو تھیوسافیکل سوسائٹی کے اجلاس پونا میں کانگریس کے قیام کی تجویز منظور ہوئی، جسے وائسرائے ہند نے منظوری دی اور دسمبر 1885ء میں اس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا، اور اس میں جو اہم ترین تجویز منظور ہوئی، وہ یہ تھی کہ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان اتحاد اور یگانگت پیدا کی جائے۔

تحریک آزادی کے آخری دور میں جن لوگوں نے قوم و ملک کی قیادت کی ہے اور جذبۂ حریت کی شرر کو شعلہ و آتش بنایا ہے، ان میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا محمد میاں، مولانا منت اللہ رحمانی، مولانا عبد الصمد رحمانی، مولانا سید فخر الدین احمد، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا عبد الحکیم صدیقی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری، مولانا محمد اللہ غزنوی اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کے نام آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہیں، اور اس عہد کی ''جمعیۃ علماء ہند'' کو بھی یاد رکھا جائے گا، جس نے کانگریس کے دوش بدوش اور قدم بہ قدم اس جد و جہد میں حصہ لیا، اور ملک و قوم سے وفاداری کا حق ادا کیا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کو انگریزوں سے ایسی نفرت تھی کہ فرماتے تھے:

> ''انگریزوں سے جنگ کرنا جزو ایمان ہے، میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھ سکتا، جب تک انگریز یہاں سے چلا نہ جائے''

مولانا حسین احمد مدنیؒ فرمایا کرتے تھے:

> ''میرا بس ایک ہی دشمن ہے اور وہ ہے انگریز، اگر کوئی کتا بھی کسی انگریز بہادر کو کاٹ کھائے یا اس پر بھونک دے، تو مجھے اس لیے خوشی ہوگی کہ اس کا اور میرا مشن ایک ہے، میں مسلمانوں کے ساتھ دوسرے مذہب کے پریمیوں کو بھی تلقین کرتا ہوں کہ اس ملک میں مذہب کی خیر صرف اس صورت میں ہے کہ انگریزوں کو ہم نکال باہر کریں''

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی انگریزوں سے نفرت کا حال یہ تھا کہ کہا کرتے تھے:

''میں تو اس چیونٹی کو بھی شکر کھلاؤں گا، جو کسی صاحب بہادر انگریز کو ڈس لے، انگریز دشمنی میری سانس کے ساتھ ہے، دین کے دیگر فرائض کی طرح انگریز سے جنگ کرنا ایمان اور ان کی فوجی طاقتوں سے ڈرنا کفر ہے''

اب اخیر میں اس تحریک آزادی کے گل سرسبد مولانا ابوالکلام آزادؒ کا ذکر کرنا چاہوں گا، جس نے زندگی کے اکثر حصے قید واسارت کی دیواروں میں بسر کئے، رفیقۂ حیات کے جنازہ میں شرکت سے بھی محروم رہا، اور جس نے ''الہلال والبلاغ'' کے ذریعہ ہندوستان کے تن مردہ میں ایک نئی روح پھونک دی اور نئی زندگی پیدا کی، جس کی رات کی کروٹیں اس مقصد کے لیے بے سکون تھیں اور جس کی نم آنکھیں ہر صبح وشام آزادیٔ وطن کے ترانے گاتی تھیں اور دلوں کے ساز کو چھیڑتی تھیں، اور کانگریس کے اونچے لیڈروں میں جس نے سب سے آخر آخر کراہتِ خاطر کے ساتھ ملک کی تقسیم کو گوارا کیا تھا، ڈاکٹر تاراچند مولانا آزاد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا، اپنی پوری قوت، اپنی بے مثال خطابت، اپنے متوازن نظریئے، اپنے عاقلانہ مشورے، اپنی وسیع النظر حب الوطنی، اپنا ابلتا ہوا جوش، اپنا احساس برتری، اپنی مقصدیت، یہ سب انہوں نے ہندوستان کی آزادی کی بھینٹ چڑھا دیا''

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر تاراچند کا یہ اعتراف ایک ایسی حقیقت کا اعتراف ہے، جو مہر نیم روز سے بھی زیادہ روشن اور تابناک ہے!

اور ہندوستان کی تاریخ آزادی ہمیشہ اس مرد مجاہد کو بھی یاد رکھے گی، جس نے آزادی کی اس جدوجہد میں بھرپور شرکت کی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے آخری اجلاس میں بھی، جو چھ سو ارکان پر مشتمل تھی، تقسیم ملک کی تجویز کی شدت سے مخالفت کی؛ لیکن ایک آواز بھی اس کی تائید میں نہ اٹھ سکی، میری مراد مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ سے ہے، افسوس کہ ان شہداء قوم اور جاں نثاران ارض و طن کا نام تک آج زبان پر نہیں آتا؛ لیکن یہ سعید روحیں آج کے ہندوستان سے ضرور کہتی ہوں گی

کہ:

تیرے نکھرے عارضوں میں ، تیرے سنورے گیسوؤں میں
میری صبح کی چمک ہے ، میرے شام کی سیاہی
تجھے گر یقین نہ آئے تو میں آئینہ دیکھا دوں
تیرا حسن دے رہاہے میرے عشق کی گواہی

سلامتی ہوان مجاہدین آزادی پر، ان کی روحوں پر، ان کی خواب گاہوں پر کہ ان کی شہادت کے خون ولہو کی سرخی نے آج ان کے وطن کو لالہ زار بنادیا ہے، غلامی کی زنجیریں کٹ چکی ہیں، غیر ملکی بادشاہت کے آہنی لباس تارتار ہو چکے ہیں، ان میں کچھ نے اپنی آنکھوں کو اس آزادی سے ٹھنڈا کیا ہے، کچھ حسرتوں کے ساتھ خدا کے ہاں پہلے ہی چلے گئے، کچھ کے نام تاریخ کے صفحات نے یاد رکھے ہیں اور کتنے ہی ہیں کہ خدا کے سوا ان کی قربانیوں، فداکاریوں اور جانبازیوں کو کوئی نہیں جانتا۔

ہم فرزندان وطن کا فرض ہے کہ آزادی کے اس چراغ کو روشن رکھنے کی کوشش کریں، ہم ذات پات، مذہب وبرادری اور زبان کی سطح سے اوپر اٹھ کر ایک سچے اور ایماندار ہندوستانی ہونے کا ثبوت دیں، یہاں اقلیتیں خود کو محفوظ باور کریں، اکثریت اور اقلیت کے لیے انصاف کا ایک ہی پیمانہ ہو، وہ مزدور کہ بلند وبالا عمارتیں، سرسبز وشاداب باغات، خوبصورت نہریں اور صاف وشفاف سڑکیں سب انہیں کے پسینوں کی رہین منت ہیں، ان کو ان کا حق ملے، اور ہر گھر میں مسرت و خوشحالی اور انصاف کا چراغ جل سکے، وہ آزادی جو دلوں کو سکون دے، جو امتیاز وتفریق کی دیواروں کو ڈھادے، جو بلند وبالا عمارت میں رہنے والوں میں بھی غریبوں کی جھونپڑیوں سے محبت پیدا کردے، جہاں مذہب نفرت کی بنیاد نہ ہو؛ بلکہ مختلف مذاہب کی رنگارنگی اس کو گلدستہ کا مصداق بنادے کہ:

گل ہائے رنگارنگ سے ہے زینت چمن

۲۴، ۳۰/ اگست ۲۰۰۷ء

دہشت گردی کا علاج

قرآن مجید میں جن قوموں پر اللہ تعالی کے عذاب کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ایک حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم ''اصحاب مدین'' بھی ہے، یہ اپنے زمانہ کی متمدن قوموں میں سے تھی، اس قوم میں شرک وکفر کی پرانی بیماری تو تھی ہی، اس کے ساتھ ساتھ ایک اور اخلاقی وسماجی برائی درآئی تھی، اور وہ یہ تھی کہ وہ ناپ تول کے معاملہ میں کمی وزیادتی سے کام لیتے تھے، اس کے لئے انہوں نے دو پیمانے بنا رکھے تھے، جب کسی سے کوئی چیز لینی ہوتی تو الگ پیمانہ استعمال کرتے، جس کا وزن زیادہ ہوتا، اور جب وہی چیز واپس کرنی ہوتی تو کم وزن پیمانہ استعمال کرتے، اس جرم کو خدا کی بارگاہ میں ایسا شدید جرم سمجھا گیا کہ اس کی وجہ سے بھی ان پر اللہ کا عذاب نازل ہوا، اور پوری کی پوری قوم تباہ وبرباد کردی گئی۔ (اعراف:۸۶)

قرآن مجید میں بھی اس طریقۂ کار کی مذمت کی گئی ہے، اور اس کو تباہی وبربادی کا پیش خیمہ قرار دیا گیا ہے: {وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ} (المطففین:۱) ''تطفیف'' کے معنی بھی تول میں کمی بیشی کے ہیں؛ کیوں کہ لین دین کے پیمانوں کا الگ ہونا اور کم تولنے کا ارتکاب کرنا ایک کھلا ہوا ظلم ہے، اور اللہ کو اس کی بسائی ہوئی بستی میں ظلم گوارا نہیں ہے، پیمانوں کا یہ فرق معمولی چیزوں کے لین دین میں بھی ہوتا ہے اور قوموں کے ساتھ اجتماعی سلوک و برتاؤ میں بھی، ایک ہی طرح کے جرم پر اگر دو افراد یا دو گروہوں کے ساتھ الگ الگ سلوک کیا جائے تو یہ بھی ظلم وزیادتی اور کم تولنا ہے؛ بلکہ اس کی وجہ سے اس ظلم سے لگنے والے زخم زیادہ گہرے اور تکلیف دہ ہوتے ہیں اور جب مظلوم انصاف سے ناامید ہوجاتا ہے تو مجرم لاقانونیت پر اتر آتا ہے اور اس سے پورے ماحول میں فساد پیدا ہوجاتا ہے۔

اس وقت پوری دنیا میں اور خود ہندوستان میں بھی دہشت گردی کا اصل سبب یہی ہے،

اسرائیل کے لئے فلسطینیوں کا خون بہانا محض ایک تفریح ہے، معصوم بچے اور نہتھی خواتین بھی اسرائیلیوں کی زیادتی محفوظ نہیں ہیں، معمولی سی بات پر ان کے مکانات کی اینٹ سے اینٹ بجادی جاتی ہے، مظلوم فلسطینی اپنے ہی وطن میں آبرومندانہ زندگی سے محروم ہیں، ان کی جان و مال اور عزت وآبرو کی کوئی قیمت نہیں ہے؛ لیکن اس کے باوجود اسرائیل کے ہاتھ نہیں تھامے جاتے اور نہ اس کو دہشت گرد کہا جاتا ہے، دوسری طرف فلسطینی اپنے مادر وطن کی آزادی کے لئے جو کوشش بَن آتی ہے، کرتے ہیں اور اسرائیل کے ظلم کا جواب دینا چاہتے ہیں، تو انہیں دہشت گرد اور انتہا پسند کہا جاتا ہے، عراق اور افغانستان میں امریکہ نے ایک مستحکم حکومت کو تباہ و برباد کیا، صدام حسین کے ذریعہ تو چند ہزار افراد مارے گئے اور اس کے ظلم سے بچانے کے نام پر امریکہ اب تک چھ لاکھ عراقیوں کو شہید کر چکا ہے؛ لیکن افغانستان و عراق کو دہشت گرد ٹھہرایا جاتا ہے، اور امریکہ و برطانیہ جیسی دہشت گرد طاقتوں کو کوئی ملک دہشت گرد کہنے کو تیار نہیں ہے، چیچنیا اور قفقاز کا علاقہ طویل عرصہ تک آزاد علاقہ رہا ہے، کمیونسٹوں نے زبردستی اس ملک پر قبضہ کیا، سوویت یونین کے بکھرنے کے بعد مختلف ملکوں کے لئے آزادی کی گنجائش رکھی گئی، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چیچینا کے لوگوں نے آزادی کے حق میں ووٹ دیا، انہیں زبردستی آزادی سے محروم کر دیا گیا اور ان پر ایسے مظالم ڈھائے گئے کہ جس کے تصور سے بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے؛ لیکن روس کو ظالم نہیں کہا جاتا اور چیچنیا کے مظلوم مسلمانوں کو دہشت گرد کہا جاتا ہے، اس صورتِ حال نے مظلوم کو انصاف سے مایوس کر دیا ہے، اور بجائے اس کے کہ وہ قانون کا دروازہ کھٹکھٹاتے، ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوف آگئی ہے۔

افسوس کہ اس وقت ہمارا ملک ہندوستان اسی راستہ پر ہے، آزادی کے بعد سے اس ملک میں ہزاروں کی تعداد میں فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے ہیں، ان میں سنگھ پریوار کے تربیت یافتہ دہشت گردوں اور جانبدارانہ رویہ کی حامل پولیس کی زیادتیوں نے ہزاروں مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا ہے، ان کی املاک لوٹی ہے اور ان کی عزت وآبرو کو پامال کیا ہے، ابھی حالیہ برسوں میں بھاگلپور میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا، میرٹھ کے محلہ ہاشم پورہ اور ملیانہ میں پولیس نے بے دردی سے سینکڑوں مسلمانوں کو شہید کیا، مراد آباد میں عین عید کے دن پولیس نے مسلمانوں کے خون سے

ہولی کھیلی، جمشید پور میں سینکڑوں مسلمان شہید کردئے گئے، بابری مسجد کی شہادت کا افسوس ناک واقعہ علی الاعلان پیش آیا، ممبئی میں ایسا خون ریز فساد ہوا کہ جس کی مثال کم ملتی ہے، اور گجرات کے فساد نے تو ظلم کی پچھلی تمام داستانوں کو شرمسار کردیا، بابری مسجد کی شہادت، ممبئی کے فساد اور گجرات کے دنگے میں پولیس کا ظالمانہ رول دو پہر کی دھوپ سے بھی زیادہ واضح ہے، ان فسادات میں سے بعض وہ ہیں کہ جن کے بارے میں خود حکومت کے بنائے ہوئے کمیشن کی رپورٹ آچکی ہے، اور اس میں واضح طور پر پولیس اور ہندو فرقہ پرست قائدین کو مجرم ٹھہرایا گیا ہے؛ لیکن افسوس کہ اس کے باوجود حکومت نے خود اپنے مقرر کئے ہوئے کمیشن کی تجاویز کو بھی سرد خانہ میں ڈال دیا ہے، اس کے برخلاف ممبئی فساد کے رد عمل میں ہونے والے ''ممبئی بم بلاسٹ'' کے مقدمہ کی تیز رفتاری کے ساتھ سماعت کی گئی، ان پر ٹاڈا کی دفعات لگائی گئیں، اور انہیں قرار واقعی سزائیں دی گئیں۔

اس طرح کی بے شمار مثالیں ہمارے ملک میں موجود ہیں، یہی انصاف کے دو الگ الگ پیمانے اور دو گروہوں کے ساتھ دو طرح کا رویہ ہے، جو دہشت گردی کا سبب بن رہا ہے، پھر دہشت گردی کے جو واقعات سامنے آرہے ہیں، ان کی تحقیق کا رخ بھی صحیح نہیں ہوتا، مثلاً اگر کسی مندر میں بم دھماکہ ہو تو یہ بات سوچی جاسکتی ہے کہ کسی گمراہ مسلمان نے اس حرکت کا ارتکاب کیا ہو؛ لیکن اگر مسجد میں بم دھماکہ ہو تو اس کا قصور وار بھی مسلمان کو ٹھہرایا جائے، اور شک کی سوئی مسلمانوں کی طرف گھمادی جائے، یہ زیادتی بھی ہے اور نامعقولیت بھی، یہ حرکت فرقہ پرست ہندو دہشت گردوں کی بھی ہوسکتی ہے، اور اس کے پیچھے سنگھ پریوار کا بھی ہاتھ ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ وہ تو ہندوستان میں دہشت گردی کے اصل نقیب ہیں۔

اس پس منظر میں ملک کے ایک محب وطن اور بہی خواہ شہری ہونے کی حیثیت سے ہماری حکومت سے التجاء ہے کہ وہ دہشت گردی کی تحقیق کے لئے منصفانہ کوششیں تو کرے ہی؛ لیکن دہشت گردی کی اصل بنیاد کو پیش نظر رکھے، جب تک کسی خطہ میں انصاف قائم نہیں ہوگا، دو گروہوں کے درمیان عدل کے لئے ایک ہی پیمانہ نہیں رکھا جائے گا، اور تمام لوگوں کو مایوسی و نا امیدی اور مظلومیت کے احساس سے نہیں بچایا جائے گا، اس وقت تک ملک میں امن قائم نہیں ہوسکتا، دہشت گردی کی اس بنیاد کو نظر انداز کرتے ہوئے چند افراد کو گرفتار کرنا یا انہیں سزا دینا

درخت کی جڑوں کو چھوڑ کر ٹہنیوں اور پتیوں پر پانی ڈالنے کے مترادف ہوگا، اور ہر قطرۂ خون نئے دہشت گردوں کے وجود میں آنے کا سبب بنتا جائے گا؛ اس لئے ملک وقوم کے سربراہوں کو سر جوڑ کر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کس طرح اس ملک میں بسنے والی تمام اکائیوں کو انصاف دیا جاسکتا ہے اور انہیں ناامیدی و مایوسی سے بچایا جاسکتا ہے؟

رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو پہلا کام آپ ﷺ نے یہی کیا کہ مسلمانوں کے مختلف قبائل اور یہودیوں کے مختلف خاندانوں کے درمیان ایک ایسا معاہدہ کرایا جس میں تمام لوگ باعزت طور پر رہ سکیں اور آپ ﷺ اس پر آخر وقت تک قائم رہے، جب تک خود یہودیوں نے اپنا عہد توڑ نہیں دیا، پھر صلح حدیبیہ میں اسی طرح کا معاہدہ اہل مکہ سے ہوا، اور ۸ھ میں آپ ﷺ نے جب مکہ کی طرف پیش قدمی فرمائی تو یہ پیش قدمی ایک مشرک قبیلہ ''قبیلہ بنوخزاعہ'' کی التجاء پر تھی، جو اس معاہدہ میں شریک تھے اور جن کے ساتھ اہل مکہ نے بڑا ظلم کیا تھا، گویا ایک مشرک قبیلہ کی حمایت میں انصاف کو قائم رکھنے کے لئے آپ ﷺ نے مکہ پر فوج کشی فرمائی، پھر غیر مسلم اقلیتوں کے بارے میں آپ ﷺ نے بہت واضح ہدایات دیں کہ ان کی جان و مال اور عزت وآبرو کی وہی قیمت ہے جو مسلمانوں کی جان و مال اور عزت وآبرو کی ہے، ایسی مثالیں موجود ہیں کہ امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی ہی مملکت کے ایک یہودی شہری کے خلاف قاضی شریح کی عدالت میں ایک مقدمہ دائر کرتے ہیں، اور فیصلہ خود ان کے خلاف ہوتا ہے، عدل وانصاف مظلوموں کو ناامیدی سے بچاتا ہے اور انصاف کی امید لوگوں کو لاقانونیت کی طرف لے جانے سے روکتی ہے، جب تک اس حقیقت کو نہیں سمجھا جائے، کیسی بھی طاقت وقوت استعمال کیوں نہ کرلی جائے، دہشت گردی کا سدّ باب نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ ''تنگ آمد بہ جنگ آمد'' کے مصداق بہت سے مظلوم اور انصاف سے محروم لوگ اپنا سر اپنی ہتھیلی پر رکھ کر دہشت گردی کا ارتکاب کرتے ہیں، جو خود مرنے کو تیار ہو، موت کا خوف ایسے گمراہ نوجوانوں کو کیوں کر زیر کرسکتا ہے؟

دوسرا پہلو خود مسلمان امت کے لئے غور کرنے کا ہے، ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ہم ایک داعی امت ہیں، ہماری ایک امتیازی شناخت ہے کہ ہم خدا کی محفوظ اور سچی کتاب کے حامل ہیں، ہمارا دین آفاقی دین ہے، یہ دین یک طرفہ محبت کا سوداگر ہے، داعی کا کام یہ ہے کہ جو قوم اس کی

مدعو ہو اس کی ظلم وزیادتی کو بھی نظر انداز کرے، غور کیجئے کہ رسول اللہ ﷺ کو اہل مکہ نے کیا کچھ تکلیفیں نہیں پہونچا ئیں اور کیسی کیسی آزمائشوں سے آپ ﷺ نہیں گزرے؛ لیکن مکہ فتح ہونے کے بعد اور اس سے پہلے بھی آپ ﷺ نے اپنی مدعو قوم سے کس قدر عفو ودرگزر کا معاملہ فرمایا، احد کے میدان میں جسم سے خون کا فوارہ رواں ہے؛ لیکن زبان پر کلمۂ محبت جاری ہے اور ان تکلیف پہونچانے والوں کو دعائیں دی جارہی ہیں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ زیادتی تو کسی اور نے کی ہو اور مسلمانوں نے پوری سوسائٹی سے یا اس کے بے قصور لوگوں سے انتقام لیا ہو۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دہشت گردی کا اسلام میں کوئی تصور نہیں ہے، ہمارا دین انصاف کا دین ہے، ہمارے نبی ﷺ کائنات کے لئے رحمت تھے، اور آپ ﷺ کی تعلیمات سراپا عدل پر مبنی ہیں، ہماری کتاب قرآن مجید امن کی پیغامبر ہے، ہم ایک داعی امت ہیں اور انسانیت کے لئے محبت وشفقت، پیار، عفو ودرگزر اور اخوت و بھائی چارگی کی سوغات لے کر آئے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم داعیانہ کردار کو چھوڑ کر اپنے آپ کے لئے بھی بدنامی کا باعث بنیں اور دین کے لئے بھی بے آبروئی کا۔

۱۴/ستمبر ۲۰۰۷ء

ذٰلِکَ الْکِتَابُ لاَ رَیْبَ فِیْہِ

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو حضرت انسان کے لئے پیدا فرمایا ہے، ایسا لگتا ہے کہ انسان کو سہولتیں پہونچانے میں پوری کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز متحرک ہے، کسی کا کام روشنی اور حرارت پہونچانا ہے، کسی کا کام پانی کی ضرورت پوری کرنا ہے، کوئی سایہ فراہم کرنے کے لئے دست بستہ کھڑا ہے، کسی نے انسان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہونچانے اور روح کو تازگی بخشنے کے لئے سبز دوپٹہ اوڑھ رکھا ہے، غرض پوری کائنات حرکت میں ہے؛ حالاں کہ انسان خود اس کائنات کو کوئی مادہ نفع پہونچانے کا اہل نہیں ہے، یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ وہی اس کائنات کا مقصود اور لب لباب ہے: {هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا} (البقرۃ:۲۹) اور خود انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ اس کائنات کے خالق کی اطاعت وفرماں برداری اور بندگی میں لگا رہے، جو انسان بندگی کا جتنا اعلیٰ نمونہ ہو، وہ اسی قدر مکمل انسان ہے: {وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلاَّ لِيَعْبُدُوْنِ} (الذاریات:۵۶) انسان کی اصل جگہ آخرت ہے نہ کہ دنیا، یہ تو ایک عارضی قیام گاہ؛ بلکہ گزرگاہ ہے: {وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلىٰ حِيْنٍ} (البقرۃ:۳۶) وہ یہاں اس لئے بھیجا گیا ہے کہ بندگی کے امتحان میں شریک ہو اور اس میں پورا اترے، وہ اپنے اختیار اور اپنی خواہشات کو اس کی مرضیات کے تابع بنائے:

{إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً}

(الکہف:۷)

اس لئے انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان باتوں سے آگاہ ہو جن سے خدا خوش ہوتے ہیں اور ان باتوں سے بھی جن سے خدا ناراض ہوتے ہیں، اسی کے لئے خدا کی طرف سے نبوت کا نظام قائم ہوا، اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اپنے پیغمبروں اور رسولوں کو بھیجا، جو آسمانی کتابوں کے ساتھ دنیا

میں آئے اور انسانوں کی ہدایت کا فریضہ انجام دیا، دین یعنی عقائد تو ہمیشہ ایک ہی رہے؛ لیکن شریعت یعنی قانون زندگی میں وقت کے لحاظ سے من جانب اللہ تبدیلیاں بھی کی گئیں، اور انسان کی صلاحیت واہلیت اور ضرورت کے لحاظ سے احکام دئے گئے، مثلاً بھائی ''بہن کے درمیان نکاح کا حرام ہونا'' مختلف آسمانی کتابوں؛ بلکہ مختلف مذاہب کے درمیان ایک متفق علیہ حقیقت ہے؛ لیکن حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت میں اس نکاح کو جائز رکھا گیا؛ اس لئے کہ اس وقت انسانوں کی چھوٹی سی بستی مشتمل ہی تھی حضرت آدم وحواء علیہما السلام کی اولاد پر، اور سب بھائی بہن ہی تھے، اگر ان کے درمیان نکاح کو حرام قرار دے دیا جاتا تو نسل انسانی کی افزائش ہی ممکن نہیں ہوتی۔

پھر جس طرح انسان کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے کپڑے چھوٹے اور ناکافی ہوتے جاتے ہیں، اور جب وہ شباب کی عمر کو پہونچتا ہے، تو اب اس کی شخصیت مکمل ہوجاتی ہے، اور جو لباس اس کے جسم پر موزوں ہوتا ہے، وہ ہمیشہ اس کے لئے کفایت کرتا ہے، اسی طرح انسان کی شعوری اور تمدنی صلاحیتوں کے لحاظ سے شریعتیں آتی رہیں، اور جب انسانیت اپنے بلوغ وشباب کو پہنچ گئی، تو قرآن مجید کی شکل میں شریعت محمدی دی گئی، اب آپ ﷺ کی نبوت قیامت تک کے لئے ہے، آپ ﷺ کے بعد کسی نبوت کی ضرورت باقی نہیں رہی؛ اسی لئے آپ ﷺ کو خاتم النبیین کا لقب دیا گیا: { وَلٰکِنْ رَسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ } (الأحزاب: ۴۰)، آپ ﷺ کے ذریعہ آنے والی شریعت ایسی مکمل شریعت ہے کہ یہ قیامت تک کے لئے کفایت کرے گی، اب کسی نئی شریعت کی حاجت باقی نہیں رہی:

{ اَلْیَوْمَ أَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْإِسْلاَمَ دِیْنًا } (المائدہ: ۳)

اور آپ ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید آخری کتاب ہے، اس کے بعد کوئی آسمانی کتاب نہیں آسکتی؛ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے اور جس پیمانہ پر اس کی حفاظت کا غیبی انتظام ہوا ہے، وہ خود ایک معجزہ اور قرآن مجید کی حقانیت کی دلیل ہے:

{ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَإِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ } (الحجر: ۹)

جو چیز زندہ ہوتی ہے، اس میں قدرتی طور پر اثر انگیزی پائی جاتی ہے، انسان کتنا بڑا بھی ہو؛

لیکن جب اس کی موت ہوجاتی ہے،تو انسان کا رابطہ اس سے کمزور ہوتا جا تا ہے، دوائیں کتنی بھی قیمتی اور عمدہ ہوں؛ لیکن جب اس کی مدت کارکردگی ختم ہوجاتی ہے،تو وہ مریض کو فائدہ نہیں پہنچا پاتیں، اسی طرح جن کتابوں کا دورختم ہو چکا، ان میں لوگوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی، وہ انقلاب انگیزی کی قوت سے محروم ہوچکیں،قرآن مجید چوں کہ ایک زندہ کتاب ہے، اور اسے قیامت تک انسان کے لئے چراغ ہدایت بن کر رہنا ہے؛ اس لئے اس میں متاثر کرنے ،فکر و نظر کی دنیا میں انقلاب پیدا کرنے اور عمل ورویہ میں صالح تبدیلی لانے کی بے پناہ صلاحیت ہے، اسی کا اثر ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب مغرب میں چرچ کلبوں اور شراب خانوں میں تبدیلی ہورہے ہیں، پوری دنیا میں مسجدوں کی رونقیں بڑھ رہی ہیں، اور بے حیائی وفحاشی کے سیلاب میں بھی بہت سے مسلمان نوجوان اخلاقی قدروں کا جزیرہ تعمیر کرنے کے لئے کوشاں ہیں،تمام قومیں اپنے اپنے مذہب سے اور مذہبی پیشواؤں سے بیزار ہیں؛ لیکن مسلمان اپنے دین کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں،جن مسلمان ملکوں میں نصف صدی اور ربع صدی سے مسلمانوں کو اسلام سے بیزار کرنے کی منظم تحریکیں چل رہی ہیں، وہاں بھی جب الیکشن ہوتا ہے،تو اسلام پسند جماعتیں فتح یاب ہوتی ہیں۔

یہ وہ صورت حال ہے،جس نے خدا بیزار قوموں کو بے قرار کر رکھا ہے،ان کا احساس ہے اور یہ احساس درست ہے کہ مسلمانوں کے اپنے مذہب سے تعلق کا اصل سبب قرآن مجید ہے؛ اس لئے قرآن مجید کے خلاف بیانات کا ایک سلسلہ چل پڑا ، امریکہ کی موجودہ وزیر خارجہ کنڈولیزا رائس وزیر خارجہ بننے سے پہلے قرآن مجید کے بارے میں زہر افشانی کر چکی ہیں، کہ اُس کتاب میں کچھ تو ایسی بات ہے، جو انسان کو دہشت گردی کی طرف لے جاتی ہے، ابھی گزشتہ ماہ نیدرلینڈ کے ایک رکن پارلیمنٹ گیرٹ ولڈرس —— جو دائیں بازو کی انتہا پسند فریڈم پارٹی کے قائد ہیں —— نے مطالبہ کیا تھا کہ قرآن مجید پر امتناع عائد کیا جائے؛ کیوں کہ یہ ہٹلر کی کتاب ’’مین کیمف‘‘ کی طرح ہے، اس کا دعویٰ ہے کہ اس کتاب میں بے دینوں کو قتل کرنے، یہودیوں اور مشرکوں کو ہلاک کرنے اور ان کی عورتوں کی عصمت ریزی کرنے کی اجازت دی گئی ہے، خود ہندوستان میں بھی فرقہ پرست گروہوں کی طرف سے ایسی بے سروپا باتیں آتی رہی ہیں، کلکتہ

ہائیکورٹ میں تو قرآن پر پابندی کے سلسلہ میں مقدمہ بھی دائر کیا گیا، وی، ایچ، پی کے لوگوں نے جہاد وغیرہ سے متعلق قرآن مجید کی ۲۴ آیات کو خوب چھاپا اور مشتہر کیا اور وی، ایچ، پی کے بعض ذمہ داران تو ہر وقت اس پمفلٹ کو جیب میں رکھتے تھے۔

لیکن ایسی باتوں اور ناروا کوششوں کی مثال ان بے فیض بادلوں کی ہے جو سورج کی روشنی کو چھپانا چاہتی ہوں، حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کی تمام تعلیمات کی بنیاد عدل اور اعتدال پر ہے، وہ ایک انسان کے قتل ناحق کو پوری انسانیت کا قتل ناحق قرار دیتا ہے:

{مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا} (المائدۃ: ۵۴)

اس کے نزدیک بلا امتیاز پوری انسانیت کا خون قابل احترام ہے، اس لئے مسلمان و کافر کا فرق کئے بغیر کسی بھی شخص کے قتل کو موجب قصاص قرار دیا گیا: {وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ۔۔۔} (المائدۃ: ۴۵)، اس نے ان لوگوں سے جہاد کی دعوت دی ہے جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہوں اور اس حال میں بھی تلقین کی ہے کہ حدود سے تجاوز نہ ہو:

{وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ} (البقرۃ : ۱۹۰)

اس نے جہاد کو ظلم کا ہتھیار نہیں بنایا؛ بلکہ مظلوموں کو ظالموں کے خلاف ہاتھ اٹھانے، مدافعت کرنے اور غلامی کی زنجیروں کو قبول کر کے ظالموں کی حوصلہ افزائی نہیں کرنے کی تلقین کی ہے: {أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا} (الحج: ۳۹)

یہ کتاب پوری انسانیت کو ایک کنبہ اور ایک خاندان قرار دیتی ہے، ایسا خاندان جو ایک ہی ماں اور باپ یعنی آدم علیہ السلام وحواء علیہا السلام سے پیدا ہوا ہے {خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ} (النساء: ۱)، یہ کتاب نسلی تفریق کی دیوار کو منہدم کرتی ہے، گورے اور کالے کے امتیاز کو مٹاتی ہے، مغرب اور مشرق کے فاصلہ کو پاٹتی ہے، اور اخلاق و کردار اور قانون کی پاسداری کو شرف و عزت کی بنیاد قرار دیتی ہے {إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ} (الحجرات: ۱۳)، اس کتاب کی بنیادی دعوت عدل و احسان کی ہے: {إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْإِحْسَانِ} (النحل: ۹۰)، عدل انصاف کا نام ہے

اور احسان انصاف سے آگے بڑھ کر بہتر سلوک سے عبارت ہے، پھر یہ عدل واحسان دوستوں کے ساتھ بھی ہے اور دشمنوں کے ساتھ بھی ہے، اپنوں کے معاملہ میں بھی ہے اور بیگانوں کے معاملہ میں بھی ہے: {لاَیَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰی أَنْ لاَتَعْدِلُوْا}۔

(المائدۃ:۸)

اس کی تمام تعلیمات اعتدال پر مبنی ہیں، اس نے امت مسلمہ سے بھی کہا ہے کہ تم ایک معتدل اور میانہ روامت ہو: {وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ أُمَّۃً وَّسَطًا} (البقرۃ:۱۴۳)، وہ انسانیت کو خدا کی عبادت اور بندگی کا حکم دیتی ہے اور اسے مقصد حیات قرار دیتی ہے؛ لیکن ساتھ ساتھ کسب معاش کی تگ ودو اور طلب رزق کے لئے کدو کاوش کی بھی تلقین کرتی ہے {---فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ} (الجمعۃ:۱۰)، وہ نہ عورتوں کو انسانیت سے کمتر مخلوق قرار دیتا ہے، جیسا کہ دوسری قوموں کا تصور تھا، بلکہ عورتوں کو مردوں کی تکمیل قرار دیتا ہے: {وَخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا} (النساء:۱)، وہ کہتا ہے کہ عورتوں کے حقوق قریب قریب مردوں کے برابر ہیں: {لَھُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْھِنَّ} (البقرۃ:۲۲۸)؛ لیکن سماجی اور خاندانی زندگی میں نظم وضبط کو قائم رکھنے کے لئے یہ بھی کہتا ہے کہ مردوں کی حیثیت صدر خاندان کی ہے {وَلِلرِّجَالِ عَلَیْھِنَّ دَرَجَۃٌ} (البقرۃ:۲۲۸)، اس کے نزدیک توحید اور خدا کی معرفت نجات کی بنیاد ہے؛ لیکن اس نے اس دنیا میں انسانی اخوت کے تحت غیر مسلموں کے ساتھ بھی صلح جوئی اور امن وآشتی کی تعلیم دی ہے:

{لاَیَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِنْ دِیَارِکُمْ أَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْا إِلَیْھِمْ، إِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ} (الممتحنۃ : ۸)

قرآن کو جہاں سے پڑھ جائیں اور زندگی کے جس شعبہ میں بھی اس کی تعلیمات وہدایات کا تجزیہ کریں، ہر جگہ عدل واعتدال کی جلوہ سامانی ملے گی، وہ افراط وتفریط سے پرے ہے، وہ سچائی کا ترجمان ہے، وہ دماغ کو مطمئن کرتا ہے اور دل کو صالح جذبات کی غذا فراہم کرتا ہے، وہ بے چین اور بے سکون انسانیت کے لئے اکسیر ہے، وہ تہذیب نو کے مسائل کا حل ہے؛ لیکن جیسے مریضان چشم کو سورج کی روشنی گراں گزرتی ہے، اور جیسے یرقان میں مبتلا لوگوں کو خوش ذائقہ

چیزوں کا لطف نہیں آتا، اسی طرح جو لوگ حق کی جستجو سے محروم ہو چکے ہوں اور جنہوں نے خدا بیزاری کو اپنا مقصد حیات بنالیا ہے، ان کو اس کتاب سے بغض ہے؛ لیکن یہ وہ چراغ نہیں جو پھونکوں سے بجھا دیا جائے اور یہ وہ روشنی نہیں جس پر تاریکیاں غالب آجائیں {وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ} (الصف:۸)؛ کیوں کہ یہ خدائے قادر مطلق کی کتاب ہے اور اس کا کتاب الٰہی ہونا ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے {ذٰلِکَ الْکِتَابُ لاَرَیْبَ فِیْہِ} (البقرۃ:۲)۔

۱۲/ اکتوبر ۲۰۰۷ء

کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک؟

مسلمان آج کیسی زبوں حالی سے دو چار ہیں، یہ محتاجِ اظہار نہیں، خون ان کا اتنا ارزاں ہے کہ بعض اوقات اس کی قیمت پینے کے صاف پانی سے بھی کم ہوتی ہے، مسلمانوں کا قتل عام ہوسکتا ہے؛ لیکن کیا مجال کہ نامزد قاتلوں پر بھی کوئی آنچ آسکے؟ ملیانہ اور ہاشم پورہ کا مقتل ہو، مراد آباد کی عیدگاہ ہو، آسام میں نیلی اور بہار میں بھاگلپور کا مشہد اکبر ہو یا گجرات کا قتل عام، کون سی جگہ ہے جو مسلمانوں کے خون ناحق سے لالہ زار نہیں؟ مال واسباب اور دکان وکاروبار انہیں مسلمانوں کے لوٹے جاتے ہیں، حیدرآباد میں، جمشید پور میں، مرادآباد اور بھاگلپور میں، راورکیلا اور احمد آباد میں شاید اب بھی ایسے تلخ واقعات کے نقوش موجود ہیں، عزت وآبرو چھپ کر بھی نہیں؛ بلکہ برسرِ عام کن کی نیلام ہوتی ہے؟ مظلوم مسلمانوں کی! اگر سورت کی سڑکوں کو قدرت کی طرف سے قوتِ گویائی دے دی جائے تو شاید آج بھی وہ گواہی دے، پھر اس انسانیت سوز اور شرافت دوز حرکتوں کا ویڈیو بھی تیار ہوتا ہے اور ممبئی کے گلی کوچوں میں اس کی تشہیر کی جاتی ہے تاکہ مسلمان خوب بے آبرو ہوں اور ان کی ذلت ورسوائی اپنی نہایت کو پہنچ جائے۔

یہ تو مسلمانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ کی بات ہے؛ لیکن کونسا میدان ہے جس میں ان کا حال بہتر ہے؟ معاشی اعتبار سے وہ اتنے گئے گزرے ہیں کہ معاشی پسماندگی میں اب کوئی قوم ان کی شریک وسہیم نہیں، تعلیمی صورتِ حال یہ ہے کہ اب ناخواندگی کی سطح مسلمانوں میں ہریجنوں سے بھی آگے بڑھ گئی ہے اور ہماری تعلیمی پسماندگی ملک میں ضرب المثل بنی ہوئی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اعلیٰ ملازمتوں میں ہمارا حصہ دو تین فیصد بھی نہیں رہ گیا ہے، اتر پردیش ملک کی اہم ترین ریاست ہے، جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بھی قابل لحاظ ہے؛ لیکن ریاست کے اضلاع میں سے ایک میں بھی مسلمان ڈی ایم نہیں، کوئی کمشنر مسلمان نہیں، کوئی آئی، جی، ڈی، آئی

جی مسلمان نہیں ، ملک میں قومیائے ہوئے بینکسن ہیں ، جن میں ۴۶۷ ڈائرکٹرس ہیں ، ان میں مسلمان صرف چار ہیں۔

ہم ملک کی دوسری بڑی اکثریت ہیں ؛ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ ہم سب سے بے وزن سیاسی قوت ہیں ، ہندوستان میں سکھوں کی آبادی کا تناسب دو فیصد ہے اور مسلمانوں کی آبادی کا تناسب حکومت کے بیان کے مطابق بھی ۱۳ فیصد سے اوپر ہے ، جو یقینا حقیقت پر پردہ ڈالنے کے مترادف ہے ؛ لیکن سکھ بھی اپنی سیاسی قوت رکھتے ہیں ، اسی طاقت کا نتیجہ ہے کہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کے فساد میں مارے گئے سکھوں کے قاتلوں کو انہوں نے سزائیں دلوائیں اور ایک ایک مقتول کا معاوضہ دس دس لاکھ منظور کرایا ؛ لیکن مسلمانوں کو فسادات میں جو نقصان پہونچے ، بعض اوقات تحقیقاتی کمیشن قائم ہوئے ؛ لیکن اس کی رپورٹ پر کبھی عمل نہیں ہوا اور ممبئی کے فساد کے سلسلہ میں شری کرشنا رپورٹ کو تو نہایت ہی بے شرمی کے ساتھ حکومت مہاراشٹرا نے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور مسلمان کچھ نہیں کرسکے ، یہ تفاوت محض سیاسی بے وزنی کی وجہ سے ہے۔

آخر جو قوم صدیوں اس سرزمین پر فرماں روائی کر چکی ہے اور جس کی عزت وشوکت کے نقوش اور شرافت وانسانیت کے عکوس اس ملک کے چپہ چپہ پر ثبت ہیں ، آج کیوں ذلت وانحطاط کے اس مقام تک پہنچ چکی ہے اور وقت کی ٹھوکریں بھی اس کو خوابِ خرگوش سے بیدار کرنے میں ناکام ونامراد ہیں ؟ —— غور کریں تو ان سب کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے خدا سے اپنا رشتہ کمزور کرلیا ہے اور فرقہ بندیوں اور باہمی عداوتوں نے ہمیں سمندر کی سی طاقت رکھنے کے باوجود قطروں میں تقسیم کردیا ہے ، ایسا قطرہ جسے دھوپ کی ہلکی سی تمازت اور ہوا کا معمولی سا جھونکا بھی وجود سے محروم کرسکتا ہے ، ہجرت کے تیسرے سال غزوۂ احد کا واقعہ پیش آیا ، جس میں مسلمانوں کو ایک گونہ ہزیمت سے دو چار ہونا پڑا ، اور ستر صحابہ ﷺ جاں بحق ہوگئے ، قرآن نے تفصیل سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے ، قرآن میں اس شکست کے اسباب اور اثرات کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے ، اسی واقعہ کے پس منظر میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : { وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعاً وَلاَ تَفَرَّقُوا } (آل عمران : ۱۰۳) یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور ٹکڑیوں میں بٹنے سے بچو ، اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع سے بھی ارشاد فرمایا کہ آپس میں جھگڑو نہیں ؛ کہ آپسی نزاع تمہارے لئے ناکامی اور نقصان کا

پیش خیمہ بنے گا اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی: {وَ لاَ تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ}

(الانفال:۴٦)

اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت مسلمانوں کی بے وزنی، بحیثیت قوم کے ان کی بے وقعتی اور ہوا خیزی کا اصل سبب یہی آپسی نزاع واختلاف اور بکھراؤ ہے، اتحاد واتفاق اور اجتماعیت یوں تو ہمیشہ اور ہر حال میں ضروری ہے؛ لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے آج کے سیاسی پس منظر میں یہ اتنی بڑی ضرورت ہے کہ شاید ہی کبھی اس قدر ضروری رہا ہو، فرقہ پرستی کی گھنگھور گھٹائیں بڑھ رہی ہیں، ملک کے اُفق پر زعفرانی شفق چھایا چاہتا ہے، شمال وجنوب اور مشرق ومغرب کا کوئی فرق نہیں، پڑھے لکھے لوگوں، دانشوروں اور جاہل عوام سب پر فرقہ پرستی کا نشہ سا چھاتا جارہا ہے اور اس آتش فشاں سے جو لاوا اُبلنے والا ہے، یقینا مسلمان ہی اس کا نشانہ ہیں، اور ہماری صفوں میں اتحاد ویکجہتی اور اشتراک وتعاون کے سوا کوئی اور ہتھیار نہیں، جس کے ذریعہ اس فتنہ کا مقابلہ کیا جاسکے، اور اس ملک کے امن وامان کی حفاظت ہوسکے، یہ سیلاب اتنا ہلاکت خیز ہے کہ اگر مسلمان اس کو روکنے میں کامیاب نہ ہوئے تو یہ نہ صرف مسلمانوں کے جان ومال کو؛ بلکہ ان کی تہذیب وثقافت اور مذہبی وجود کو بھی، —— خدانخواستہ اور ہزار بار خدانخواستہ —— بہالے جائے گا۔

اسلام میں اتحادِ امت کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج اظہار نہیں، امت کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے بعض ایسی چیزوں کی بھی اجازت دی ہے، جو عام حالات میں گناہ؛ بلکہ گناہ کبیرہ ہے، جھوٹ بدترین گناہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی کس قدر مذمت فرمائی ہے؟ لیکن دو مسلمانوں میں اختلاف کو دور کرنے اور شکستہ دِلوں کو ملانے کی غرض سے آپ ﷺ نے جھوٹ بولنے کی بھی اجازت دی، جب دو اشخاص وافراد کا اتحاد اتنا اہم ہے تو مسلمانوں کے دو گروہوں، جماعتوں اور تنظیموں کے اختلاف کو دور کرنا اور ان کو ایک صف میں کھڑا کرنا کتنا اہم عمل ہوگا؛ کہ اس کے لئے تو شاید سو جھوٹ بھی جائز ہو، اسی طرح بُرائی سے روکنا اور بُرائی کے خلاف آواز اٹھانا مسلمانوں کا مذہبی اور ملی فریضہ ہے؛ لیکن جہاں ''نہی عن المنکر'' فساد واختلاف کا باعث بن جائے اور اندیشہ ہو کہ اس سے ملت کا شیرازہ بکھر جائے گا تو ایسے موقع پر آپ ﷺ نے وقتی طور

پر بُرائی کو انگیز کر لینے اور تحمل برتنے کا حکم دیا، آپ ﷺ نے ایک بار حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

''ایک وقت آئے گا کہ تم پر ایسے امراء مسلط ہوجائیں گے، جو تم سے اپنا حق وصول کریں گے اور اپنی عیش کوشیوں میں خرچ کریں گے، ایسے موقعہ پر تم کیا کروگے؟ —— حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں ان کو نوکِ شمشیر سے سیدھا کردوں گا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرنا؛ بلکہ اس وقت کا انتظار کرنا جب تم بھی اللہ سے آملو اور یہ امراء بھی''

(سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر : ۳۹۵۸، مسند احمد، حدیث نمبر : ۲۱۳۲۹)

منشاءِ نبوی یہ تھا کہ منکر اور بُرائی کو روکنے میں ایسے تشدد سے کام نہ لیا جائے جو امت میں تفریق اور انتشار کا باعث بن جائے؛ بلکہ ایسے موقع پر صبر وتحمل اور بردباری کا راستہ اختیار کیا جائے اور ان کے عمل کو اللہ کے سپرد کردیا جائے کہ وہی احکم الحاکمین ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ امام مقتدیوں کی نماز کا ضامن ہے؛ اسی لئے امام کی نماز فاسد ہوجائے تو مقتدی کی نماز آپ سے آپ فاسد ہوجاتی ہے، ارشاد ہے: ''**الإمام ضامن**'' (سنن ابی داؤد، **کتاب الصلاۃ، باب ما یجب علی المؤذن من تعاھد الوقت**، حدیث نمبر : ۵۱۷، جامع ترمذی، حدیث نمبر : ۲۰۷، ابن ماجہ، حدیث نمبر : ۹۸۱) اس لئے امام کو بہتر سے بہتر اوصاف کا حامل ہونا چاہئے، وہ صاحبِ علم ہو، عمدہ قرآن پڑھتا ہو، ورع وتقوی کا حامل ہو؛ لیکن اگر کوئی خراب شخص ہی امام بن جائے اور اس کو ہٹانے میں فتنہ وانتشار کا اندیشہ ہو تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسے شخص کے پیچھے بھی نماز پڑھی جائے: ''**صلوا خلف کل بر و فاجر**'' (**سنن الدار قطنی، کتاب العیدین، باب صفۃ من تجوز الصلاۃ معہ والصلاۃ علیہ**، حدیث نمبر : ۱۰، **سنن البیھقی**، حدیث نمبر : ٦٦٢٣)؛ گویا امام کا نسبتاً کم بہتر ہونا امت کے اختلاف وانتشار اور نزاع وافتراق سے کمتر ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امت کی وحدت اور اجتماعیت کو برقرار رکھنا کس قدر اہم اور ضروری ہے۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ ایک تو ہم چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے ہیں اور باہم دست و

گریباں ہیں، دوسرے مسلمانوں میں پڑھے لکھے سمجھدار اور باشعور لوگ اس بات کی کوشش بھی نہیں کرتے کہ وہ مسلمانوں کے ایسے اختلاف کو دُور کرنے اوران کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کریں؛ حالاں کہ مسلمانوں کے درمیان صلح کرانا اوران کی باہمی کدورتوں کو دور کرنے کی سعی کرنا بھی امت کے اجتماعی فرائض میں سے ایک ہے، رسول اللہ ﷺ کے نزدیک نماز میں جماعت کی کس قدر اہمیت تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے مرض وفات میں بھی جب بالکل مجبور ہو گئے، تب ہی آپ ﷺ کی جماعت فوت ہوئی؛ (بیہقی، حدیث نمبر: ۴۸۵۹) لیکن قبیلہ عمرو بن عوف کے مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کے لئے آپ ﷺ کو مسجد تشریف آوری میں تاخیر ہوگئی، تاخیر کے باعث حضرت ابوبکر ؓ کو امام بنایا گیا، بعد میں آپ ﷺ شریک جماعت ہوئے۔ (بخاری، عن سہل بن سعد الساعدی) غرض، یہ نہایت اہم اور مبارک کام ہے، جس کی طرف مسلمانوں کے ارباب حل وعقد کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

امت کا اتحاد انضمام کے ذریعہ ممکن نہیں، یعنی کسی گروہ، مکتبۂ فکر، تنظیم، جماعت اور ادارہ کو یہ کہا جائے کہ وہ اپنے وجود کو گم کر کے دوسروں کے ساتھ ضم ہو جائے تو یہ ایک ناقابل عمل بات ہوگی؛ البتہ اتحاد ''اشتراک'' کے ذریعہ وجود میں آسکتا ہے کہ امت کے مشترکہ مسائل کے لئے ایک ساتھ مل بیٹھیں، پھر جن نکات پر اتفاق نہ ہو، ان میں اپنے اپنے طور پر کام کیا جائے؛ لیکن ایک دوسرے کے احترام اور ایک دوسرے کی خدمات کے اعتراف کے ساتھ، اس کے بغیر اتحاد ممکن نہیں، قرآن مجید نے تو غیر مسلموں کے ساتھ بھی مشترکہ ایجنڈے پر ساتھ مل کر کام کرنے کا حکم دیا ہے، اور مسلمانوں کے لئے تو اشتراک واتفاق کی اتنی بنیادیں ہیں کہ شاید ہی کسی اور قوم کے پاس ہو، اس کے باوجود کیا ہم ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھ کر اپنے مسائل کو حل نہیں کر سکتے ہیں؟ ابھی ماضیٔ قریب میں بہت ہی افسوس ناک واقعہ پیش آیا کہ راجستھان، جہاں فرقہ پرستوں کا اقتدار قائم ہے، وہاں بھی مسلمانوں کی دو گروہوں کے درمیان ایسا تصادم ہوا کہ کئی لوگ زخمی ہو گئے اور پولیس کو مداخلت کرنی پڑی، گویا ایک ظالم حکومت اوراس کا ظلم وجبر بھی ہمیں متحد کرنے سے قاصر ہے۔

ہندوستان کا سیاسی نقشہ اس وقت کس تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے، وہ کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے، ایسے لوگ جن کا ایک ساتھ بیٹھنا سال دو سال پہلے ناممکن سمجھا جاتا تھا اور ایسی

جماعتیں جن کے اشتراک کا چند ہفتوں پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، وہ آج ایک دوسرے سے بغل گیر اور سیاست کی بساط پر ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر کھڑی ہوئی ہیں، پھر مسلمان جن میں اتحاد کی کتنی ہی بنیادیں موجود ہیں، کیا وہ اپنے اختلافات کو بھلا کر ایک ساتھ نہیں بیٹھ سکتے؟ مصیبت اور پریشانی شیر اور بکری اور سانپ اور نیولے کو بھی ایک جگہ جمع کر دیتی ہے، لیکن کیا ہم اس قدر بے حس، بے شعور اور شخصی مفادات کے حریص اور لالچی ہیں کہ سیلابِ بلا اور طوفانِ بے درماں بھی ہم کو متحد نہیں کر سکتا؟ شاید علامہ اقبالؔ کی روح ہم پر نوحہ کناں ہو، اور استفسار کر رہی ہو کہ:

منفعت ایک ہے اس قوم کی ، نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی ، دین بھی ، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی ، اللہ بھی ، قرآن بھی ایک
کیا بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک ؟
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں ؟

۲۹/فروری ۲۰۰۸ء

عدل اور اعتدال —— اسلام کا بنیادی مزاج

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جتنی چیزیں پیدا فرمائی ہیں، عام طور پر ان میں افراط وتفریط انسان کے لئے ناگوار خاطر اور دشوار ہوتی ہے، یہاں تک کہ انسان کے لئے مفید ترین چیزیں بھی اگر حدِ اعتدال سے بڑھ جائیں یا حدِ ضرورت سے کم ہوجائیں تو انسان کے لئے رحمت کے بجائے زحمت اور انعام خداوندی کے بجائے عذاب آسمانی بن جاتی ہیں، ہَوا انسان کے لئے کتنی بڑی ضرورت ہے؟ لیکن جب آندھیاں چلتی ہیں تو یہی حیات بخش ہوا کتنی ہی انسانی آبادیوں کو تاخت وتاراج کرکے رکھ دیتی ہیں، پانی زندگی وحیات کا سرچشمہ ہے؛ لیکن جب دریاؤں کی متلاطم موجیں اپنے دائرہ سے باہر آجاتی ہیں تو کس طرح سبزہ زار کھیتوں اور شاد وآباد بستیوں کو خس وخاشاک کی طرح بہالے جاتی ہیں، قدرت کی اکثر نعمتوں کا یہی حال ہے؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا نظام اعتدال پر رکھا ہے، مثلاً ایک زمین کے نظام کشش ہی کو لے لیجئے، زمین میں جو قوت کشش اس وقت موجود ہے، اگر اس سے بڑھ جائے تو سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انسان کا قد وقامت بلی اور چوہے کی طرح ہوجائے، اور کم ہوجائے تو انسان اُونچے درختوں بلکہ تاڑ کے درختوں کے ہم قامت ہوجائے، غور کیجئے کہ اگر انسان کا قد اتنا چھوٹا یا اتنا بڑا ہوجائے تو یہ کتنی پریشان کن بات ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے سورج اور زمین کے درمیان ایک متوازن فاصلہ رکھا ہے، یہ فاصلہ بڑھ جائے تو زمین برف سے ڈھک جائے گی، اور گھٹ جائے تو زمین میں ناقابل برداشت گرمی ہوگی، قدرت کا پورا نظام اعتدال پر قائم ہے، اور ترازو رب کائنات نے خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے؛ اسی لئے قرآن نے اللہ تعالیٰ کو ''رب العالمین'' قرار دیا ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے نظام کو اعتدال پر قائم فرمایا ہے، اسی طرح اللہ اپنے بندوں سے بھی اعتدال چاہتے ہیں اور افراط وتفریط کو ناپسند فرماتے ہیں، قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ

تمہیں عدل کا حکم دیتے ہیں: {إِنَّ اللہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ} (النحل: ۹۰) عدل کی روح اعتدال ہے اور جادۂ اعتدال سے ہٹ جانا ہی انسان کو ظلم کی طرف لے جاتا ہے، اعتدال زندگی کے کسی ایک شعبہ سے متعلق نہیں؛ بلکہ یہ زندگی کے ہر مرحلہ میں مطلوب ہے، قرآن وحدیث پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ گفتار ورفتار، خوشی وغم، سلوک وبرتاؤ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت ہر شعبۂ زندگی میں افراط و تفریط ناپسندیدہ ہے اور اعتدال مطلوب ومحبوب ہے۔

اگر انسان چل رہا ہو تو اس کی رفتار معتدل ہونی چاہئے، اور اس میں اترانے کا انداز نہیں ہونا چاہئے، یہ چال کا اعتدال ہے، قرآن کہتا ہے کہ تم زمین پر اِترا کر نہ چلو، کہ تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو، اور نہ پہاڑ کی بلندیوں کو چھو سکتے ہو:

{وَلاَ تَمْشِ فِیْ الأَرْضِ مَرَحاً إِنَّکَ لَن تَخْرِقَ الأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولاً} (الاسراء : ۳۷)

بول چال میں اعتدال چاہئے، نہ ایسی پست آواز ہو کہ مخاطب سن بھی نہ سکے، نہ اتنی بلند ہو کہ حدِ اعتدال سے گزر جائے، قرآن کہتا ہے کہ آواز حسبِ ضرورت پست ہونی چاہئے، گدھے کی آواز بہت بلند ہوتی ہے؛ لیکن سب سے ناپسندیدہ:

{وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ وَاغْضُضْ مِن صَوْتِکَ إِنَّ أَنکَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ} (لقمان : ۱۹)

لباس و پوشاک میں رسول اللہ ﷺ نے ایسے لباس کو پسند نہیں فرمایا، جس کے پیچھے جذبۂ تفاخر کارفرما ہو، آپ ﷺ خود سادہ لباس استعمال فرماتے اور آپ ﷺ نے سادہ لباس استعمال کرنے کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی؛ لیکن یہ بھی مقصود نہیں کہ آدمی ایسے پھٹے کپڑے پہنے جو اس کے مصنوعی فقر کا مظہر ہو، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو نعمت سے سرفراز فرمائے، تو اس پر اس نعمت کا اثر نظر آنا چاہئے، غرض کہ نہ افراط ہو اور نہ تفریط، ایک طرف آپ ﷺ نے ڈاڑھی رکھنے کا بہ تاکید حکم فرمایا، (ترمذی، حدیث نمبر: ۲۷۶۳) دوسری طرف حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ چہرے کی چوڑائی اور لمبائی والے حصہ سے آپ ﷺ کچھ ڈاڑھی تراشا بھی کرتے تھے۔

(ترمذی، حدیث نمبر: ۲۷۶۲)

دعاء کے بارے میں فرمایا کہ آواز بہت بلند نہ ہو؛ بلکہ ایک حد تک پست ہو، بہت بلند آواز میں دعاء کرنے کو زیادتی قرار دیا گیا: {اُدْعُواْ رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَخُفْيَةً إِنَّهُ لاَ يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ} (الاعراف: ۵۵) بالغ لڑکی کو خود اپنے نکاح کا حق دیا گیا، ارشاد ہے کہ بے شوہر خاتون بہ مقابلہ ولی کے خود اپنی ذات کی زیادہ حق دار ہے؛ (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۰۹۸) لیکن چوں کہ ولی کی شرکت کے بغیر عورت کی ناتجربہ کاری اسے نقصان پہنچا سکتی ہے؛ اس لئے یہ بھی فرمادیا گیا کہ ولی کی شرکت کے بغیر نکاح کا انعقاد بہتر نہیں: ''لا نکاح إلا بولی''۔

(ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۰۸۵)

اگر کوئی شخص ظلماً قتل کیا گیا ہو تو حکم فرمایا گیا کہ مقتول کا ولی قاتل سے انتقام لے سکتا ہے؛ لیکن ضروری ہے کہ یہ بھی قانون اور اُصول کے دائرہ میں ہو اور قتل میں حدود سے تجاوز نہ ہو:

{وَمَن قُتِلَ مَظْلُوماً فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَاناً فَلاَ يُسْرِف فِّي الْقَتْلِ}

(الاسراء : ۳۳)

انفاق اسلام میں کس قدر مطلوب اور پسندیدہ عمل ہے؟ لیکن قرآن نے یہاں بھی اعتدال پر قائم رہنے کا حکم دیا، اور فرمایا کہ نہ اپنے ہاتھ بالکل باندھ لو، اور نہ اتنا خرچ کرو کہ خود تمہارے لئے حسرت اور لوگوں کی ملامت کا سبب بن جائے:

{وَلاَ تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَى عُنُقِكَ وَلاَ تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوماً مَّحْسُوراً} (الاسراء: ۲۹)

ایک صحابی رضی اللہ عنہ اپنی پوری جائیداد اللہ کے لئے وقف کرنا چاہتے تھے، تو آپ ﷺ نے اعتدال کا حکم دیا اور غلو کو منع فرمایا، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ مسلسل روزے رکھتے اور رات بھر نماز پڑھتے رہتے تھے، آپ ﷺ کو علم ہوا تو ناپسندیدگی ظاہر کی اور فرمایا: کبھی روزے رکھو اور کبھی نہ رکھو، نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی، کیوں کہ تم پر تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہاری جان کا بھی اور تمہاری بیوی کا بھی۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۱۹۷۷) اسی طرح کی بات آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ سے بھی ارشاد فرمائی۔ (دیکھئے: ابوداؤد، حدیث نمبر: ۱۳۶۹) اگر کسی شخص کو روزہ رکھنے کی طرف بڑی رغبت ہو تو اسے ''صوم داؤدی'' رکھنے کا حکم دیا گیا، یعنی حضرت داؤد علیہ السلام کے طریقہ پر عمل کرنے کا

حکم ہوا، حضرت داؤد علیہ السلام کا عمل یہ تھا کہ ایک دین روزہ رکھتے اور اگلے دن نہیں رکھتے، آپ ﷺ نے اس کو روزہ رکھنے کا سب سے معتدل طریقہ قرار دیا: ''وھو اعدل الصیام وھو صیام داؤد'' (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۲۴۲۷)

حلال وحرام میں بھی اللہ تعالی نے اعتدال کا حکم فرمایا: جہاں اس بات کو منع کیا گیا کہ آدمی حرام کو اپنے لئے حلال کرلے، وہیں یہ بھی حکم فرمایا گیا کہ جن چیزوں کو اللہ تعالی نے حلال کیا ہو، دین میں غلو کا راستہ اختیار کرتے ہوئے اس حلال کو بھی حرام نہ کرلیا جائے: {يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لاَ تُحَرِّمُوْا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللهُ لَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُوْا} (المائدہ: ۸۷) جہاد میں دین و ایمان اور نفس وجان کا علانیہ دشمن سامنے ہوتا ہے؛ لیکن اس موقع پر بھی راہ اعتدال کی رہنمائی کی گئی کہ جو تم سے برسر جنگ ہو، تمہاری جنگ ان ہی لوگوں تک محدود ہونی چاہئے اور اس سے آگے تجاوز نہیں کرنا چاہئے: {وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُوْا} (البقرۃ: ۱۹۰) انسان جوش انتقام میں جادۂ انصاف سے ہٹ جاتا ہے اور حدِ اعتدال سے گزرجاتا ہے، اس لئے فرمایا گیا کہ اگر کسی نے تم پر ظلم کیا ہو تو تمہارے لئے اس کے ظلم کے بقدر ہی اقدام کی گنجائش ہے، جواب میں تمہارے لئے انصاف کے دائرہ سے آگے بڑھ جانا درست نہیں: {فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ} (البقرۃ: ۱۹۴)

جب نفرت کا ماحول پیدا ہوتا ہے اور کسی گروہ کی طرف سے زیادتی کا واقعہ پیش آتا ہے، تو فطری طور پر غضب کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور یہ آگ انصاف کے تقاضوں کو سوکھے پتوں کی طرح جلا کر رکھ دیتی ہے، قرآن نے خاص طور پر تاکید کی کہ گو اعداء اسلام نے تمہیں مسجد حرام سے روک رکھا ہے؛ لیکن ان کی یہ برائی بھی تمہیں انصاف کا دامن چھوڑ دینے اور انتقام کی نفسیات سے مغلوب ہو کر تمہارے آمادۂ ظلم ہوجانے کا باعث نہ بنے، (المائدہ: ۲) —— تنقید اور احترام میں بھی میانہ روی مطلوب ہے، یہ جائز نہیں کہ کسی کی فکر پر تنقید کرتے ہوئے اس کی ذاتیات کو بھی نشانہ بنایا جائے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی ایسا نہیں کیا اور اس بات سے بھی منع کیا گیا کہ احترام میں غلو کی صورت پیدا ہوجائے، اسی لئے غیر اللہ کو سجدہ کرنے اور کسی کے

سامنے اپنے آپ کو جھکانے سے منع کیا گیا۔

عام طور پر دو چیزیں انسان کو ''راہِ اعتدال'' سے منحرف کردیتی ہیں، محبت اور عداوت، محبت انسان سے بصیرت ہی نہیں، بصارت بھی چھین لیتی ہے اور اسے اپنے محبوب کی برائیوں میں بھی بھلائیاں نظر آتی ہیں، یہی حال نفرت وعداوت کا ہے، دشمن میں رائی جیسی برائی ہوتو وہ پہاڑ محسوس ہوتی ہے اور پہاڑ جیسی خوبی ہوتو وہ رائی سے بھی حقیر نظر آتی ہے، اسلام سے پہلے جو قومیں گمراہ ہوئیں، ان کی گمراہی کا باعث یہی ہوا، غلو آمیز محبت یا انکار ونفرت، اسلام نے اسے اس میں بھی اعتدال کا حکم دیا ہے، دشمن بھی ہوتو اس کی غیبت اور بہتان تراشی سے منع فرمایا گیا، دوست اور مرکز عقیدت ہو تب بھی اس کی تعریف میں غلو، مبالغہ اور تملق وخوشامد کو ناپسند کیا گیا، قرآن مجید کہتا ہے کہ کسی سے عداوت ہو، تو اس کو بھی حدِ اعتدال سے باہر نہ جانے دے، ممکن ہے کہ کل ہوکر اللہ تعالیٰ تمہارے اور اس کے درمیان محبت پیدا فرمادے: {عَسَى اللّٰهُ أَن يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُم مِّنْهُم مَّوَدَّةً} (الممتحنہ:۷) رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشاد کے ذریعہ اسے مزید واضح فرمایا، حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

> ''اپنے دوست سے حدِ اعتدال میں رہتے ہوئے دوستی کرو، بعید نہیں کہ کسی دن وہی تمہارا دشمن بن جائے اور اپنے دشمن سے بھی بغض میں اعتدال رکھو، کیا عجب کہ کسی دن تمہارا دوست بن جائے''
>
> (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۹۹۸)

غرض کہ دوستی اور دشمنی میں بھی اعتدال ہو۔

جو قوم دنیا کے لئے عدل اور اعتدال کی امانت لے کر آئی تھی اور جس سے دنیا کی قوموں نے میانہ روی کا سبق سیکھ کر تہذیب وثقافت کی منزلیں طے کیں اور شہرت وناموری کے بامِ کمال تک پہنچیں، آج وہی امت افراط وتفریط، بے اعتدالی اور غلو کا عنوان بن گئی ہے، زندگی کا کون سا شعبہ ہے، جس میں ہم نے بے اعتدالی کو اختیار نہیں کیا ہے، تعمیری کاموں میں ہمارا بخل اور بے فائدہ کاموں میں ہماری فضول خرچی دونوں کی مثال نہیں ملتی، احترام وعقیدت میں ذرہ کو آفتاب بنانا اور اختلاف وعداوت میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو وجہ انتشار بنانا ہمارا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے،

ہمارا ایک گروہ حکومتِ وقت کے اشارہ پر آگ کو پانی کہنے میں بھی نہیں شرماتا، اور ہمارا ایک طبقہ چنگاری جیسے واقعہ پر خود شعلہ بن جاتا ہے، لوگوں کے ساتھ سلوک کے معاملہ میں ہماری بے اعتدالی دن رات کا مشاہدہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ افراط وتفریط آخرت میں اللہ کی پکڑ اور دنیا میں قوموں کی رسوائی کا سامان ہے اور اعتدال ومیانہ روی آخرت میں سرخروئی اور دنیا میں کامیابی کی کلید!!

۷/ مارچ ۲۰۰۸ء

باہمی اختلافات کا حل

اللہ تعالیٰ نے جیسے رنگ وروپ، قد وقامت، صحت وقوت اورآواز وغیرہ میں انسانوں کے درمیان اختلاف اور تفاوت رکھا ہے، اسی طرح مزاج اور سوچ میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے — دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر انسان اپنی تمام خواہشات کو پوری نہیں کرسکتا، انسان اپنے جسم کے اعتبار سے تو ایک چھوٹا موٹا جاندار وجود ہے؛ لیکن اس کی خواہشات کا دائرہ بے حد وسیع ہے، اگر اس جیسی ایک ہزار دنیائیں بنادی جائیں اور انہیں انسانوں کے حوالہ کردیا جائے، تب بھی اس کی خواہشات پوری نہیں ہوسکیں گی، اس لئے چاہتوں اور خواہشوں میں تصادم پیدا ہونا ایک فطری بات ہے، مزاج اور سوچ کا یہ فرق واختلاف اور خواہشات کے سلسلہ میں ایک دوسرے کی مزاحمت کا جذبہ یہ وہ چیزیں ہیں، جن سے بہت سی دفعہ باہمی اختلاف اور کبھی کبھی اختلاف سے آگے بڑھ کر نزاع کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔

قرآن مجید کی بنیادی تعلیم اس سلسلہ میں یہ ہے کہ جن معاملات میں اختلاف اور جھگڑا پیدا ہوجائے، ان کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دیا جائے: {فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ} (النساء: ۵۹) — اللہ اور رسول کی طرف مسائل لوٹانے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن و حدیث کو بنیاد بنا کر مسائل طئے کئے جائیں؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے بعد تم بہت سارا اختلاف دیکھو گے، ایسے موقع کے لئے میں دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں، ایک اللہ کی کتاب، دوسرے میری سنت: ''ترکت فیکم أمرین: لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ وسنۃ نبیہ'' (المؤطأ للإمام مالک، کتاب القدر، باب النھی عن القول في القدر، حدیث نمبر: ۱۵۹۴) قرآن وحدیث میں بعض احکام تو نہایت واضح طور پر بیان کردئے گئے ہیں کہ ان میں کسی دوسرے مفہوم کا احتمال نہیں ہے اور بعض احکام وہ ہیں، جنہیں اجمال وابہام کے ساتھ بیان کیا گیا

ہے، تا کہ ہر عہد میں اس عہد کے ذرائع و وسائل کے اعتبار سے ان کی مراد متعین ہو سکے؛ کیوں کہ قرآن مجید قیامت تک کے لئے ہے اور جو کتاب ہمیشہ رہنمائی کے لئے بھیجی گئی ہو، اس کا اسلوب یہی ہونا چاہئے۔

ایسے مسائل میں ایک سے زیادہ رائے ہوسکتی ہے، مثلاً: رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں چار قسم کے فتنے اٹھے، ایک گروہ نے اپنے سابق مشرکانہ مذہب کی طرف لوٹنے کا اعلان کیا، دوسرا گروہ وہ تھا، جو جھوٹے مدعیان نبوت پر ایمان لے آیا اور حضور ﷺ پر ختم نبوت کا منکر ہو گیا، یہ دونوں تو صریحاً مرتد تھے؛ اس لئے صحابہ اس پر متفق تھے کہ ان کے خلاف جہاد ہونا چاہئے — تیسرے گروہ نے زکوۃ کے فرض ہونے سے انکار کیا اور بے جا تاویل یہ کی کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں سے زکوۃ وصول کرتے تھے اور انہیں دعائیں دیتے تھے، اب چوں کہ حضور ﷺ کی وفات ہوگئی؛ اس لئے زکوۃ بھی واجب نہیں رہی، چوتھے وہ لوگ تھے، جن کا خیال تھا کہ زکوۃ ادا کرنا فرض تو ہے؛ لیکن اب بیت المال میں جمع کرنا ضروری نہیں رہا، ہم اپنے طور پر زکوۃ ادا کرلیں گے، یہ گروہ منکرین زکوۃ اور مانعین زکوۃ کا تھا۔

ان کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان اس وقت کے حالات کے لحاظ سے کسی قدر اختلاف رائے پیدا ہوا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان لوگوں سے بھی جہاد کے حق میں تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم مصلحت کا تقاضہ سمجھتے تھے کہ ایک ہی دفعہ سب سے جنگ نہ چھیڑی جائے اور فی الحال اصل مرتدین سے جہاد کرتے ہوئے ان کے معاملہ کو ملتوی رکھا جائے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے قرآن مجید کے ارشاد سے قریب تھی؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت تک جہاد کا حکم دیا ہے، جب تک لوگ کلمۂ شہادت، اقامت صلاۃ اور ادائے زکوۃ کے قائل نہ ہو جائیں، یعنی ان تینوں باتوں کو ایک ہی حکم میں رکھا گیا ہے، یہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا استدلال تھا کہ ہم نماز اور زکوۃ میں فرق کو قبول نہیں کرسکتے، (صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب وجوب الزکاۃ، حدیث نمبر: ١٣٣٥، صحیح ابن حبان، عن ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ، کتاب الإیمان، باب فرض الإیمان، حدیث نمبر: ٢١٦) ایک شخص نماز کے فرض ہونے اور اسے جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا قائل تو ہو؛ لیکن زکوۃ کے فرض ہونے یا اسے اجتماعی طور پر ادا کرنے کا قائل نہیں ہو، یہ بات قابل قبول نہیں ہوسکتی،

—— غور کیا جائے تو حضرت ابوبکر ؓ کا نقطۂ نظر مصلحت سے بھی قریب تر تھا؛ کیوں کہ اگر ایک دفعہ دین کے کسی شعبہ میں انکار کو قبول کرلیا جاتا تو آئندہ شریعت کے مختلف احکام کے انکار کا راستہ کھل جاتا؛ اس لئے پہلے ہی مرحلہ میں اس فتنہ کا استیصال کر دینا ضروری تھا؛ چنانچہ حضرت ابوبکر ؓ کی رائے پر دوسرے صحابہ ؓ کو بھی انشراح ہوگیا، —— یہ یقیناً ایسا مسئلہ تھا جس میں ایک سے زیادہ رائے کی گنجائش تھی، ایسے مسائل میں اختلاف کو حل کرنے کے لئے مزید کد و کاوش کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسی طرح بعض دفعہ کوئی فریق قرآن و حدیث کی اپنی خواہش کے مطابق تشریح کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ اپنے غلط رویہ کے لئے کتاب و سنت کو ڈھال بناتا ہے، اسی کو ''تفسیر بالرأی'' کہا گیا ہے، یعنی اللہ کی مرضی کو پانے کے لئے قرآن کی تشریح نہ کی جائے؛ بلکہ اپنی خواہشات کا جواز پیدا کرنے کے لئے قرآن مجید کے معانی میں کھینچ تان سے کام لیا جائے، سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت امیر معاویہ ؓ کے درمیان ایک مرحلہ میں اس طرح صلح ہوئی کہ دونوں نے دو صحابہ رضی اللہ عنہما کو حَکَم مان لیا؛ تاکہ مسلمانوں کی خوں ریزی سے بچا جاسکے، خوارج نامی ایک گروہ نے اسی کو بنیاد بنا کر دونوں کی مخالفت شروع کردی، اور چوں کہ ان کی بڑی تعداد سیدنا حضرت ؓ کے حلقۂ امارت میں تھی؛ اس لئے حضرت علی ؓ کو اس سے زیادہ سابقہ پیش آیا اور ان ہی کے ہاتھوں آپ ؓ کی شہادت بھی ہوئی، خوارج کہتے تھے کہ کسی انسان کو حَکَم بنانا قرآن مجید کے اس حکم کے خلاف ہے کہ فیصلہ کرنے کا حق تو اللہ ہی کو ہے: {إِنِ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلّهِ} (الأنعام: ۵۷) —— یہ محض بے جا اور من چاہی تشریح تھی، {إِنِ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلّهِ} کا منشأ یہ ہے کہ شریعت کو وضع کرنا اور دستورِ زندگی بنانا اللہ کا حق ہے؛ لیکن کسی خاص واقعہ میں نزاع پیدا ہوجائے تو اس کو دور کرنے کے لئے کسی شخص کو حَکَم بنانا اس کے مغائر نہیں؛ کیوں کہ حَکَم اپنی مرضی سے فیصلہ نہیں کرتا، قرآن و حدیث کے منشأ کے مطابق مسائل کو طئے کرتا ہے؛ اسی لئے خود قرآن میں نزاعی مسائل کے لئے حَکَم بنانے کا ذکر موجود ہے۔ (النساء: ۳۵) مگر اسی من چاہی تشریح کا سہارا لے کر انہوں نے امت کے سوادِ اعظم کو کافر قرار دیدیا اور بڑے فتنے پیدا کئے۔

اس لئے اصولی بات تو یہی ہے کہ جب کوئی اختلاف پیدا ہو تو کتاب و سنت کی طرف

رجوع کیا جائے ؛لیکن جب کسی معاملہ میں صریح حکم موجود نہ ہو اور غور وفکر اور واقعہ کی تحقیق کی ضرورت ہوتو اس کے لئے مختلف انتظامی تدبیریں کی جاسکتی ہیں اور ان تدبیروں کا ذکر بھی قرآن و حدیث میں ہی آیا ہے؛ اس لئے یہ اپنے اختلاف کو خدا اور رسول ہی کی طرف لوٹانا ہے، بنیادی طور پر ایسے حالات میں چار صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں:

پہلی صورت یہ ہے کہ فریقین کسی اور کو بیچ میں لائے بغیر آپس میں صلح کرلیں، صلح سے مراد اپنی پوری رائے پر اصرار کرنے کے بجائے اپنے موقف میں نرمی پیدا کرنا اور ''لواور دو'' کے طریقہ پر عمل کرنا ہے، اگر اس طرح کے معاہدہ سے شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہوتو یہ نہ صرف جائز؛ بلکہ بہتر ہے، خود اللہ تعالی نے اسے بہتر قرار دیا ہے: {وَالصُّلۡحُ خَيۡرٌ} (النساء: ١٢٨)—— رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اس کی واضح مثال صلح حدیبیہ ہے، صلح حدیبیہ میں مسلمانوں اور مکہ کے مشرکوں دونوں ہی نے اپنے موقف میں نرمی پیدا کی تھی، اہل مکہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو کعبۃ اللہ کے گرد عبادت کا کوئی حق ہی نہیں ہو؛ بلکہ وہ مکہ میں قدم بھی نہیں رکھیں؛ لیکن انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ مسلمان آئندہ عمرہ کے لئے آیا کریں گے، مسلمانوں کی خواہش تھی کہ وہ عمرہ کرکے ہی واپس ہوں، یہ زمانۂ جاہلیت کی روایت اور دستور کے لحاظ سے بھی ایک بجا خواہش تھی؛ کیوں کہ کعبہ کی زیارت سے کسی کو یہاں تک کہ اپنے دشمن کو بھی محروم نہیں کیا جاتا تھا؛ لیکن اہل مکہ کے اصرار پر انہوں نے اس سال واپس جانا اور آئندہ سال دوبارہ عمرہ کے لئے آنا قبول کرلیا، انہوں نے یہ شرط بھی قبول کرلی کہ اگر مکہ سے کوئی شخص مسلمان ہوکر مدینہ چلا جائے تو مسلمان اسے واپس کردیں اور مدینہ سے کوئی شخص مرتد ہوکر مکہ آجائے، تو اہل مکہ اسے واپس نہیں کریں گے، صلح کو ترجیح دیتے ہوئے مسلمانوں نے متعدد کڑوی شرطوں کو اس صلح کے لئے گوارہ کرلیا، (کتاب الصلح، باب کیف یکتب؟ إلخ، حدیث نمبر: ٢٦٩٩) اسی صلح کو اللہ تعالیٰ نے ''فتح مبین'' قرار دیا ہے، (الفتح: ١) اور بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ وقتی طور پر پیچھے ہٹ جانا ہی مسلمانوں کے لئے مستقبل کی کامیابیوں کا ذریعہ بنا۔

رسول اللہ ﷺ حجرۂ مبارکہ میں تھے، مسجد نبوی سے دو صحابہ کے درمیان اونچی ہوتی ہوئی آواز سنائی دی، آپ ﷺ مسجد میں تشریف لائے، حضرت ابوحدرد رضی اللہ عنہ سے حضرت کعب رضی اللہ عنہ اپنے

قرض کا مطالبہ کررہے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ان سے خواہش کی کہ وہ آدھا قرض معاف کردیں، وہ اس کے لئے تیار ہوگئے، پھر آپ ﷺ نے حضرت ابوحدرد رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ وہ بقیہ قرض کی ادائیگی میں تاخیر نہ کریں، یہ صلح کی ایک شکل تھی، جس کی آپ ﷺ نے اپنے دو رفقاء کو تلقین فرمائی، (صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ، باب التقاضی والملازمۃ فی المسجد، حدیث نمبر: ٤٥٧، کتاب الصلح، باب الصلح بالدین والعین، حدیث نمبر: ٢٧١٠) —— صلح ہی کی ایک صورت حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان پیش آئی ہے کہ فی الحال امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ قبول کرلیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوں؛ چنانچہ اس طرح یہ اختلاف دور ہوگیا، گو بنوامیہ کے بعض افراد نے اپنی خباثتوں کے تحت سازش کی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دے کر شہید کرادیا؛ تاکہ اقتدار بنوامیہ کے ہاتھ سے جانے نہ پائے؛ لیکن وقتی طور پر یہ صلح نزاع کو ٹالنے میں مفید ثابت ہوئی۔

بعض دفعہ ازدواجی زندگی کے جھگڑوں میں بھی رسول اللہ ﷺ نے صلح کا مشورہ دیا ہے، حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت جمیلہ رضی اللہ عنہا اپنے شوہر سے علاحدگی چاہتی تھیں؛ حالاں کہ ان کے شوہر کی طرف سے کوئی زیادتی نہیں ہوئی تھی؛ لیکن حضرت جمیلہ رضی اللہ عنہا کی ان کی طرف رغبت نہیں تھی، رسول اللہ ﷺ نے حضرت جمیلہ رضی اللہ عنہا کو مشورہ دیا کہ وہ ثابت رضی اللہ عنہ کی طرف سے بطور مہر ملنے والا باغ واپس کردیں اور حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ وہ طلاق دے دیں۔

(صحیح البخاری، کتاب الطلاق، باب الخلع وکیفیۃ الطلاق فیہ، حدیث نمبر: ٥٢٧٣)

ان شواہد سے معلوم ہوا کہ چاہے ازدواجی زندگی کا مسئلہ ہو، مالی معاملات میں نزاع ہوگئی ہو، مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوا ہو یا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان نزاع کی شکل ہو ہر صورت میں صلح جھگڑے کو ختم کرنے کا ایک مناسب طریقہ ہے؛ کیوں کہ صلح میں نہ کسی کی جیت ہوتی ہے اور نہ ہار، یہ اختلاف سے باہر نکلنے کا ایک باعزت اور آبرومندانہ طریقہ ہے۔

اگر فریقین محسوس کریں کہ وہ آپس میں اختلاف کو دور نہیں کرسکیں گے یا سماج کے

سر برآوردہ حضرات کو اس کا اندازہ ہوجائے تو اب دوسرا طریقہ - جس کی قرآن و حدیث میں رہنمائی کی گئی ہے - ''تحکیم'' ہے، یعنی دونوں فریق ایک شخص یا چند اشخاص کو اس بات کا مجاز تسلیم کرلیں کہ وہ ان کی نزاع کا فیصلہ کردیں، قرآن مجید نے کوحَکَم بنانے کا ذکر میاں بیوی کے اختلاف کے پس منظر میں کیا ہے؛ کیوں کہ اس کی نوبت زیادہ آتی رہتی ہے؛ لیکن اصل مقصد نزاع کو دور کرنا ہے، اس لحاظ سے یہ حکم عمومی نوعیت کا ہے، دو افراد کے جھگڑے میں بھی حَکَم کے ذریعہ معاملہ طئے کیا جاسکتا ہے اور مسلمانوں کے دو گروہوں کا جھگڑا بھی حَکَم کے ذریعہ طئے پاسکتا ہے، جس کی مثال سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا حَکَم مقرر کیا جانا ہے، اسی طرح مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان بھی حَکَم کے ذریعہ مسئلہ حل کیا جاسکتا ہے، چنانچہ غزوۂ بنو قریظہ کے موقع سے مسلمانوں اور یہودیوں کے اتفاق رائے سے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو حَکَم مقرر کیا گیا اور جو کچھ انہوں نے فیصلہ فرمایا، اس پر مسلمانوں نے بھی عمل کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر دو افراد، ایک ہی جماعت اور تنظیم سے تعلق رکھنے والے دو گروہوں، دو الگ الگ جماعتوں یا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی مسئلہ محض باہمی گفت و شنید کے ذریعہ حل نہیں ہو پائے، تو حَکَم کے ذریعہ حل کیا جاسکتا ہے، حَکَم کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرسکتا جو اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کو حلال کردے، یا حلال کو حرام کردے؛ لیکن ایسے مسائل جو انتظامی نوعیت کے ہیں یا جس میں دونوں جہتیں جائز و مباح ہوں، ان کے بارے میں فیصلے کرسکتا ہے، حَکَم کی اصل کوشش تو اتحاد اور ہم آہنگی کی ہونی چاہئے کہ دونوں فریق کے درمیان مل کر کام کرنے کی صورت پیدا ہوجائے اور قرآن نے کہا ہے کہ اگر حَکَم اس سلسلہ میں مخلص ہوں تو امید ہے کہ ان کی یہ کوشش کامیابی سے ہم کنار ہوگی اور اللہ تعالیٰ موافقت پیدا فرمادے گا؛ (النساء: ۳۵) لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو تو تفریق کا فیصلہ بھی ہوسکتا ہے، یعنی ایک فریق کو خدمت سے معزول اور معاملہ سے بے تعلق کردیا جائے، یا علاحدگی عمل میں لائی جائے؛ کیوں کہ بعض معالات میں ایک فریق کا مطالبہ اتنا ناواجبی اور اس کا اصرار اس درجہ بے جا ہوتا ہے کہ کوئی درمیانی راستہ اختیار کرنا اور کسی درجہ میں بھی اس کے مطالبات کو تسلیم کرنا ممکن نہیں ہوتا، ایسے حالات میں اس فیصلہ

کے سامنے سر جھکا دینا ایمان کی علامت ہے؛ کیوں کہ قرآن مجید نے اس کو ایمان کی لازمی شرط قرار دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے، یہاں تک کہ دل بھی اس کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے:

{فَلاَ وَرَبِّکَ لاَ یُؤْمِنُونَ حَتَّیَ یُحَکِّمُوکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لاَ یَجِدُواْ فِیْ أَنفُسِھِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُواْ تَسْلِیْما}

(النساء:٦٥)

جب قرآن وسنت کے حکم کے مطابق حَکَم مقرر کیا جائے اور وہ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے فیصلہ کرے، تو دراصل وہ اللہ اور اس کے رسول کا ہی فیصلہ ہے اور اس موقع پر وہی رویہ اختیار کرنا واجب ہے، جو رویہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ کے معاملہ میں اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

البتہ یہ ضروری ہے کہ صلح شریعت کے دائرہ میں ہو، کسی غیر شرعی بات پر نہ فریقوں کا اتفاق معتبر ہے نہ حَکَموں کا، اللہ تعالیٰ نے قرآن وحدیث کے خلاف فیصلہ کرنے کو فسق، ظلم اور کفر قرار دیا ہے، (المائدہ: ۴۴، ۴۵، ۴۷) مثلاً ایک شخص نے بیوی کی موجودگی میں اس کی بہن سے نکاح کر لیا، جو شرعاً حرام ہے، یا تین طلاق کے بعد بھی بیوی کو لوٹا لیا، جو جائز نہیں اور پنچوں نے مرد کی اس پر سرزنش کر کے یا اس پر جرمانہ لگا کر ساتھ رہنے کی اجازت دے دی، تو اس کا کوئی اعتبار نہیں؛ کیوں کہ جس چیز کو اللہ نے حرام کیا ہو، تمام انسان مل کر بھی اس کو حلال نہیں کر سکتے۔

باہمی اختلاف کو حل کرنے کا تیسرا طریقہ قاضی سے رجوع کرنا ہے؛ کیوں کہ تحکیم اسی وقت ہو سکتی ہے، جب کہ دونوں فریق کسی کو حَکَم بنانے پر راضی ہو جائیں، جب دونوں کا کسی شخص پر اتفاق نہ ہو سکے، تو اب یہی راستہ ہے کہ دونوں فریق یا کوئی ایک فریق قاضی کی طرف رجوع ہو جائیں، قاضی شرعی اصولوں کے مطابق فریقین سے تحقیق کرے اور جو فیصلہ کرے فریقین اس کے مطابق عمل کریں، حَکَم اور قاضی میں فرق یہ ہے کہ حَکَم کو فیصلہ کی اجازت فریقین کی جانب سے حاصل ہوتی ہے؛ اس لئے حَکَم بنانے پر فریقین کا متفق ہونا ضروری ہے اور قاضی عام مسلمانوں کی جانب سے اس کام پر مامور ہوتا ہے؛ اس لئے اسے مسلمانوں پر ولایت حاصل ہوتی ہے، جسے فقہ کی اصطلاح میں ''ولایت عامہ'' کہتے ہیں؛ اس لئے فریقین کا اس بات پر راضی ہونا ضروری نہیں

ہوتا کہ وہ ان کے معاملات کا فیصلہ کریں، بلکہ وہ بجائے خود فیصلہ کا مجاز ہوتا ہے، بشرطیکہ یہ نزاع اللہ تعالیٰ کے حقوق سے متعلق ہو یا بندوں کے حق سے متعلق ہو اور کسی فریق نے اس سے رجوع کیا ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد معتبر طریقہ پر حدیث وفقہ کی کتابوں میں منقول ہے کہ قضاء محکم فریضہ ہے، یعنی یہ فریضہ قیامت تک کے لئے ہے، کسی بھی زمانہ اور کسی بھی علاقے میں مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ قضاء کا نظام قائم نہیں کریں؛ کیوں کہ اگر مسلمانوں کے جھگڑے طے کرنے والا شرعی نظام قضاء موجود نہیں ہوگا، تو لوگ ایسی عدالتوں میں اپنا معاملہ لے جائیں گے، جن کی بنیاد احکام شریعت پر نہیں ہوگی اور جہاں شریعت کے خلاف فیصلے ہوں گے؛ اسی لئے فقہاء نے صراحت کی ہے کہ جن ممالک میں اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہو، وہاں بھی مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنے طور پر قضاء کا نظام قائم کریں، مشہور فقیہ علامہ ابن عابدین شامیؒ نے علامہ ابن ہمامؒ سے صراحتاً یہ بات نقل کی ہے، (دیکھئے: ردالمحتار: ۴/ ۳۰۷، طبع قدیم) —— اس کے علاوہ ابن قاضی سماوہ، علامہ طحطاویؒ، علامہ ابن نجیم مصریؒ اور مختلف فقہاء کے یہاں اس کی صراحت ملتی ہے۔

خود رسول اللہ ﷺ نے یمن میں اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو مختلف حصوں کا قاضی بنا کر بھیجا، جب پورا یمن دامن اسلام میں نہیں آیا تھا، اور وہاں غیر مسلموں کی اکثریت تھی، ہندوستان میں بھی حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور ان کے بعد اکثر ممتاز اہل علم مولانا سید ابوالمحاسن محمد سجادؒ، علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ وغیرہ مسلمانانِ ہند پر اس کو لازم قرار دیتے آئے ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ ہندوستان میں امارت شرعیہ اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے تحت دار القضاء اور جمیعت علماء ہند کے تحت محاکم شرعیہ قائم ہیں اور ان اداروں کے ذریعے ہزاروں فیصلے ہوتے رہتے ہیں، اگر حَکَم کے بارے میں اتفاق نہیں ہو سکے تو شخصی اور جماعتی جھگڑوں میں یہی سب سے موزوں اور قابلِ اطمینان شکل ہے۔

یہ بات بڑے افسوس کی ہے کہ علماء دینی ادارے، مذہبی تنظیمیں اور ملی جماعتیں دوسروں کو تو سرکاری عدالتوں میں مقدمہ بازی سے روکیں اور اصلاح معاشرہ کی مہم کا اسے حصہ بنائیں، نیز اس کے دینی ودنیوی نقصانات امت کو بتائیں؛ لیکن اپنے آپسی اختلاف کے لئے ان ہی عدالتوں

کے دروازے خود کھٹکھٹائیں یا اپنے نا منصفانہ رویہ کی وجہ سے دوسرے فریق کو کھٹکھٹانے پر مجبور کردیں، ظاہر ہے کہ یہ کسی بھی طرح مذہبی شخصیتوں اور اداروں کے شایانِ شان نہیں اور قرآن مجید کی زبان میں ''لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ'' (ایسی باتیں کیوں کہتے ہو، جو خود نہیں کرتے ؟) کا مصداق بنتا ہے؛ اس لئے ضرورت ہے کہ ہر طرح کی نزاع کے حل کے لئے شرعی اصولوں پر قائم ان اداروں سے رجوع کیا جائے اور فیصلہ پر اپنے آپ کو راضی کیا جائے؛ کیوں کہ مؤمن کے لئے سب سے بڑی کامیابی خدا اور رسول کے فیصلہ کے سامنے سر جھکا دینا ہے۔

جہاں صلح کا امکان نہ ہو اور بظاہر حَکَم کے واسطہ سے مسئلہ حل کرنا بھی ممکن نہ ہو، دار القضاء کی طرف بھی خدا ناترسی نہ لے جاتی ہو، ایک فریق ایسی سرتابی پر تلا ہوا ہو کہ اس کو اس سے روکنے کی کوئی تدبیر نہ ہو اور اس سے مزید انتشار پیدا ہو سکتا ہو تو اختلافات کو حل کرنے کا چوتھا اور آخری طریقہ ''صبر'' ہے، یعنی وقتی طور پر اس صورت حال کو برداشت کر لینا اور اسے اللہ کی عدالت کے حوالہ کر دینا، اپنے اختلافات کے حل کے لئے اس طریقہ کو قبول کرنا آسان بات نہیں ہے، اس سے نفس پر چوٹ پڑتی ہے، جذبات بے قابو ہوتے ہیں، عقل سو دلیلیں سجھاتی ہے کہ مظلوم ہو کر بھی کیوں ہتھیار ڈالا جائے ؟ لوگ بزدلی اور کم ہمتی کا طعنہ دیتے ہیں؛ لیکن اگر کوئی شخص ان ساری رکاوٹوں سے آگے بڑھ کر اللہ کی خوشنودی اور امت کے اجتماعی مفاد کے لئے اپنے آپ کو اس پر راضی کر لے تو حقیقت میں وہ ہارتا نہیں ہے، جیتتا ہے، اسے خدا کے دربار کی سرخروئی حاصل ہوتی ہے اور مؤمن کے لئے یہی سب سے بڑی کامیابی ہے!

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میرے بعد ایسے حکمراں پیدا ہوں گے جو تمہارے حقوق ادا نہیں کریں گے، اس وقت تمہارا کیا رویہ ہوگا ؟ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ہم انہیں نوک شمشیر سے سیدھا کردیں گے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں؛ بلکہ صبر سے کام لینا، یہاں تک کہ تم بھی خدا کے دربار میں آجاؤ اور وہ بھی۔ (مسند احمد بن حنبل، حدیث نمبر: ۲۱۵۹۹) —— اسی طرح آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مقررہ امام نیک ہو یا بد، نماز اس کے پیچھے پڑھ لو: ''صلوا خلف کل بر و فاجر'' (سنن الدار قطنی، عن ابی ھریرہ رضی اللہ عنہ، کتاب العیدین، باب صفة من تجوز الصلاة معه و الصلاة علیه، حدیث نمبر: ۱۷۵۰، سنن البیھقی، کتاب

الجنائز، باب الصلاۃ علی من قتل نفسہ غیر مستحل لقتلھا، حدیث نمبر: ۶۶۲۳) —— ظاہر ہے کہ برائی سے روکنا اور ظلم کے خلاف مقاومت ایک دینی فریضہ ہے؛ لیکن آپ ﷺ نے مسلمانوں کی اجتماعیت کو باقی رکھنے اور انہیں انتشار سے بچانے کے لئے صبر کا حکم دیا، اسی طرح دوسری حدیث میں امام کے مطلوبہ اوصاف کے سلسلہ میں چشم پوشی کا حکم دیتے ہوئے آپ ﷺ نے فاسق وفاجر امام کے پیچھے بھی نماز پڑھنے کا حکم دیا کہ کہیں اس کے خلاف مہم جوئی امت میں بکھراؤ کا سبب نہ بن جائے، چنانچہ صحابہ ؓ اور اکابر تابعینؒ نے حجاج بن یوسف جیسے ظالم وجابر شخص کی اقتداء میں بھی نماز ادا کی اور سلف صالحین نے بنوامیہ کے ظالم وجابرخوں آشام آمروں اور بنوعباس کے عیش پرست اور سفاک حکمرانوں کو بھی اسی لئے برداشت کیا کہ ان کی مخالفت امت کو کمزور کرنے کا سبب نہ بن جائے اور یہی رویہ بعد کو عجمی نژاد حکمرانوں کے ساتھ بھی اختیار کیا گیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اختلافات کو دور کرنے کے لئے اس حل کو قبول کرنا آسان نہیں، اس کے لئے ضروری ہے کہ جذبات پر عقل اور جوش پر ہوش غالب رہے، انسان اکثر اپنی انفرادی زندگی میں —— بادل ناخواستہ سہی —— اس رویہ کو اختیار کرتا رہتا ہے، ازدواجی زندگی کے مسائل ہوں، والدین اور بال بچوں سے تعلقات ہوں، یا زندگی کے دوسرے معاملات ہوں، انسان فتنہ کو روکنے اور بڑے مفاسد سے بچنے کے لئے اپنی پسپائی کو قبول کر لیتا ہے؛ لیکن تنظیمی اور جماعتی مسائل میں نیز قومی اور بین قومی تعلقات میں اکثر اس کی رعایت نہیں کی جاتی، اس کی وجہ سے ایسے مفاسد پیدا ہوتے ہیں، جو ایک شخص کی ہٹ دھرمی کے نقصانات سے بھی سوا ہو جاتے ہیں، انسان اپنی شخصی زندگی کے معاملہ میں جس حکمت عملی سے کام لیتا ہے اور نفع ونقصان کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرتا ہے، اگر اجتماعی اور قومی مسائل میں بھی ایسا ہی رویہ اختیار کرے تو امت انتشار اور بکھراؤ سے بچ سکتی ہے، بظاہر اس ایثار اور پسپائی سے انسان اپنے آپ کو بے آبرو ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے؛ لیکن حقیقت میں یہ چیز اس کے وقار میں اضافہ کرتی ہے اور اللہ کی طرف سے دلوں میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**من تواضع لله درجة رفعه الله درجة**'' (مسند أحمد بن حنبل، مسند أبي سعيد الخدري ؓ، حدیث نمبر: ۱۱۷۴۲) جو اللہ کے لئے جھکتا ہے، اللہ اسے بلند فرماتے ہیں، مگر افسوس کہ عام لوگوں کا ذکر ہی کیا سربراہانِ قوم بھی اس فارمولے کو

قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ وإلی اللہ المشتکی

بہر حال مسلمان تنظیموں ، جماعتوں ، مختلف گروہوں نیز مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اگر اختلاف جھگڑے تک پہونچ جائے تو بجائے اس کے کہ ذرائع ابلاغ کے ذریعہ باہمی اختلافات کی بازگشت لوگوں تک پہونچے اور پوری امت کی بے آبروئی ہو، صحیح طریقہ یہی ہے کہ فریقین پہلے تینوں طریقۂ کار میں سے کسی ایک طریقہ کو اختیار کریں اور اگر پانی سر سے اونچا ہو جائے تو کوئی ایک فریق اس چوتھے راستہ پر آ جائے ، جو بظاہر پسپائی کا ؛ لیکن حقیقت میں کامیابی اور سر بلندی کا راستہ ہے اور اپنے لئے کوئی ایسا نیا پلیٹ فارم اختیار کر لے، جس کے ذریعہ اپنی صلاحیت کو دین اور امت کے مفاد میں خرچ کر سکے۔

۲۳، ۳۰/ مئی ۲۰۰۸ء

مذاہب کے درمیان مذاکرات

مغرب کا نیا ایجنڈا

ادھر عرصہ سے عالم اسلام اور مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ غور وفکر اور بحث کے لئے خود اپنا ایجنڈا متعین نہیں کرتے ؛ بلکہ مغرب کی طرف سے ان پر مسائل تھوپے جاتے ہیں اور پھر ساری دنیا میں خاص کر مسلم دنیا میں وہ غور وفکر کا موضوع بن جاتا ہے، مغرب چاہتا تھا کہ پوری دنیا کو اخلاقی قدروں سے آزاد کردیا جائے اور انسان کے لئے نفس کی پرستاری میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے، اس کے لئے پہلے عورتوں کی آزادی کا عنوان قائم کیا گیا اور بحث ہونے لگی کہ جب مرد گھر کے باہر نکل سکتے ہیں، تو عورت کو گھر کی چہاردیواری میں کیوں مقید رکھا جائے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بازاروں، آفسوں اور کارخانوں میں عورتیں پہونچ گئیں، بچے ماں کی ممتا سے اور شوہر ازدواجی زندگی کے سکون سے محروم ہوگئے ؛ لیکن مغربی تہذیب جو کچھ چاہتی تھی، اس کے لئے اتنی سی بات کافی نہیں تھی، اس سے یقینا اس کو کارکنوں اور مزدوروں کی بڑی تعداد حاصل ہوگئی ؛ لیکن نفس کی ہوسنا کی کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ ستر ولباس کی قید بھی ختم ہوجائے، صنفی تعلق میں بھی نکاح کی قید باقی نہیں رہے، تجارت کو فروغ دینے اور معیشت کو ترقی کی منزل پر پہونچانے کے لئے عورت کے جسم کو تشہیر کا ذریعہ بنایا جائے ؛ اس لئے اب دوسرا نعرہ ''شخصی آزادی'' کا لگایا گیا کہ ہر انسان اپنی نجی زندگی کے بارے میں آزاد ہے، وہ لباس پہنے یا بے لباس رہے، جیسا لباس چاہے استعمال کرے، جس مرد یا عورت سے چاہے تعلق رکھے، اس کو اپنی جسم کی نمائش کا پورا پورا اختیار ہونا چاہئے، اب شخصی آزادی کا یہی نعرہ پوری دنیا میں غور وفکر کا موضوع بن گیا ہے۔

دنیا میں مظلوموں کو دبانے اور ان پر مزید ظلم کرنے اور اپنے تحفظ کے نام پر لاکھوں انسانوں کو تہ تیغ کردینے کا حق حاصل ہے ؛ لیکن کسی مظلوم اور ستم زدہ کو ہمارے خلاف احتجاج نہیں

کرنا چاہئے، اگر وہ مجبور شخص ہم پر پتھر بھی اٹھا کر پھینکے، تو وہ دہشت گرد ہے، یہ واضح طور پر انصاف کا دہرا پیمانہ ہے، اسرائیل کا فلسطینیوں کی زمین و جائداد پر قابض ہو جانا اور دن رات ظلم کا بازار گرم کرنا حفاظت خود اختیاری ہے اور فلسطینیوں کا پتھر پھینکنا اور ظالموں کے خلاف جوابی کاروائی کرنا دہشت گردی ہے، طالبان کی جائز حکومت کو زور زبردستی سے ختم کر دینا اور بین الاقوامی جنگی قوانین کا مذاق اڑاتے ہوئے طالبان فوجی قیدیوں پر روح فرسا مظالم ڈھانا دہشت گردی نہیں؛ لیکن اگر وہ مغربی فوجیوں پر حملہ کریں تو دہشت گردی ہے، مغرب نے اس ایجنڈے کو عالم اسلام پر اس طرح مسلط کر دیا ہے کہ آج مسلمان ممالک، اسلامی ادارے اور مسلمانوں کی مذہبی تنظیمیں بھی دہشت گردی کو سب سے اہم عنوان بنائے ہوئی ہیں اور اس موضوع پر سیمینا رو کانفرنسیں منعقد کر رہے ہیں۔

اسی طرح اب ایک نیا موضوع مذاہب کے درمیان مذاکرات (حوار بین المذاہب) کا شروع ہوا ہے، مختلف مسلم ممالک اس موضوع پر بڑی بڑی کانفرنسیں منعقد کر رہے ہیں اور مسلم ممالک اس میں پیش پیش بھی ہیں، اگر آئندہ ہندوستان میں مسلمان مذہبی تنظیمیں اس موضوع پر بھی سیمینار اور جلسے کرنے لگیں، تو یہ حیرت کی بات نہیں ہوگی؛ کیوں کہ مغرب کی طرف سے جو ایجنڈا دیا جاتا ہے، ہم دانستہ یا نادانستہ اسی کھلونے سے کھیلتے رہتے ہیں؛ حالاں کہ جس چیز کو مذاکرہ کہا جا رہا ہے، وہ حقیقت میں مذاکرہ نہیں ہے، مذاکرہ تو دو ایسے فریقوں کے درمیان ہوتا ہے، جو طاقت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے مدمقابل ہوں اور فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں، ایسی دو قوموں میں جن کے درمیان طاقت کے اعتبار سے کوئی نسبت نہ ہو، جس میں ایک فریق اپنے مدمقابل کی بات ماننے پر مجبور ہو، ان کے درمیان مذاکرہ محض ایک فریب ہے، ہاتھی اور شیر میں مقابلہ اور مصالحت کی بات تو سمجھ میں آسکتی ہے؛ لیکن شیر اور بکری میں صلح کے کوئی معنی نہیں، یہ تو کمزوروں کو جھکانے اور ان کو تابع فرمان بنانے کا ایک خوبصورت عنوان ہے، ایسے نام نہاد مذاکرہ میں جو فریق طاقتور ہوتا ہے وہ اپنا مقصد بھی حاصل کر لیتا ہے اور اس پر ظالم و مجرم ہونے کی تہمت بھی نہیں لگتی اور کمزور فریق کا فائدہ یہ ہے کہ اسے تو اپنے مقابل کے سامنے جھکنا اور ہتھیار ڈالنا ہی تھا؛ لیکن اب یہ اس کام کو ایک حد تک باعزت طریقہ پر کر لیتا ہے اور ظاہری رسوائی سے بچ جاتا ہے؛ لیکن بہرحال اسے

فریق مقابل کے سامنے جھکنا ہی پڑتا ہے۔

اس وقت مذاہب کے درمیان مذاکرات کی یہی صورت ہے، یہودی، عیسائی اور ان کی اتباع میں دوسری قوموں کے لئے مذہب کی حیثیت موم کی ناک کی ہے، اسے جس طرح چاہے موڑا جاسکتا ہے، وہ انسان کے کسی عمل میں رکاوٹ نہیں بنتا؛ کیوں کہ ان مذاہب کے ماننے والوں نے گرجوں ، چرچوں اور عبادت گاہوں میں مذہب کو قید کردیا ہے اسے زندگی کے دوسرے میدانوں میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہے، اکثر مذاہب میں نشہ کو منع کیا گیا ہے، سور کو حرام قرار دیا گیا ہے، تمام مذاہب زنا اور جنسی انحراف کے ممنوع ہونے پر متفق ہیں، برہنگی اور عریانیت کسی مذہب میں قابل قبول نہیں سمجھی گئی ہے، سود ناانصافی اور استحصال کی ایک شکل ہے، اس لئے ہر مذہب اس سے روکتا ہے، خود بائبل میں بھی صراحتاً اس کو منع کیا گیا ہے، انسانی زندگی کی اہمیت اور احترام کی تعلیم ہر مذہب کا حصہ ہے؛ لیکن آج ان لوگوں نے بھی ان تعلیمات کو اپنی زندگی سے نکال دیا ہے، جو زبان سے خدا کا اقرار کرتے ہیں اور اپنے آپ کو مذہب کا متبع اور پیرو کار کہتے ہیں، وہ ایک طرف مذہب کا اقرار بھی کرتے ہیں، اور انہوں نے مذہب کو اپنی زندگی اور سماج سے نکال باہر بھی کررکھا ہے، یہ ایک کھلا ہوا تضاد ہے، جس سے مغربی معاشرہ دوچار ہے۔

مسلمان اگر اس رویہ کو قبول کرنے کو تیار ہوجائیں کہ وہ مذہب کو مسجد کی چہار دیواری سے باہر نکلنے نہیں دیں گے، تو مغرب کو مسلمانوں سے صلح کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہوگی، اس وقت مذہبی مذاکرات کے ایجنڈے کا اصل مقصد اہل مغرب کے نزدیک یہی ہے، اب یہی دیکھئے کہ برطانیہ کے سابق وزیر اعظم ٹونی بلیئر نے بھی اعلان کیا ہے کہ وہ مذاہب میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور دنیا کے چھ بڑے مذاہب — عیسائیت، یہودیت، اسلام، بدھ مت، ہندوازم اور سکھ ازم — کے درمیان مذاکرات کو فروغ دینے اور ان کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کریں گے، حالانکہ یہ وہی ٹونی بلیئر ہیں، جنہوں نے افغانستان اور عراق میں امریکہ کے ساتھ مل کر لاکھوں بے قصور انسانوں کا قتل عام کیا ہے اور وہ اس کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ عراق پر حملہ کے وقت انہوں نے مذہب کو مرکزی نقطہ بنایا تھا، (دیکھئے ۳۱؍مئی ۲۰۰۸ کے اخبارات) اس سے صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے اس جنگ کو اسلام اور عیسائیت کے درمیان جنگ سمجھا تھا اور اسی پہلو کو سامنے رکھتے

ہوئے عراق کے خلاف معرکہ آرائی کی تھی، ایسے لوگ کس نوعیت کی مذہبی ہم آہنگی چاہیں گے اور کن اصولوں پر مذاکرات کریں گے؟ وہ ظاہر ہے۔

مذاکرات کی بنیاد وہ ہونی چاہئے، جس کا قرآن مجید کی سورت نمبر ۱۰۹ ''کافرون'' میں ذکر آیا ہے، آج کی زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ مشرکین مکہ نے اسلام اور اس وقت کے مروجہ مشرکانہ تصورات کے درمیان مذہبی ہم آہنگی کے دو فارمولے پیش کئے اور اس پر حضور ﷺ سے گفتگو کی، ایک یہ کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کو بھی اپنی عبادت میں شریک کرلیں اور مسلمان بھی ان کے بتوں کو پوجنے کے لئے آمادہ ہوجائیں، روزانہ اس طریقہ پر پرستش ہوا کرے، دوسری صورت یہ ہے کہ ایام متعین کرلئے جائیں، ہفتہ میں چند دن مسلمانوں کے تصور کے مطابق خدا کی عبادت ہو اور چند دنوں مشرکین کے بتوں کی، یہ دو فارمولے تھے، جو مشرکین مکہ کی طرف سے پیش کئے گئے، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اس کا جو جواب دلوایا، وہ یہ تھا کہ تم لوگ جن چیزوں کو پوجتے ہو، مسلمان ان کو معبود کا درجہ نہیں دے سکتے اور ہم جس خدائے واحد کی عبادت کرتے ہیں، تم اس کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہو؛ کیوں کہ توحید اور شرک دو متضاد نظریات ہیں، جن کو ایک ساتھ جمع نہیں کیا جاسکتا، اس طرح یہ دونوں فارمولے رد کردیئے گئے۔

اس کے مقابلہ قرآن مجید نے ایک تیسرا فارمولہ پیش کیا، اور وہ یہ تھا کہ جب ہم ایک دوسرے کی فکر سے اتفاق نہیں کرسکتے، تو ہم ایک دوسرے کے معاملہ میں دخل دیئے بغیر اپنے اپنے مذہب پر عمل کریں، مسلمان اپنے دین پر قائم رہیں اور مشرکین، جب تک اللہ کی طرف سے توفیق و ہدایت حاصل نہ ہوجائے، اپنے طریقہ پر قائم رہیں اور ایک فریق دوسرے فریق کے معاملے میں مداخلت سے گریز کرے، {لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ} واقعہ یہ ہے کہ مذہبی ہم آہنگی کے لئے جو نسخہ قرآن مجید نے تقریباً پندرہ سو سال پہلے پیش کیا تھا، آج بھی وہی قابل عمل ہے، اور اسی پر عمل کرتے ہوئے دنیا میں امن و آشتی کا قیام ممکن ہے، ایک مذہب کے ماننے والے دوسرے مذہب کے ماننے والوں کو سبق پڑھائیں اور اس سے آگے بڑھ کر مجبور کریں کہ انہیں یہ کرنا چاہئے اور یہ نہیں کرنا چاہئے، یقیناً امن قائم کرنے اور ہم آہنگی کو برقرار رکھنے میں رکاوٹ ہے اور اس سے ٹکراؤ اور تصادم کی فضا پیدا ہوگی۔

اس وقت مغربی اقوام کی طرف سے جس مذہبی ہم آہنگی کا مطالبہ ہے، اس کا مقصد یہی ہے کہ مسلمان اسلامی افکار و اقدار پر اصرار نہ کریں اور دوسری اقوام کی طرح مذہب کے محدود ترین تصور کو قبول کرلیں، ظاہر ہے مسلمانوں کے لئے یہ بات قابل قبول نہیں ہوسکتی، کیونکہ قرآن مجید مسلمانوں کو پوری طرح اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کے تابع ہوکر زندگی گذارنے کی تعلیم دیتا ہے: {يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً} (البقرہ: ۲۰۸) اور ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ اس کا جینا اور مرنا بھی اللہ ہی کے لئے ہو:

{إِنَّ صَلاَتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ}

(الانعام: ۱۶۲)

مذاہب کے درمیان مذاکرات اور ہم آہنگی میں دو باتیں بنیادی کردار ادا کرسکتی ہیں، باہمی احترام اور باہمی اشتراک — باہمی احترام سے مراد یہ ہے کہ تمام مذہبی شخصیتوں اور تمام مذاہب کے مقدس مقامات کے بارے میں بے احترامی اور اہانت کے رویہ سے بچا جائے، کیونکہ کوئی بھی شخص ایسی شخصیتوں کی اہانت کو برداشت نہیں کرسکتا، جن سے اس کا تعلق عقیدت واحترام کا ہو، اسلام میں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے، شریعت اسلامی نے غیر مسلموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، ایک اہل کتاب، دوسرے عام کفار ومشرکین، اہل کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں، جن کا ایمان ایسی شخصیتوں اور کتابوں پر ہو، جن کے نبی اور کتاب آسمانی ہونے کی تصریح خود قرآن مجید کرتا ہو، ظاہر ہے مسلمانوں کو بھی اجمالی طور سے ان پر ایمان رکھنا ضروری ہے؛ اسی لئے ان کے بارے میں نہ وہ کوئی اہانت آمیز بات کرسکتا ہے اور نہ اسے برداشت کرسکتا ہے، دوسرا گروہ عام غیر مسلموں کا ہے، وہ جن شخصیتوں پر ایمان رکھتے ہیں، چونکہ کا ان عہد ماقبل تاریخ کا ہے اور ان کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے، وہ کوئی مصدّقہ بات نہیں ہے؛ اس لئے اس بات کا امکان موجود ہے کہ شاید وہ اپنے عہد کے پیغمبر ہوں اور ان کے متبعین نے ان کی تعلیمات میں ملاوٹ پیدا کردی ہو، اس لئے ہمیں ان کے بارے میں اپنی زبان طعن دراز نہیں کرنا ہے اور اہانت سے بچنا ہے، بلکہ جن بتوں اور مورتیوں کو یہ پوجتے ہیں — حالاں کہ ان کا باطل ہونا بالکل واضح ہے؛ لیکن ان کو برا بھلا کہنے سے چونکہ مذہبی جذبات مجروح ہوتے ہیں اور عمل اور ردّعمل کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے، اس

لئے — ان کو بھی برا بھلا کہنے سے منع کیا گیا ہے:

{وَلاَ تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُونَ مِن دُونِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْواً بِغَیْرِ عِلْمٍ} (الانعام:۱۰۸)

لیکن آج مغربی دنیا کا حال یہ ہے کہ وہ ایک طرف مذہبی مذاکرات اور مذہبی ہم آہنگی کی بات کرتی ہے، دوسری طرف پیغمبر اسلام ا کی ذات والا صفات پر حملہ کرنے والے سر پھرے مصنفین کو انعامات سے نوازتی ہے، انہیں پناہ دے کر مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑکتی ہے، مضحکہ خیز کارٹون شائع کرتی ہے، انٹرنیٹ کے ذریعے کعبۃ اللہ کو میزائیل کا نشانہ بناتے ہوئے دکھاتی ہے، قرآن مجید کو گولیوں کا نشانہ بناتی ہے، جن ملکوں میں ہولوکاسٹ پر زبان کھولنا اور قلم اٹھانا جرم ہے اور جہاں اسامہ بن لادن اور طالبان کی حمایت میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنا بھی دہشت گردوں میں شامل ہونا ہے، وہیں اظہار خیال کی آزادی کے نام پر مسلمانوں کے مذہبی جذبات سے کھیلنے کی اجازت ہے، اس طرح کیسے مذہبی ہم آہنگی پیدا ہوسکتی ہے؟

مذاہب کے درمیان مذاکرات اور ہم آہنگی کے لئے دوسری بنیاد ''باہمی اشتراک ہے'' بہت سی اخلاقی قدریں مذاہب کے درمیان مشترک ہیں، کوئی مذہب زنا کی اجازت نہیں دیتا، کوئی مذہب غریبوں کے استحصال کو جائز نہیں کہتا، کوئی مذہب ہم جنسی کی شادی کو گوارہ نہیں کرتا، کوئی مذہب محض شبہ کی بنیاد پر قتل وخون کا قائل نہیں ہے، کسی مذہب میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ عورتوں اور بچوں کو ظلم کا نشانہ بنایا جائے، یہاں تک کہ انہیں ایذائیں دی جائیں، کسی مذہب میں بے قصوروں کا اغوا جائز نہیں ہے، آج دنیا محتاج ہے کہ مذاہب کی ان مشترک تعلیمات کو عام کیا جائے، اس سے دنیا میں امن پیدا ہوگا اور انسانیت فلاح وکامیابی سے ہم کنار ہوگی؛ لیکن جو مذاہب انسان کی نفس پرستی کے سامنے ہتھیار ڈال چکے ہوں، جو اس بات سے قاصر ہوں کہ انسان کے نہ ختم ہونے والی بے جا خواہشات پر کوئی روک لگا سکیں، کیا وہ مذاہب کی ان مشترکہ قدروں کو اپنی کوششوں کا حصہ بنا سکتے ہیں؟ ـــــ ہرگز نہیں!

مسلمانوں اور مسلم ممالک کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ مذہبی مذاکرات اور ہم آہنگی کا عنوان تو بڑا خوبصورت ہے؛ لیکن اس کے پس پردہ مقاصد ومحرکات بڑے خطرناک ہیں، اس کا

مقصد مسلم معاشرہ میں مغربی تہذیب کو فروغ دینا، مسلم ممالک میں عیسائی مشنریز کے لئے مذہبی تبلیغ کے مواقع فراہم کرنا اور سعودی عرب اور خلیجی ملکوں میں چرچ وگرجا بنانے کی اجازت حاصل کرنا ہے، جس کا مطالبہ امریکہ بھی کر چکا ہے اور پوپ پال بھی روم کی مسجد کا حوالہ دیتے ہوئے کر چکے ہیں ، لیکن یہ قطعاً غلط استدلال ہے، روم میں مسلمانوں کا تعمیر مسجد کا مطالبہ اس لئے تھا کہ مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد روم کی شہری ہے؛ چنانچہ جن مسلم ممالک میں عیسائی آباد ہیں، وہاں ان کی عبادت گاہیں موجود ہیں، اس کے برخلاف خلیج کے بعض ممالک وہ ہیں، جہاں صد فی صد مسلمان آباد ہیں، وہاں ظاہر ہے کہ کسی اور مذہب کی عبادت گاہ کی تعمیر بے محل بات ہوگی ۔

افسوس کہ عالم اسلام کے فرمانرواؤں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ مغرب کے بعض مطالبات کو قبول کر کے وہ ان کی خوشنودی حاصل کرلیں گے اور نفرت وعناد کی موجودہ فضا کو محبت کی فضا سے تبدیل کرلیں گے ؛ لیکن یہ محض خوش فہمی ہے، قرآن مجید نے یہود ونصاریٰ کی جو نفسیات بتائی تھی کہ جب تک تم اپنے وجود کو ان کے وجود میں گم نہیں کردو گے اور فکر وعمل میں پوری طرح ان کی غلامی کو قبول نہیں کرلو گے ، وہ تم سے خوش نہیں ہو سکتے :{وَلَن تَرْضَى عَنكَ الْيَهُودُ وَلاَ النَّصَارَى حَتَّى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ}(البقرہ:۱۲۰)—— آج بھی اسی طرح قائم ہے۔ لاتبدیل لکلمات اللہ

۶ / جون ۲۰۰۸ء

خدمت خلق اور امت مسلمہ کی ذمہ داریاں

رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک جب چالیس سال ہوئی تو آپ ﷺ کے ساتھ دو خاص کیفیتیں پیدا ہوگئیں، ایک یہ کہ آپ ﷺ خواب دیکھتے اور جو کچھ خواب دیکھتے، روشن صبح کی طرح وہ ظہور میں آجاتا، دوسرے یہ کہ آپ ﷺ کے اندر ایک طرح کی خلوت پسندی پیدا ہوگئی، آپ ﷺ کئی کئی دنوں کے لئے غار حرا میں مقیم ہوجاتے اور اللہ تعالیٰ عبادت کا جو طریقہ آپ ﷺ کے دل میں ڈالتا، اس کے مطابق عبادت فرماتے، اسی درمیان ایک دن حضرت جبرئیل علیہ السلام خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، اور پہلی بار کلام الٰہی کی چند آیتیں آپ ﷺ پر اتاریں، یہ سورۂ علق کی ابتدائی آیات تھیں، آپ ﷺ کلام ربانی کی یہ سوغات لے کر گھر واپس گئے، اللہ کے کلام کو اٹھانا اور پھر اسے اس کے بندوں تک پہنچانا معمولی کام نہیں تھا؛ اس لئے آپ ﷺ کا دل لرز رہا تھا، آپ گھر تشریف لائے، امت کی ماں اور آپ ﷺ کی غم گسار رفیقۂ حیات حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو پوری صورت حال بتائی اور فرمایا کہ مجھے اپنے آپ پر خوف ہوتا ہے: ''لقد خشيت على نفسي'' حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا — جو اپنی زندگی کا پندرہ سال سے زیادہ عرصہ آپ ﷺ کے ساتھ گزار چکی تھیں اور جو یقیناً آپ ﷺ کے شب و روز اور صبح و شام سے سب سے زیادہ آگاہ تھیں، — نے آپ ﷺ کی دلداری بھی کی اور تسلی کے کلمات بھی کہے، یہ کلمات رسول اللہ کی ذات کے بارے میں ایسی گواہی ہے کہ اس سے بہتر گواہی نہیں ہوسکتی اور ایسی شخصیت کی طرف سے ہے کہ جن سے بڑھ کر کوئی اور شخص آپ ﷺ کے احوال سے واقف نہیں ہوسکتا تھا:

''كلاّ والله ما يخزيك الله أبدًا، إنك لتصل الرحم، وتحمل الكل، وتكسب المعدوم، وتقري الضيف، وتعين على نوائب الحق'' (بخاری، باب کیف کا بدء الوحي، حدیث نمبر: ۳)

''ہرگز نہیں، خدا کی قسم! اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کریں گے، بلا شبہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، ناداروں کو کماتے ہیں، مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کے راستے میں جو مصیبت آتی ہے، اس میں مدد کرتے ہیں''

غور فرمائیے! حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان مختصر الفاظ میں کس خوبصورتی کے ساتھ آپ ﷺ کی خوبیوں کو بیان کیا ہے، صلہ رحمی کا تعلق رشتہ داروں سے ہے اور اس میں دور و قریب کے سارے رشتہ دار شامل ہیں، بوجھ ظاہری بھی ہوتا ہے اور معنوی بھی، ظاہری بوجھ یہ ہے کہ کسی کی وزنی چیز کو آپ اٹھالیں، جہازوں، ٹرینوں اور بسوں میں کثرت سے اس کے مواقع پیش آتے ہیں، اگر راستہ چلتے ہوئے آپ نے کسی ضرورت مند کو اپنی سواری پر بٹھالیا تو یہ بھی بوجھ اٹھانے میں شامل ہے، اگر آپ نے مریضوں کو ایک جگہ سے دوسرے جگہ پہنچانے کے لئے ایمبولنس کا نظم کرلیا تو یہ بھی بوجھ اٹھانے میں شامل ہے اور بوجھ معنوی بھی ہوتا ہے، کسی پر قرض کا بوجھ ہے، آپ نے اس کا قرض ادا کردیا، کوئی بچہ اور اس کے سرپرست اسکول کی فیس ادا کرنے سے قاصر ہیں، آپ نے فیس ادا کردی، مریض کے اندر اپنے علاج کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں، آپ نے علاج کا نظم کردیا، کسی کی بیوہ کے لئے اس کی زندگی بوجھ بن گئی، وہ اپنی بنیادی ضروریات بھی پوری کرنے سے قاصر ہے، آپ نے ان کو پورا کردیا، یا اس کے لئے ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا، یہ سب بوجھ اٹھانے کی ہی صورتیں ہیں، رسول اللہ ﷺ ظاہری بوجھ بھی اٹھایا کرتے تھے اور معنوی بوجھ بھی، کئی یتیم بچوں اور بچیوں کی آپ ﷺ نے کفالت فرمائی، متعدد صحابہ ؓ ہیں، جنہیں آپ ﷺ نے سواری عنایت فرمائی، وغیرہ۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ایک نہایت بامعنی لفظ ''تُکسِب المعدوم'' کا استعمال کیا ہے، ''معدوم'' ایسے شخص کو کہتے ہیں، جس کے پاس کچھ نہ ہو، جس کے لئے اردو زبان میں ''نادار'' کا لفظ ہے، سوال یہ ہے کہ نادار تو کمانے کی چیز نہیں ہے، آخر نادار کو کمانے کا کیا مطلب ہے؟ —— اصل میں اس میں عام انسانی نفسیات کے پس منظر میں رسول اللہ ﷺ کی بلند اخلاقی کو ظاہر کیا گیا ہے، انسان کا عام مزاج یہ ہے کہ جو لوگ اہل ثروت، اصحابِ وجاہت اور اربابِ رسوخ

ہوتے ہیں، ان کو تو لوگ خوشامدیں کر کے بڑے احترام اور نہایت اکرام کے ساتھ بلاتے ہیں اور جو لوگ غریب و محتاج اور مفلس و نادار ہوتے ہیں، انہیں ٹیڑھی نظر بھی دیکھنے کے روادار نہیں ہوتے ، رسول اللہ ﷺ تو پیکر رحمت تھے اور دبے کچلے لوگوں کو اوپر اٹھانے کے لئے آئے تھے؛ اس لئے آپ ﷺ ایسے محتاج و نادار لوگوں کو ایسی محبت سے اپنے دولت خانہ پر لاتے اور ان کا اکرام فرماتے کہ گویا یہی آپ ﷺ کی کمائی ہیں، جیسے ایک کسان کو کاشت کئے ہوئے دانوں سے، ایک باغبان کو اپنے لگائے ہوئے درختوں کے پھل سے، ایک فنکار کو اپنی کاوشوں کے ثمرہ سے اور ایک باپ کو اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے، یہی محبت آپ ﷺ کو ان لٹے پٹے، ٹھکرائے ہوئے لوگوں سے ہوتی تھی، آپ ﷺ ان کے لئے سہارا بنتے اور ان کی مدد فرماتے۔

عربی زبان کا دامن بڑا وسیع ہے، اسی لفظ میں اگر ''ت'' پر زبر کے بجائے پیش پڑھئے تو اب معنی یوں ہو جائے گا کہ آپ ﷺ ناداروں کو ''کمواتے'' ہیں، یعنی ایسے لوگوں کے لئے روزگار کا نظم فرماتے ہیں اور انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیتے ہیں، آپ ﷺ کی سیرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کسی غریب کی وقتی مدد کے بجائے اس بات کو زیادہ پسند فرماتے کہ اسے باعزت طور پر روٹی حاصل کرنے کے لائق بنادیا جائے؛ تاکہ وہ آبرومندانہ زندگی گزار سکے، حضور ﷺ کی اس سنت کو آج ہم دانت سے پکڑنے کے بجائے قطعاً نظر انداز کئے ہوئے ہیں، آپ کسی ریلوے اسٹیشن جائیں یا بس اسٹیشن پہنچیں، یا آپ کی سواری سڑک سے گزرتے ہوئے کسی سگنل پر رک جائے یا آپ جمعہ وعیدین کی نماز پڑھ کر باہر نکلیں یا کسی ایسی مسجد یا مندر کے پاس پہنچیں، جہاں زیادہ نمازیوں اور یاتریوں کی آمد ہوتی ہو، ہر جگہ آپ کو گداگروں کی ایک بھیڑ مل جائے گی، ان میں مرد بھی ہوں گے اور عورتیں بھی، بوڑھے بھی ہوں گے، جوان اور بچے بھی؛ لیکن اگر آپ غور کریں تو ہر جگہ ان میں غالب تعداد مسلمانوں کی نظر آئے گی، وہ اپنے اپنے ظرف کے مطابق چھوٹے بڑے کشکول پھیلائے ہوں گے، اس میں خاصا حصہ تو ان کی بے عملی اور غیرت و خودداری سے محرومی کا ہے؛ لیکن ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہم نے منظم طور پر اس بات کی کوشش نہیں کی کہ اس امت سے بے روزگاری کو ختم کیا جائے، مسلمانوں کو روزگار سے لگایا جائے یا ان کی تھوڑی بہت مدد کر کے انہیں خود اپنا روزگار پیدا کرنے کے لائق بنایا جائے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کی چوتھی صفت مہمان نوازی کی بیان فرمائی، قدیم زمانہ میں ہر جگہ بازار اور ہوٹل نہیں ہوتے تھے، نہ آسانی سے ضروریات زندگی فراہم ہو پاتی تھیں، نہ مسافروں کے لئے دن دو دن کہیں ٹھہرنے کی جگہ مہیّا ہوتی تھی؛ اس لئے اگر راہ گیروں کی میزبانی نہیں کی جاتی اور زادِ راہ ختم ہونے کے بعد ان کے کھانے پینے کا انتظام نہیں کیا جاتا تو ناقابل بیان دشواری پیش آتی اور بعض اوقات تو جان کے لالے پڑ جاتے، ان حالات میں مہمان نوازی کی غیر معمولی اہمیت تھی؛ لیکن آج بھی اس کی اہمیت ختم نہیں ہوئی، آج بھی مسافر خانوں اور سرایوں کی ضرورت ہے، اگر مسجدوں کے ساتھ مسافر خانہ کا نظم ہو، خواہ معمولی کرایہ بھی لیا جاتا ہو، تو بہت سے غریب مسافروں اور خاص کر کم معاشی حیثیت کے حامل اسٹوڈنٹس کے لئے ایک جائے پناہ مہیا ہوسکتی ہے، بہت سے مسلمان بچے جو ذہنی استعداد کے باوجود شہر میں قیام کی گنجائش سے محروم ہونے کے باعث اپنا سلسلۂ تعلیم منقطع کر دیتے ہیں، انہیں سہولت بہم پہنچ سکتی تھی اور اس طرح تعلیم کے میدان میں بھی بڑا فائدہ ہوسکتا تھا، مہمان نوازی میں ایک صورت ریلوے اسٹیشنوں اور راستوں پر گرما کے موسم میں ٹھنڈے پانی کا انتظام بھی ہے، بدقسمتی سے ہمارے ملک میں غیر مسلم تنظیمیں تو اس کا اہتمام کرتی ہیں؛ لیکن جو پیغمبر پیاسوں کے لئے آب حیات لے کر آیا تھا، اسی کی امت کا حصہ اس میں نہ ہونے کے برابر ہے۔

پانچواں وصف حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے یہ بیان فرمایا کہ جو لوگ گناہ اور ظلم کے بغیر کسی مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں، آپ ﷺ ان کی مدد فرماتے ہیں، آج کل اس کی بہت سی صورتیں ہیں، بہت سے قیدی ناکردہ گناہوں اور پولیس کی روایتی زیادتیوں کی وجہ سے جیلوں کی کال کوٹھریوں میں بند ہیں، ان کی طرف سے مقدمات کی پیروی کا معقول انتظام نہیں ہے، ان کے گھر کے لوگ فقر وفاقہ سے دو چار ہیں، تنگ دستی کی وجہ سے ان کے بچے تعلیم حاصل نہیں کر سکتے اور ان کی بچیاں رشتۂ ازدواج سے منسلک ہونے سے قاصر ہیں، ایسے قیدیوں کی اور ان کے اہل خانہ کی مدد کرنا یقیناً اس میں شامل ہے، وقتاً فوقتاً بہت سی آفتیں آتی رہتی ہیں، کبھی زلزلہ، کبھی سیلاب، کبھی آتشزدگی، کبھی وبائی بیماریاں، ان حالات میں پریشان حال لوگوں کے کام آنا، ان کے لئے غذا، دوا اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرنا اور ان محفوظ مقامات پر منتقل کرنا یہ سب اس میں شامل ہے، اس

میں خیراتی ہسپتال قائم کرنا اور علاج کی سہولتیں مہیا کرنا بھی شامل ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی جو پانچوں صفتیں اس حدیث میں بیان فرمائی گئی ہیں ، اگر ان سب کو مشترک عنوان دینا ہو تو غالباً وہ عنوان ''خدمت خلق'' کا ہوگا ، —— رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں اور غیر مسلموں ، اور اپنوں اور بیگانوں کی تفریق کے بغیر پوری انسانیت ، بلکہ پوری خلقت کے ساتھ حسن سلوک کا نہ صرف حکم دیا ، بلکہ عملی طور پر آپ ﷺ نے اس کا نمونہ بھی پیش فرمایا ، اسی کا نتیجہ تھا کہ صحابہ ﷺ کے لئے انفاق سے زیادہ محبوب کوئی عمل نہیں تھا ، حدیث کی کتابوں میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں : '' حضرت عبد اللہ بن عمر ﷺ جحفہ میں اترے ، ان کی طبیعت خراب تھی ، کہنے لگے کہ مچھلی کھانے کی خواہش ہے ، لوگوں نے تلاش کیا تو بڑی مشکل سے ایک مچھلی ہاتھ آئی ، آپ کی زوجہ صفیہ نے مچھلی پکائی ، حضرت عبد اللہ بن عمر ﷺ کے سامنے پیش کیا ، آپ کھانے کے لئے بیٹھے ہی تھے کہ ایک مسکین بھی وہیں آپہنچا ، عبد اللہ بن عمر ﷺ نے مچھلی اس کے حوالہ کردی ، بیوی نے کہا ، سبحان اللہ آپ اسے کھالیں ، ہم اسے ایک درہم دیدیں گے ، یہ اس کے لئے زیادہ فائدہ بخش ہوگا اور آپ کی خواہش پوری ہوجائے گی ، مگر حضرت عبد اللہ بن عمر ﷺ نے نہیں مانا اور فرمایا کہ عبد اللہ اس مچھلی کو پسند کرتا ہے'' (حیاۃ الصحابہ مع تحقیق محمد بیومی وڈاکٹر کمال علی جمل ، ب:۸، ص:۳۲۸) حضرت عبد اللہ بن عمر ﷺ کا اشارہ اس جانب تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبوب چیز کو اللہ کے لئے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے : {لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ} ۔ (آل عمران:۹۲)

خدمت خلق کی ایک صورت وقتی ہے اور ایک مستقل ، اسلام نے انفاق کی ان دونوں صورتوں کو رواج دیا ہے ، انفاق کی مستقل صورت ''وقف'' کی ہے ، فقہاء نے لکھا ہے کہ اسلام سے پہلے وقف کا تصور نہیں تھا ، (دیکھئے: الفقه الإسلامي وأدلته: ۸ / ۱۵۷) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب انسان مرجاتا ہے تو عمل کا رشتہ اس سے کٹ جاتا ہے ؛ لیکن تین چیزیں باقی رہتی ہیں : صدقہ جاریہ ، ایسا علم ، جس سے اس کے بعد بھی نفع اٹھایا جاسکے اور صالح اولاد جو دعاء خیر کرے'' (صحیح مسلم ، کتاب الوصية ، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته ، حدیث نمبر: ۱۴-۱۶۳۱) صدقۂ جاریہ سے اصل میں وقف ہی مراد ہے ؛ چنانچہ حضرت عمر ﷺ نے خیبر کا اپنا حصہ —— جو خود ان کے بقول زندگی میں حاصل ہونے والی سب سے بڑی دولت تھی —— کو انہوں نے وقف فرمادیا اور

باضابطہ اس کے لئے وقف نامہ بھی تحریر فرمایا، صحاح ستہ میں اس کا ذکر موجود ہے، (نصب الرایہ: ۳/۷۶ ۳، کتاب الوقف) اسی طرح حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے کنواں خرید کر وقف فرمایا، اس کنویں کا نام ''بیئر روما'' تھا' حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو جو باغ سب سے زیادہ محبوب تھا، جسے ''بیر حاء'' کہا جاتا تھا، اسے وقف فرمادیا، (مؤطأ امام مالک، کتاب الصدقة، حدیث نمبر: ۱۸۱۳) یہاں تک کہ مسلمانوں میں وقف کا ذوق اتنا بڑھا کہ مریضوں کے ساتھ ساتھ مریضوں کی تیمارداری کرنے والوں پر بھی وقف کیا کرتے تھے؛ بلکہ پرندوں کی خوراک کے لئے بھی جائدادیں وقف کی جاتی تھیں؛ لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ ہم نئے اوقاف تو کیا قائم کرتے؟ بزرگوں کے اوقاف کو بھی ناجائز طریقہ پر کھا رہے ہیں اور غرباء کو ان کے حق سے محروم کئے ہوئے ہیں!

خدمت خلق کا جذبہ قوموں کو سماج میں عزت و وقار عطا کرتا ہے، لوگوں پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ دینے والا ہاتھ ہے نہ کہ صرف لینے والا، اس سے دعوت دین کے لئے فضا ہموار ہوتی ہے، تعلقات میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور اس کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس طرح ہم مسلمانوں کو ارتداد کے فتنہ سے بچا سکتے ہیں، آج دیہاتوں میں ارتداد کی جو آگ لگائی جارہی ہے اور مسلمانوں کے ایمان کا سودا کیا جارہا ہے، اس کی ایک بنیادی وجہ خدمت خلق کے جذبہ کا ختم ہوجانا، غریب مسلمانوں کی طرف سے اہل ثروت کا بے اعتنائی برتنا اور اس امت — جو پوری انسانیت کے لئے پیدا کی گئی تھی — کا اپنے آپ میں کھوجانا اور دوسروں کے حقوق وضروریات کے بارے میں بے حسی میں مبتلا ہوجانا ہے، رسول اللہ ﷺ جب انسانیت کی طرف پیغام حق لے کر آئے تو آپ ﷺ جس جوہر اخلاق سے آراستہ تھے، مسلمانوں کو ایک داعی امت ہونے کی حیثیت سے اسی جوہر کو حاصل کرنا پڑے گا اور اس کے بغیر نہ وہ دنیا میں سرخ رو ہوسکیں گے اور نہ آخرت میں۔

۲۵/ جولائی ۲۰۰۸ء

بے سہاروں کے لئے سہارا

تقریباً ایک ماہ پہلے ہندوستان کی ایک مؤقر مسلم تنظیم کی میٹنگ دہلی میں منعقد ہوئی ، اس حقیر کو بھی اس میں شرکت کا موقع ملا ، میٹنگ میں یہ بات بھی زیر بحث آئی کہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں بے سہارا لڑکیوں اور عورتوں کے لئے '' ناری نکیتن '' کے نام سے گورنمنٹ کے ادارے قائم ہیں ، اس میں بے سہارا لڑکیوں اور عورتوں کی پرورش کی جاتی ہے ، ان کی تعلیم وتربیت کا اہتمام ہوتا ہے اور ان کی شادیاں بھی کردی جاتی ہیں ، جو لڑکے یہاں سے اپنے لئے رفیقۂ حیات کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں ، ان کو ادارہ کی طرف سے اس سلسلہ میں تعاون دیا جاتا ہے ، اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں ہوتی ، اس کا نتیجہ ہے کہ بہت سی مسلمان لڑکیاں غیر مسلم لڑکوں سے بیاہ دی جاتی ہیں ، بعض دفعہ تو یہ نوبت اس لئے آتی ہے کہ مسلمان لڑکے نکاح کے لئے تیار نہیں ہوتے اور وہ اپنی دینی بہنوں کو اٹھانا نہیں چاہتے اور بعض دفعہ منتظمین کی طرف سے تعصب اور عدم تعاون کا مظاہرہ ہوتا ہے ، اس موقع پر یہ بات بھی سامنے آئی کہ خود مسلمانوں کے ایسے ادارے نہیں ہیں یا کم ہیں ، جو ایسی بے سہارا لڑکیوں اور عورتوں کے لئے سہارا بن سکیں ۔

واقعہ ہے کہ یہ مسلمانوں کے لئے لمحۂ فکریہ ہے ، اولاً تو قلب میں ایسی وسعت ہونی چاہئے کہ یتیم ، لاوارث اور بے سہارا بچوں کو ہم اپنے گھروں میں جگہ دیں ، ان کی کفالت اور پرورش کریں اور اپنی اولاد کی طرح ان کے ساتھ سلوک روا رکھیں ، اسلام میں یتیموں اور بے سہارا لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کی جس قدر تعلیم دی گئی ہے ، شاید کسی اور مذہب میں دی گئی ہو ، عام طور پر مذہب کے کچھ جزوی کاموں کو انجام دے کر لوگ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اجر وثواب کے بہت سے کام کر لئے ، قرآن مجید نے اس مزاج کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ محض یہ بات کہ تمہارا رخ مشرق کی طرف ہو کہ مغرب کی طرف ، اصل نیکی نہیں ہے ؛ بلکہ اصل نیکی ایمان لانا ، خود ضرورت مند

ہونے کے باوجود قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں وغیرہ پر خرچ کرنا ہے، (البقرۃ: ۱۷۷) بنی اسرائیل سے جن باتوں کا عہد لیا گیا، جن کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے، ان میں والدین، قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک کا خاص طور پر ذکر آیا ہے، (البقرۃ: ۸۳) اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی فرمائی کہ اگر تقسیم میراث کے وقت کچھ قرابت دار، یتیم اور مسکین آجائیں، جن کا اس میں حق نہیں ہو، تو اپنی طرف سے اخلاقاً کچھ ان کو بھی دیدو اور ان سے بھلی بات کرو، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک بات ارشاد فرمائی ہے، جو انسان کو لرزا دینے والی ہے، اللہ تعالیٰ نے دعوت فکر دی ہے کہ سوچو! اگر تم اپنے پیچھے کمزور و بے سہارا بچوں کو چھوڑ کر جاتے تو تم ان کے بارے میں کس طرح ڈرتے؟ اسی طرح دوسروں کے چھوڑے ہوئے یتیموں کے بارے میں اللہ سے ڈرو :

{وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ} (النساء:۹)

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو دین حق کا جھٹلانے والا قرار دیا ہے جو یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بے رخی اور بدسلوکی کا معاملہ کرے، (الماعون: ۲-۳) قرآن مجید کا بیان ہے کہ جو لوگ ضرورت مند ہونے کے باوجود ناداروں، یتیموں اور قیدیوں کو کھلائیں گے، آخرت میں بہترین نعمتوں سے سرفراز کئے جائیں گے۔ (الدھر: ۵ تا ۸)

رسول اللہ ﷺ خود یتیم تھے، پیدائش سے پہلے ہی والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا اور بچپن ہی میں والدہ بھی داغ فراق دے گئیں تو دادا اور چچا نے آپ ﷺ کو باپ کی شفقت اور آپ کی باندی ام ایمن رضی اللہ عنہا اور حضرت ابوطالب کی بیوی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو ماں کی محبت اور ممتا دی؛ لیکن والدین کی جدائی میں انسان کے جو احساسات ہوتے ہیں، ان کی حیثیت آپ ﷺ کے لئے جگ بیتی کی نہیں، آپ بیتی کی تھی، نیز مکہ کے معاشرہ میں یتیموں کے ساتھ جو بدسلوکی ہوتی تھی، وہ بھی آپ کی نگاہوں میں تھی، اسی لئے آپ ﷺ نے کثرت سے یتیموں اور ناداروں کے بارے میں حسن سلوک کی تعلیم دی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں اور یتیم کی پرورش کرنے والے جنت میں اتنے قریب ہوں گے، جیسے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی،

آپ ﷺ نے دونوں انگلیوں کو کشادہ کرکے فرمایا، (بخاری، حدیث نمبر: ۵۳۰۴، مسلم، حدیث نمبر: ۲۹۸۳) حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے:

''جس نے کسی یتیم کے سر پر محض اللہ کے لئے ہاتھ پھیرا تو ہر بال کے بدلہ اس کے لئے نیکیاں شمار کی جائیں گی اور جس کے زیر پرورش کوئی یتیم لڑکا یا لڑکی ہو اور وہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے تو وہ انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کی طرح مجھ سے جنت میں قریب ہوں گے''

(مجمع الزوائد: ۸ / ۱۹۰، بحوالہ مسند احمد)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ دعاء کرتے تھے کہ ''بارالٰہا! میں دو کمزور لوگوں —— یعنی یتیموں اور عورتوں —— کی حق تلفی محفوظ رہوں: ''**اللهم إني أحرج حق الضعيفين، اليتيم والمرأة**'' (سنن ابن ماجۃ، کتاب الأدب، باب حق الیتیم، حدیث نمبر: ۳۶۷۸)، آپ ﷺ نے فرمایا کہ مال انسان کے لئے اس وقت خیر کا ذریعہ ہے، جب وہ اس سے ناداروں، یتیموں اور مسافروں کی خدمت کرے: ''**فنعم مال المسلم ما أعطى منه المسكين واليتيم وابن السبيل**'' (بخاری، حدیث نمبر: ۱۴۶۵) اگر یتیم کا کچھ مال موجود ہو تو اس میں بھی خیانت اور بے احتیاطی سے باز رہنے کی خصوصی تاکید کی گئی ہے اور حکم دیا گیا کہ بدنیتی کے ساتھ ان کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ، (الأسراء: ۳۴) اور ارشاد ہوا کہ یتیم کا مال کھانا گویا جہنم کی آگ کھانا ہے اور اپنے لئے دوزخ میں جانے کا راستہ پکڑنا ہے۔ (النساء: ۱۰)

یتیموں کی صرف پرورش ہی کا حکم نہیں ہے؛ بلکہ ان کی توقیر اور ان کے ساتھ اکرام سے پیش آنے کا بھی حکم ہے، اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کے اس مزاج پر بھی نقل فرمایا کہ وہ یتیم کے ساتھ بے اکرامی اور بے توقیری کا معاملہ کرتے تھے: ''كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ'' (الفجر: ۱۷) سائب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو فتح مکہ کے دن حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ وغیرہ لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں آئے، یہ لوگ حضرت سائب کی تعریف کررہے تھے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھے نہ بتاؤ، یہ تو زمانہ جاہلیت سے میرا ساتھی ہے، حضرت سائب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ہاں، اے اللہ کے رسول! ہم آپ کے ساتھی تھے، اور آپ کیا ہی بہتر ساتھی تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: سائب تم زمانہ جاہلیت میں جن

اخلاقی خوبیوں کے حامل تھے، اسلام میں بھی ان کو قائم رکھو، یعنی ''مہمانوں کی مہمان نوازی، یتیموں کا اکرام اور پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک''۔ (سنن أبوداؤد، حدیث نمبر: ۴۸۳۶)

یہاں تک کہ عورت خود اپنے یتیم بچہ کی محبت کے ساتھ پرورش کرے اور ان پر خرچ کرے تو اس کا بھی بڑا اجر ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود ﷛ کی زوجہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبوی میں خواتین کو تلقین فرمائی کہ وہ صدقہ کریں، چاہے اپنا زیور ہی دینا پڑے، حضرت زینب رضی اللہ عنہا اپنے شوہر عبداللہ بن مسعود ﷛ پر اور اپنے زیر پرورش یتیم بچوں پر خرچ کیا کرتی تھیں، انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود ﷛ سے کہا کہ حضور ﷺ سے پوچھیں کہ کیا ان کی طرف سے یہ صدقہ کے لئے کافی ہوجائے گا؟ حضرت عبداللہ بن مسعود ﷛ کو غالباً حضور ﷺ سے یہ پوچھنے میں حجاب ہوا، انہوں نے کہا کہ تم خود پوچھ لو، حضرت زینب رضی اللہ عنہا پوچھنے گئیں تو وہاں ایک اور انصاری خاتون بھی اسی سوال کے ساتھ حاضر تھیں، بہر حال حضرت بلال ﷛ کے واسطہ سے سوال بارگاہ نبوی ﷺ میں پہنچا، آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا کرنے میں دوہرا اجر ہے، قرابت کا بھی حق ادا ہوگا اور صدقہ کا بھی، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۴۶۶) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے زیر پرورش حضرت ابوسلمہ ﷛ کے بچے تھے، جو یتیم ہو چکے تھے، حضور ﷺ نے ان کے استفسار پر فرمایا کہ تم اپنے ان بچوں پر جو خرچ کروگی، اس کا بھی تمہیں اجر ہوگا، (بخاری، حدیث نمبر: ۱۴۶۸) — ماں کو اپنی اولاد سے جو محبت اور ممتا ہوتی ہے، وہ ظاہر ہے، اس فطری تقاضہ کے تحت ماں اس پر خرچ کرنے پر مجبور ہوتی ہے، اس کے باوجود جب اللہ تعالیٰ نے اس کو باعث اجر قرار دیا تو دوسرے یتیم بچوں کے ساتھ حسن سلوک کا جو اجر ہوگا، وہ ظاہر ہے۔

یتیموں اور ناداروں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی کفالت و پرورش کی اہمیت اور اس کا باعث اجر ہونا رسول اللہ ﷺ نے کچھ اس طرح صحابہ کے ذہن میں بیٹھا دیا تھا کہ عہد نبوی میں اور اس کے بعد بھی غزوات اور جنگی مہمات کا تسلسل تھا، مسلمان مجاہدین کا سیل رواں مغرب اور مشرق کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا، ظاہر ہے کہ اس میں بہت سی جانیں کام آتی تھیں، بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں اور بچیوں کی کثرت تھی، ایک شخص شہید ہوتا تو وہ پورے خاندان کو بے سہارا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو جاتا، اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ مدینہ میں کئی یتیم خانے قائم کرنے پڑتے اور ایسے بے

سہارا بچوں اور عورتوں کی پرورش ایک بڑا مسئلہ بن جاتی؛ لیکن عملاً ایسا نہیں ہوا، یہ بے سہارا بچے، بچیاں اور خواتین مختلف خاندانوں کا حصہ بن گئیں، انہیں تنہائی اور بے سہارگی کا زخم نہیں سہنا پڑا، آج ہمارے معاشرہ میں ایسے بے آسرا لوگوں کی تعداد بحمد اللہ بہت کم ہے، قدرتی آفات کے موقع پر ایسے لوگوں کی تعداد کچھ بڑھ جاتی ہے؛ لیکن عام حالات میں اس کی نوبت کم آتی ہے؛ اس لئے ہونا تو یہ چاہئے کہ ایسے یتیم اور نادار بچوں کو مختلف لوگ اپنی اپنی کفالت اور پرورش میں لے لیں، وہ انہیں باپ کی محبت اور ماں کی ممتا دیں اور انہیں محرومی کے احساس سے بچائیں، یہ اس مسئلہ کا سب سے بہتر حل ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں انسان اپنے ساتھ خاندان کی قوت اور پشت پناہی محسوس کرتا ہے اور وہ بے سہارگی اور کس مپرسی کے احساس سے دوچار نہیں ہوتا؛ بشرطیکہ انہیں گھر کی نوکرانی اور خادمہ کی طرح نہیں رکھا جائے؛ بلکہ بیٹی بنا کر رکھا جائے۔

دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ مسلمان ایسی لڑکیوں کے لئے خود ادارے قائم کریں، اس میں یتیم بچیوں کے علاوہ نادار، لاوارث لڑکیاں اور بے سہارا مطلقہ و بیوہ خواتین کو بھی جگہ دی جائے، جو تعلیم حاصل کرنے کے لائق ہوں، ان کے لئے تعلیم اور ووکیشنل کورس کا بھی نظم ہو، مسلمانوں کے کچھ یتیم خانے گو مختلف شہروں میں موجود ہیں؛ مگر وہ ضرورت کے لحاظ سے بہت کم ہیں، جو ہیں ان کا نظم ونسق بہت زیادہ قابل اصلاح اور لائق توجہ ہے، خود یتیم خانہ کا لفظ بھی انسان کے جذبات کو ٹھیس پہنچاتا اور اس کے زخم کو کریدتا ہے، اگر اس کے بجائے کوئی عمومی انداز کا نام رکھا جائے، جو رہائشی سہولت کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہو تو یہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے زیادہ بہتر ہوگا، یتیم خانوں میں رہنے سہنے کا معیار ایسا بنانا چاہئے کہ وہاں رہنے والے اپنے آپ کو اپنے گھر میں محسوس کریں اور لڑکیوں کے ہاسٹل میں ایسے خدا ترس اور انسانیت دوست ذمہ دار ہونے چاہیں، جو شریعت کی حدود کو قائم رکھیں اور اجر وثواب کے نقطۂ نظر سے کام کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں۔

تیسری ضروری بات یہ ہے کہ بیوہ خواتین کے لئے خود روزگار اسکیمیں شروع کی جائیں، بعض دفعہ مائیں اپنی نادانی اور کسمپرسی کی وجہ سے لڑکیوں کو سرکاری نیز ہندو اور عیسائی اداروں کے حوالہ کر دیتی ہیں، اگر ان کے لئے ان کی صلاحیت کے لحاظ سے ووکیشنل کورس رکھے جائیں، انہیں روزگار سے جوڑا جائے اور انہیں آپ اپنی پرورش کے لائق بنایا جائے تو وہ خود اپنی ایسی یتیم و نادار

لڑکیوں کی پرورش کرلیں گی اورانہیں خاندان سے کٹ جانے کا احساس بھی نہ ہونے دیں گی۔

اگر ہم مسلم سماج میں یتیم اور نادارلڑکیوں کی پرورش اوران کی کفالت ونگہداشت کا جذبہ پیدانہیں کرسکے، ہم نے ان کی پرورش کے لئے ملی ادارے قائم نہیں کئے، مسلمان نوجوانوں نے اپنی دینی بہنوں کے ایمان کو بچانے کے لئے ان سے نکاح کرنے کی اہمیت کونہیں سمجھا، اور بے سہارا خواتین کے لئے خود روزگاری کے مواقع فراہم نہیں کئے گئے تو غیر مسلم لڑکوں سے مسلمان لڑکیوں کے نکاح کے تکلیف دہ واقعات سامنے آتے رہیں گے، تقریروں، مضامین اورفتوؤں کے ذریعہ ان واقعات کونہیں روکا جاسکتا، ان کو روکنے کے لئے منصوبہ بند کوشش اور متبادل انتظام کی ضرورت ہے، کیا ہماری دینی حمیت اورملی غیرت ایسے وقعات پر کروٹ لینے کو تیار ہے؟

۸/اگست ۲۰۰۸ء

مظلوموں کے ساتھ مل کر ظالموں کا مقابلہ

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء جب بھی کسی قوم میں آئے، تو عام طور پر ان کا سابقہ دو طبقوں سے پیش آیا، ایک ''ملأ قوم''، یعنی قوم کے سر برآوردہ لوگ، جن کو باعزت اور بلند مرتبت سمجھا جاتا، دوسرے وہ لوگ جن کو قرآن نے ''اراذل قوم'' یا ''مستضعفین'' سے تعبیر کیا ہے، یعنی قوم کے معمولی اور کمزور لوگ، جن کو سماج میں بے وزن اور کم حیثیت خیال کیا جاتا ہے، ہر نبی کی دعوت اپنی قوم میں ایک اجنبی دعوت کی حیثیت سے ابھرتی تھی، قوم کے سر برآوردہ لوگ اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہوجاتے تھے؛ البتہ ان میں جو لوگ حقیت پسند اور نیک خو ہوتے تھے، وہ اپنی بڑائی کو قربان کر نبی کی دعوت پر لبیک کہتے تھے ؛ لیکن ابتداءً ان کی تعداد بہت کم ہوتی تھی، جو لوگ معمولی سمجھے جاتے ان کو دعوتِ حق قبول کرنے میں کوئی عار نہ ہوتی، وہ پہل کرتے اور پھر ظلم و جور کی بھٹی میں تپائے بھی جاتے، غالباً یہ بھی نظام غیبی کے تحت ہوتا؛ کہ چونکہ وہ پہلے سے مظلوم و ستم رسیدہ ہوتے؛ اس لئے ان کے لئے ظلم وزیادتی اور تحقیر وتذلیل کا رویہ کسی درجہ میں قابل تحمل ہوتا۔

دعوت حق کو قبول کرنے میں سردارانِ قوم ہی اصل میں رکاوٹ بنتے ہیں، اہلِ مکہ نے آپ ﷺ کی کس قدر مخالفت کی، اس لئے نظامِ غیبی کے تحت غزوۂ بدر میں تمام سرداران مکہ جمع کر دئے گئے، اور وہ سب بدر میں ہلاک ہوئے، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑے تمہارے سامنے ڈال دئے ہیں، بدر کے بعد اہلِ مکہ کے دو ہی قابلِ ذکر سردار باقی رہ گئے، ابوسفیان بن حرب اور صفوان بن امیہ، اور ان دونوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا، مدینہ میں جو اسلام کی اشاعت آسانی کے ساتھ اور تیز رفتاری سے ہوئی، تو اس کی ایک وجہ وہی تھی جس کی طرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اشارہ فرمایا ہے کہ آپ کی بعثت سے

پہلے اوس وخزرج کی خانہ جنگی میں عبداللہ بن ابی کے علاوہ صفِ اوّل کے تمام قائدین لقمۂ اجل بن چکے تھے؛ اس لئے یہاں اسلام کے خلاف مزاحمت کرنے والی کوئی منظم طاقت موجود نہیں تھی، عبد اللہ بن ابی نے اپنے اندرونی نفاق کے ذریعہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی؛ لیکن انصارِ مدینہ پر نشۂ ایمانی چڑھ چکا تھا، کہ وہ کسی اور چیز کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، گویا خدا کے غیبی نظام کے تحت بعثت محمدی سے پہلے ہی سرداران مدینہ رخصت ہو چکے تھے اور مدینہ کی سرزمین اسلام کے لئے نرم وہموار ہو چکی تھی۔

یہی صورتِ حال مختلف انبیاء کرام کے ساتھ پیش آئی ہے، حضرت نوح علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو حق کی طرف بلایا تو یہی طبقہ ان کی دعوت پر ایمان لایا، جو لوگ ان کے معاند تھے وہ کہا کرتے تھے کہ ہم آپ پر کیسے ایمان لائیں، حالاں کہ نیچ لوگ آپ پر ایمان لائے ہیں؟ {قَالُوا أَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ} (الشعراء: ۱۱۱) شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے ''ارذلون'' کا ترجمہ ''کمینے'' سے کیا ہے، اس تعبیر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ اس طبقہ کو کتنی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، قرآن نے ایک اور مقام پر قومِ نوح کی اس تمسخر آمیز گفتگو کا ذکر کیا ہے، کہ سرداران قوم نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا کہ ہم کو تو آپ ہم ہی جیسے ایک انسان نظر آتے ہیں اور آپ کی اتباع ان لوگوں نے کی ہے جو ہم میں نیچ لوگ ہیں: {وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلاَّ الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا} (ہود: ۲۷)۔

ہم جس ملک میں رہتے ہیں، اس میں کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو ''ملأ قوم'' بنا رکھا ہے، اور لوگوں کے ذہن میں یہ عقیدہ بسا دیا ہے کہ وہ فرمانروائی اور حکمرانی ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں؛ کیوں کہ ان کی پیدائش خدا کے سر اور بازؤں سے ہوئی ہے، وہ خدا اور بندہ کے درمیان واسطہ ہیں، ایک بہت بڑی قوم کو انہوں نے پیدائشی غلام بنا رکھا ہے، اور ان کے دل ودماغ میں یہ بات بیٹھا دی ہے کہ وہ نیچ اور کم تر ہیں، وہ دوسروں کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، پہلا طبقہ برہمنوں اور اونچی ذات کے لوگوں کا ہے جن کا عددی تناسب بہت معمولی ہے؛ لیکن وہ ملک میں ۶۵ فیصد کلیدی عہدوں پر قابض ہیں اور اقتدار کے در وبام پر ان کا ایسا قبضہ ہے کہ کوئی پتہ ان کی مرضی ومنشاء کے بغیر حرکت نہیں کر پاتا، یہی قرآن کی اصطلاح میں اس ملک کے ملأ قوم ہیں، جن

کا عمومی مزاج یہی ہے کہ جب تک حالات کے ہاتھوں مجبور نہ ہو جائیں عدل وانصاف اور سچائی کے سامنے سرخمیدہ نہیں ہوتے۔

دوسرا طبقہ ''دلت'' کا ہے، یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن میں ''اراذل قوم'' کی تعبیر آئی ہے کہ لوگ انہیں نیچ، گنوار اور کم تر خیال کیا کرتے تھے، ہندوستان میں یہ قوم ہزاروں سال سے ظلم وجور کی چکی میں پیسی جارہی ہے اور انتہائی غیر انسانی رویہ کا شکار ہے، اب جب کہ سیاسی مصلحتوں کے تحت کسی قدر ان کی آؤ بھگت ہو رہی ہے، انہیں تحفظات دیئے جا رہے ہیں، الیکشن کے موقع پر انہیں منانے کی کوشش کی جاتی ہے، پھر بھی سماجی زندگی میں وہ ایک باعزت قوم کا مقام حاصل کرنے میں ناکام ہیں، اگر وہ گھڑے کو ہاتھ لگا دیں تو اس پانی کو پھینک دیا جاتا ہے، وہ کسی برہمن کے دوش بدوش بیٹھ کر کھا نہیں سکتے، اس ملک میں اعلیٰ ترین انتظامی قابلیت رکھنے کے باوجود جگ جیون رام ملک کے وزیر اعظم نہیں بن سکے؛ کیوں کہ وہ اچھوت قوم سے تعلق رکھتے تھے، ہندو قوم میں عقیدہ کے درجہ میں یہ تصور موجود ہے کہ یہ لوگ خدا کے پاؤں سے پیدا کئے گئے ہیں، اور ان کا کام ہی اونچی ذات کے لوگوں کی خدمت ہے، اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ چوں کہ آپ بہت ہی حقیر اور نیچ ہیں، اس لئے میں آپ کو فلاں سہولت دے رہا ہوں، تو بتایئے کہ یہ بجائے خود کس درجہ رسوا کن اور ذلت آمیز بات ہے!

جو لوگ مظلوم، دبے کچلے، اور دبائے ہوئے ہوں، ان کی مدد کرنا مسلمانوں کے لئے صرف سیاسی مصلحت نہیں؛ بلکہ دینی اور ملی فریضہ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''تمہیں کیا ہوا کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان لوگوں کے واسطے نہیں لڑتے جو مغلوب ہیں، مرد، عورتیں اور بچے'' (النساء:۷۵)

قرآن نے یہاں مغلوبوں کے لئے ''مستضعفین'' کا لفظ استعمال کیا ہے، یعنی وہ لوگ جن کو دبایا گیا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ دلت بھی اس ملک کے ''مستضعفین'' ہیں تو شاید بے جا نہ ہو؛ اس لئے ان کو ساتھ لینا اور اس ملک کے ظالموں کو مشترک تدبیر کے ذریعہ ظلم سے باز رکھنا ہمارا اسلامی فریضہ ہے، بدقسمتی سے ہم نے اس اہم کام کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجہ نہیں دی؛ بلکہ ہندوؤں کی اونچی برادری سے متاثر ہو کر ان کے ساتھ کم وبیش وہی رویہ اختیار کیا؛ بلکہ ہم نے خود اپنی قوم میں

بھی مختلف دیواریں کھڑی کرلیں، بعض اوقات یہ دیواریں اتنی اونچی ہوجاتی ہیں کہ پاس کا آدمی نظر نہیں آتا۔

اس صورت حال نے ہمیں دوہرا نقصان پہونچایا ہے، ایک تو اس ملک میں دعوت اسلام کا کام نہ ہونے کے درجہ میں ہے، اگر ہم اس طبقہ سے قریب ہوتے تو دعوت کے وسیع مواقع پیدا ہو سکتے تھے، ہر قوم میں دعوتِ حق کی فطری ترتیب یہی رہی ہے، کہ پہلے ایسے مستضعفین نے اس پر لبیک کہا ہے، پھر جب ان کی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کرلیا تو بالآخر جو طبقہ انہیں نیچ گردانتا تھا، اس کے لئے بھی حلقہ بگوش اسلام ہونے کے سوا چارہ نہیں رہا، پہلے مکہ کے غلاموں نے اسلام قبول کیا، پھر اہلِ مدینہ نے، آخر ایک وقت ایسا آیا کہ سردارانِ مکہ بھی اسلام لانے پر مجبور ہوئے۔

اسلام کی بنیادی تعلیم وحدتِ الٰہ اور وحدتِ انسانیت ہے، یعنی خدا ایک ہے اور تمام انسانیت ایک ہے، کالے، گورے، عرب، عجم کی کوئی تفریق نہیں، ایک ہی مسجد میں سب کو خدا کی عبادت کرنی ہے، جو شخص دین سے زیادہ واقف اور عمل کے اعتبار سے زیادہ صاحبِ تقویٰ ہو، وہ نماز میں امام ہوگا، خواہ کسی خاندان کا ہو، اور اس کی چمڑی کا رنگ کیسا بھی ہو، انسانوں کا کوئی طبقہ خدا اور انسانوں کے درمیان واسطہ نہیں؛ بلکہ ہر انسان براہِ راست خدا سے مانگتا اور خدا سے پاتا ہے، یہ انسانی مساوات کا تصور اتنا فطری اور مبنی بر انصاف ہے کہ جن قوموں کو نیچ سمجھا جاتا ہے وہ اس کو اپنے لئے بہت بڑی رحمت باور کرتی ہیں، اگر اسلام کے اس عظیم اصولِ زندگی کو ان محروم و مظلوم لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا تو ممکن نہیں تھا کہ وہ اس سے متاثر نہیں ہوں، اور اس ابرِ رحمت کے سایہ میں آنے سے انکار کریں، مگر افسوس، اور صد ہزار افسوس! کہ ہم نے کبھی سنجیدگی سے اس کام کی طرف توجہ نہیں دی۔

اس سے دوسرا نقصان سیاسی ہوا، آج سیاسی اعتبار سے ہم خود اچھوت ہیں، ہماری آبادی کے تناسب اور قومی اداروں میں ہماری تعداد کے درمیان کوئی نسبت نہیں، اگر مسلمان اس طبقہ کو اپنے ساتھ لینے میں کامیاب ہوجاتے، جن کی تعداد ملک میں ساٹھ، پینسٹھ فیصد سے کم نہیں، تو اگر ہم بادشاہ نہیں ہوتے تو بادشاہ گر ضرور ہوتے، جو لوگ اس ملک میں مسلمانوں کے خلاف فسادات کراتے ہیں اور فسادات کی منصوبہ بندی کرتے ہیں، وہ دلت ہی کو اپنا ہتھیار اور آلۂ کار بناتے

ہیں، اگر ہم انہیں قریب کرلیں تو ہم ان کے ہاتھ سے ان کے ہتھیار چھیننے میں کامیاب ہوجائیں۔

وقت ابھی بھی گیا نہیں ہے، اور ہمیں اس پہلو پر پوری گہرائی کے ساتھ سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے، موجودہ حالات میں ایک منصوبہ کے ساتھ اس طبقہ کو قریب کرنا چاہئے، مسلمان قائدین اور سیاسی تنظیموں کو چاہئے کہ دلت سیاسی وسماجی قائدین کے ساتھ تبادلۂ خیال کریں، انہیں قریب کریں، اور ان کی ذہن سازی کریں، یوپی کے حالیہ الیکشن میں اس کا کامیاب تجربہ کیا گیا، گو بعض سیاسی لیڈروں کی مفاد پرستی اور اقتدار کی بڑھتی ہوئی حرص کی وجہ سے مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں ہو سکا؛ لیکن اس کے باوجود یہ ضرور ہے کہ بی جے پی کو سخت صدمہ پہونچا، اور اس کی وجہ سے پورے ملک میں اس کی ساکھ متاثر ہوئی؛ اس لئے مسلمان قائدین کو اعلیٰ سطح پر دلت قائدین سے ربط قائم کرنا چاہئے، یہ وقت کی نہایت اہم ضرورت ہے! سماجی سطح پر بھی دلت طبقہ سے رابطہ استوار کرنا ضروری ہے، مسلمان خوشی وغم کے مواقع پر ایسی تقریب رکھیں، جن میں انہیں مدعو کریں، شادی بیاہ کے موقع پر انہیں تحفے دیں، مسلمانوں کے زیرِ انتظام اسکولوں میں انہیں داخلے دیا کریں، اور جو ممکن ہو ان کے ساتھ رعایت کریں، دعوتوں میں ان کے ساتھ کھائیں، پئیں، ان کو بھائی، بہن، چچا، خالہ کہہ کر مخاطب کریں، ایسے الفاظ کے ساتھ ان سے خطاب نہ کریں، یا ان کا ذکر نہ کریں جن سے تذلیل وتحقیر کی بو آتی ہو، موقع بموقع اسلام کی مساوات کی تعلیم کو ان کے سامنے رکھیں، اگر ہم اپنے رویہ کو ان کے ساتھ درست کرلیں، تو ان شاء اللہ وہ جلد اور بہت آسانی کے ساتھ آپ کی طرف راغب ہوجائیں گے، ایک ایسی قوم جو انسان تسلیم کئے جانے کے لئے جد وجہد کررہی ہے، اس سے تھوڑی سی محبت بھی دل جیتنے کے لئے کافی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ہم اس معاملہ کی اہمیت کو محسوس کریں اور ایک ٹھکرائی ہوئی قوم کو سینہ سے لگائیں، اور انہیں محبت کی سوغات دیں، اس میں ہماری جان و مال کی حفاظت ہے، عزت وآبرو کا تحفظ ہے، سیاسی حقوق کا تحفظ ہے اور سب سے بڑھ کر اس سے دعوت کے وسیع مواقع حاصل ہوسکتے ہیں۔

۱۲ / دسمبر ۲۰۰۸ء

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی

آج یوم مزدور ہے، دنیا میں جو کچھ بہار نظر آتی ہے، اس میں مزدوروں کا خونِ جگر شامل ہے، ہرے بھرے باغات ہوں، میٹھے اور رسیلے پھلوں کے خوشے لٹکے ہوئے ہوں، سرسبز و شاداب کھیتیاں دل ونگاہ کے سرور کا سامان بنتی ہوں، بلند و بالا اور جاذب نگاہ عمارتیں دعوت نظارہ دیتی ہوں، کارخانوں کی فلک بوس چمنیاں اور انسانوں کو ایک سے ایک سہولت فراہم کرنے والی مشنریز ہوں، یا سمندر کا جگر چیرنے اور ہواؤں کے دوش پر اڑنے والے جہاز ہوں، ہر ایجاد اور ہر سہولت کے رگ وریشہ میں مزدوروں کے پسینے کی خوشبو اوران کی جد و جہد کے خون کی سرخی موجود ہے؛ مگر یہ عجیب بات ہے کہ جن ہاتھوں سے خوب صورت اور بلند بالا عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں، وہ خود زندگی بھر چھت کے سایہ سے محروم رہتی ہیں، اس کے مقدر میں فٹ پاتھ کے سینے اور آسمان کے سائے کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہوتی، جو لوگ جہاز کے کل پرزے جوڑتے ہیں، وہ جہاز بنانے کے بعد اس کے اندر داخل ہونے کے لئے بھی ترستے رہتے ہیں، باغ کی سینچائی اور کھیت کی سیرابی جن کی رہین منت ہے، وہ خود ان پھلوں اور کھیتیوں کا لطف اٹھانے سے محروم رہتے ہیں۔

یہ سرمایہ دارانہ نظام کا تاریک ترین پہلو ہے، جس میں دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہوتی جاتی ہے، دولت مندوں اور غریبوں کے درمیان معاشی فاصلے بڑھتے رہتے ہیں اور غریب غریب تر ہوتا جاتا ہے، گلوبلائزیشن کا عمل شروع ہونے کے بعد سرمایہ داروں کی طرف سے محنت کاروں کے استحصال کا سلسلہ بڑھتا جا رہا ہے، بڑی کمپنیاں چھوٹے صنعت کاروں، مقامی تاجروں اور کاشت کاروں کے وجود کو ہضم کرتی جا رہی ہیں؛ یہاں تک کہ کم یافت لوگوں کے لئے سبزی ترکاری کی دکان لگانا بھی مشکل ہو گیا ہے اور اس پر بھی بڑی بڑی کمپنیوں نے قبضہ کر لیا ہے، وقتی طور پر یہ کمپنیاں نسبتاً سستے داموں پر چیزیں فراہم کرتی ہیں؛ لیکن مستقبل میں اس کے نقصانات ناقابل

تلافی ہوجائیں گے ؛ کیوں کہ ایک طرف کم آمدنی والے لوگوں کے لئے روزگار کے وسائل محدود ہوجائیں گے ، دوسری طرف جب اشیاءِ ضرورت ایک دو ہاتھوں تک محدود ہوجائیں گی ، تو بازار میں مسابقت کے ختم ہوجانے کی وجہ سے من مانی قیمتیں لگائی جائیں گی اورعوام انہیں قیمتوں میں خریدنے پر مجبور ہوجائیں گے ، جیسا کہ اس وقت سیمنٹ کی صورت حال ہے ، سرمایہ دارانہ قوتیں جس تیزی سے وسائل معیشت پر قابض ہورہی ہیں ، وہ انقلابِ فرانس اور روس کے کمیونسٹ انقلاب کی یاددلاتے ہیں ؛ کیوں کہ '' تنگ آمد ، بجنگ آمد '' انسانی فطرت ہے ۔

ان حالات میں ضرورت ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کو لگام دی جائے ، وسائل معیشت کو چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے سے روکا جائے اور سرمایہ اور محنت کو مساوی حیثیت دی جائے ، سرمایہ دنیا میں پائی جانے والی اشیاء کا نام ہے ، اور محنت انسان کے وجود کا اور اس کی براہ راست کاوشوں کا نتیجہ ہے ، یہ بات کتنی عجیب ہے کہ لوہے اور پتھر کی قیمت تو زیادہ ہو اور خود انسان کو کم قیمت سمجھا جائے ۔

اسلام اشتراکی نظام کی طرح اس بات کا قائل نہیں کہ انسان کسی چیز کا مالک نہیں ہوسکتا ، وہ کوئی روبوٹ نہیں ہے ، جو دوسرے کے ارادے کے تحت حرکت کرے اور خود جذبات واحساسات اور خواہشات سے خالی ہو ؛ کیوں کہ یہ بالکل غیر فطری بات ہے ، اگر شیرخوار بچہ کے ہاتھ میں مٹھائی کا ٹکڑا ہو اور دوسرا بچہ چھین کر اس میں سے کھالے تو وہ رونے لگتا ہے ، گویا اس کے اندر بھی یہ احساس پایا جاتا ہے کہ وہ تنہا اس شئ کا مالک ہے ، کسی اور کو اس میں سے لینے کا حق نہیں ؛ اس لئے اشتراکیت کا یہ تصور کہ افراد ذاتی طور پر کسی چیز کے مالک نہیں ہیں ، ہر شئ حکومت اور سماج کی ملکیت ہے ، غیر فطری سوچ ہے ؛ لیکن سرمایہ دارانہ نظام میں دولت مند کا یہ جذبہ کہ تنہا وہی پوری دنیا کا مالک ہوجائے ، چاہے سارے لوگ ننگے ، بھوکے اور محروم رہیں ، بھی انسانی فطرت کے خلاف ہے ، یہی وجہ ہے کہ ایک فاقہ مست کا تڑپنا ، ایک بیمار کا سسکنا اور ایک غریب مرد یا عورت کا اپنی ضرورتوں کے لئے بلکنا انسان کو بے قرار کردیتا ہے ؛ بشرطیکہ واقعی اس کے سینے میں دل ہو اور اس کی فطرت بالکل مسخ نہ ہوگئی ہو ؛ اس لئے اسلام چاہتا ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ رہ جائے ؛ بلکہ اس کی زیادہ سے زیادہ تقسیم عمل میں آئے اور سرمایہ داروں کے ساتھ ساتھ محنت کاروں کو بھی ان

کی محنت کا پھل ملے، یقینا یہی وہ منصفانہ فکر ہے، جس میں انسانیت کی فلاح ہے اور جس سے باہمی نفرت وحسد کا جذبہ بھی سرد ہوسکتا ہے۔

اسی لئے اسلام میں مزدوروں کے حقوق کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے غلاموں کے جو حقوق بیان کئے ہیں، ان سے مزدوروں کے حقوق پر روشنی پڑتی ہے:

" إن إخوانک خولکم ، جعلهم الله تحت أيديكم ، فمن كان أخوه تحت يده فليطعمه مما يأكل ، وليلبسه مما يلبس ، ولا تكلفوهم ما يغلبهم ؛ فإن كلفتموهم ما يغلبهم فأعينوهم "

(صحيح البخاری ، كتاب العتق ، باب قول النبی ا : العبيد إخوانكم فأطعموهم مما تأكلون ، حدیث نمبر: ۲۴۰۷)

''خول'' (یعنی تمہارے ہاتھ کے نیچے کام کرنے والے) تمہارے بھائی ہیں، حق تعالیٰ نے ان کو تمہارے ہاتھ کے نیچے ڈال دیا ہے، پھر جس کا بھائی کسی کے ہاتھ کے نیچے پڑ جائے تو چاہئے کہ جو خود کھاتا ہو اسے کھلائے اور جو خود پہنتا ہو اسے پہنائے اور ان پر اتنا کام نہ لادے ، جو ان کو مغلوب کردے اور اگر ان پر بار ڈالو تو ان کی مدد واعانت کرو''

معروف محقق مولانا سید مناظر حسن گیلانیؒ کے اخاذ اور نکتہ سنج ذہن نے اس حدیث سے جو نکات اخذ کئے ہیں، وہ ذکر کئے جانے کے لائق ہیں؛ چنانچہ فرماتے ہیں:

۱) مزدور اور جو مزدوری پر لوگوں سے کام لیتے ہیں، آنحضرت ﷺ کا منشاء ہے کہ ان کو وہ اپنا بھائی خیال کریں، اور دونوں میں تعلقات کی نوعیت ایسی ہو جیسے بھائی بھائی میں ہوتی ہے۔

۲) کم از کم کھانے، پینے، رہنے سہنے کی حد تک دونوں کی معاشی سطح برابر ہو، جو خود کھائے وہ مزدور کو کھلائے اور جو خود پہنے وہ مزدور کو پہنائے، اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اجرت کے معاملہ میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ یعنی کم از کم اتنی اجرت تو بہر حال ہر مزدور کو ملنی چاہئے کہ کھانے اور پہننے کی حد تک وہ اپنے

مالک کے برابر ہوجائے، مزدوری کی شرح اگر آج اتنی بھی بلند کردی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ شورش کی کمی کی بہت حد تک توقع کی جاسکتی ہے۔

(۳) وقت اور کام دونوں کے حساب سے مزدوروں پر اتنا بوجھ نہ لادا جائے، جو ان کو مغلوب کر کے تھکا دے، ''**تکلفوهم مايغلبهم**'' یہ ایسا فقرہ ہے کہ جس سے موجودہ زمانے میں وقت اور کام کی نوعیت کے مسئلہ کو طے کیا جاسکتا ہے۔

(۴) اور اگر کوئی کام ایسا پیش آجائے جس کی انجام دہی میں مزدوروں کو دشواری پیش آرہی ہو تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اس کام کو نہ کرایا جائے، اور نہ یہ مطلب ہے کہ خواہ مزدور پر کچھ ہی گذر جائے؛ لیکن بہر حال اس سے وہ کام لیا ہی جائے؛ بلکہ ایسی صورت میں یہ کام کرنا چاہئے کہ مزدور کی اعانت مزید قوت سے کی جائے ''وأعينوهم'' کا یہی مطلب نہیں ہے کہ خود اس کام میں لگ جائے؛ بلکہ یہ بھی ہے کہ بہر حال مزید قوت سے مزدور کی اعانت کی جائے، میں سمجھتا ہوں کہ ''محنت اور سرمایہ'' کے جتنے جھگڑے اس زمانے میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، مندرجہ بالا حدیث کے ذریعہ اس کا حل پیدا کیا جاسکتا ہے۔

(اسلامی معاشیات: ص: ۳۶۳-۳۶۴)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے مزدوروں کو اس کی پوری اجرت دینے کا حکم دیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ میں قیامت کے دن تین آدمی کے مقابلہ فریق بن کر کھڑا ہوں گا، ان میں سے ایک اس شخص کا ذکر کیا گیا جو کسی کو مزدور رکھے، اس سے کام تو پورا لے لے؛ لیکن مزدوری ادا نہ کرے: ''**رجل استأجر أجيرا فاستوفى منه ولم يعطه أجره**'' (صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب إثم من باع حرا، حدیث نمبر: ۲۱۱۴) آپ ﷺ نے یہ بھی تاکید فرمائی کہ مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی اجرت دے دو: ''**أعط الأجير أجره قبل أن يجف عرقه**'' (سنن ابن ماجة، کتاب الرهون، باب أجر الأجراء، حدیث نمبر: ۲۴۴۳)۔

مزدوروں کے حق کے سلسلہ میں ایک اہم بات — جس کو رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا ہے — یہ ہے کہ مزدور جس خدمت کو انجام دے اور جو اسباب اس کے ذریعہ وجود میں آئیں، ان میں

بھی اس کو حصہ دیا جانا چاہئے ؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ہدایت دی: "**أعطوا العامل من عمله**" (مسند أحمد، حدیث نمبر: ۸۵۸۹) — اسی طرح ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تمہارا خادم اگر تمہارا کھانا تیار کرے اور لے کر تمہارے پاس آئے اور گرمی، دھویں کو اس نے برداشت کیا تھا تو چاہئے کہ اپنے ساتھ اس کو بٹھالو، اور کھانے پر زیادہ آدمی ہوں تو پھر خادم کے ہاتھ میں کھانے کی کچھ چیز اٹھا کر رکھ دو، ایک لقمہ یا دو لقمے: "**إذا صنع لأحدكم خادمه طعامه ثم جاء ه به ...**" (**صحيح مسلم، كتاب الأيمان، باب إطعام المملوک مما يأكل ...**، حدیث نمبر: ۱۶۶۳)

رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات سے جو بات واضح ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ مزدور کی محنت سے جو پیداوار حاصل ہو اس میں اس کا بھی حصہ ہونا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ وہ زندگی بھر مکان تعمیر کرتا رہے اور اس کو سر چھپانے کی جگہ بھی نہ مل سکے۔

اسلام میں معاملات کی بعض ایسی صورتیں بھی رکھی گئی ہیں، جن میں محنت کار سرمایہ دار کے ساتھ پیداوار میں شریک ہوتا ہے، اور اگر پہلے سے معاہدہ ہو جائے تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ محنت کرنے والے کا حصہ پیداوار میں سرمایہ دار سے زیادہ ہو جائے، یہ معاملات ہیں: مضاربت، مزارعت اور مساقات، — مضاربت میں ایک شخص کا سرمایہ ہوتا ہے اور دوسرے شخص کی محنت ، اور تجارت سے حاصل ہونے والے نفع میں دونوں کی شرکت ہوتی ہے، مزارعت میں ایک شخص کی زمین ہوتی ہے، دوسرا شخص کاشت کرتا ہے، اور زرعی پیداوار میں دونوں شریک ہوتا ہے، مساقات میں ایک شخص کی زمین ہوتی ہے، دوسرا شخص شجر کاری کرتا ہے، اور پیداوار میں دونوں شریک ہوتے ہیں، ان دونوں صورتوں کو عرف عام میں "بٹائی داری" کہتے ہیں، ان معاملات کا بنیادی تصور یہ ہے کہ محنت کرنے والے کو بھی پیداوار میں شریک مانا جائے، اگر مزدوروں کے حقوق میں اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ وہ جس کارخانہ یا جس پروجیکٹ میں کام کریں گے، اس میں کسی خاص حد تک ان کا شیئر تسلیم کیا جائے گا، گو اس کی وجہ سے اس کی شرح مزدوری کچھ کم ہو جائے، تو اس طرح مزدوروں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا مداوا ہو سکے گا، بہ قول علامہ اقبال:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

کاش! مزدوروں کی محبت کا نام نہاد نعرہ لگانے والی اور یوم مزدور منانے والی دنیا اسلام کی منصفانہ تعلیم کی طرف رجوع کرے تو مزدوروں کے ساتھ بھی حقیقی بھلائی ہو اور سماج میں دولت و غربت کے فرق کی وجہ سے بڑھتا ہوا تصادم بھی دور ہو جائے۔

یکم مئی ۲۰۰۹ء

تقسیم کار نہ کہ اختلاف وتصادم

اتحاد واتفاق مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے، اس سے شاید ہی کسی ذی شعور شخص کو انکار ہو، عالمی سطح پر بھی اور خود ہمارے ملک میں بھی باہمی اختلاف و انتشار نے مسلمانوں کو جو نقصان پہونچایا ہے، شاید ہی ہمارے دشمنوں نے بھی ہم کو اس قدر نقصان پہونچایا ہو، ہماری عداوت نے ایسے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے، جو دریا کے دو کنارے ہیں اور جن کے ایک دوسرے سے ملنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، اسلام اور مسلمانوں کی عداوت کے مشترک ایجنڈے نے ایسی قوموں کو ایک دوسرے کا ہم نوا بنا دیا ہے، جن کے مذہب وعقیدہ کی بنیاد ہی ایک دوسرے کی مخالفت اور عناد پر ہے، جیسے: یہودی اور عیسائی، مگر افسوس کہ ہمارے بدخواہوں کا اتحاد بھی ہمیں متحد کرنے سے قاصر ہے۔

اس لئے اتحاد کی اہمیت کو واضح کرنا، پڑھے ہوئے سبق کو دہرانے اور سورج کی روشنی میں چراغ جلانے کے مترادف ہے، مگر اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اتحاد کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے اور اختلاف سے کس طریقہ پر بچا جا سکتا ہے؟ یا کم سے کم اختلاف کو اخلاقی حدود کے باہر جانے سے روکا جا سکتا ہے؟ —— اس سلسلہ میں اس حقیر کے خیال میں ایک بنیادی بات یہ ہے کہ مسلمان مختلف تنظیموں اور اداروں کے طریقۂ کار اور طریقۂ خدمت کو اختلاف کار کے بجائے تقسیم کار سمجھنے کا مزاج پیدا کریں۔

امت کی مختلف ضروریات ہیں، اس کی ضروریات دینی میں تعلیم کا نظم بھی ہے اور عصری تعلیم کا انتظام بھی، علم وتحقیق کے سلسلہ کو جاری رکھنا بھی ہے، اور دعوت وتبلیغ دین بھی ضروری ہے، پھر دعوت مسلمانوں میں بھی ضروری ہے اور غیر مسلم بھائیوں میں بھی، جہاں امر بالمعروف کی ضرورت ہے، وہیں منکرات وفواحش سے روکنا اور معاشرہ کی اسلامی اصولوں پر تشکیل بھی کچھ کم

ضروری نہیں، خدمت خلق کے میدان کو تو مسلمانوں نے گویا بالکل ہی چھوڑ رکھا ہے؛ حالاں کہ یہ دین کا نہایت اہم شعبہ ہے، معاشی اعتبار سے مسلمانوں کو آگے بڑھانا اور ان کے لئے روزگار اور اقتصادی ترقی کے مواقع فراہم کرنا بھی نہایت ضروری ہے ؛ کیوں کہ فقر و افلاس قوموں کو کفر و ارتداد تک پہونچا دیتا ہے، ان سب کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی ایک اہم ترین ضرورت سیاست میں حصہ داری ہے، اگر عوامی اداروں میں مسلمان نمائندے موجود نہ ہوں تو اس ملک میں ان کے لئے اپنے مفادات کا تحفظ اور بحیثیت ملت کے اپنے وجود کو باقی رکھنا مشکل ہو جائے گا، اس طرح کے اور کام بھی ہیں، جن کی امت مسلمہ کو ضرورت ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے مختلف افراد اور گروہوں میں الگ الگ صلاحیتیں رکھی ہیں، اکثر لوگ اپنی صلاحیت کے لحاظ سے میدانِ کار کا انتخاب کرتے ہیں اور یہی کام کرنے کا مناسب طریقہ ہے، تقسیم کار کو نہ سمجھ پانے کے دو غلط اثرات مرتب ہوتے ہیں، ایک یہ کہ ایک شخص یا جماعت یا تنظیم و ادارہ خیال کرنے لگتا ہے کہ صرف اسی کا کام دینی کام اور دینی خدمت ہے، دوسرے لوگ جو کام کر رہے ہیں، وہ یا تو دین ہے ہی نہیں، یا دین کی کم تر درجہ کی خدمت ہے، وہ دوسرے کاموں کو کم نگاہی سے دیکھتا اور فضول و بے فائدہ خیال کرنے لگتا ہے؛ حالاں کہ یہ خدا کی پیدا ہوئی فطرت کے بھی خلاف ہے اور اسلام کے مزاج کے بھی۔

غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی مختلف ضرورتوں کے لئے الگ الگ عضو کو پیدا کیا ہے، آنکھ دیکھتی ہے، سونگھ نہیں سکتی، زبان بولتی ہے، دیکھ نہیں سکتی، ہاتھ پکڑنے کے لئے ہے اور پاؤں چلنے کے لئے، دل خون کو پمپ کرتا اور اسے گردش میں رکھتا ہے اور دماغ فیصلے کرتا اور پورے جسم پر اپنے حکم چلاتا ہے، کبھی آنکھ کو یہ خیال نہیں پیدا ہوا کہ وہ زبان کی طرح تقریر کے دریا بہائے اور کبھی ناک نے یہ کوشش نہیں کی کہ وہ آنکھ بن جائے ؛ تا کہ شاعروں کی توجہ کا مرکز بن سکے، یہی تقسیم کار پوری کائنات میں جاری و ساری ہے، ہر پودے کی الگ خصوصیات ہیں، ہر جانور کی اپنی پہچان ہے اور ہر شی کی الگ الگ شناخت ہے، لکڑی سے پانی کا کام نہیں لیا جا سکتا، آگ سے پانی کی ضرورت پوری نہیں ہو سکتی۔

یہی تقسیم کار انسان کی عملی صلاحیتوں میں بھی ہے، ایک شخص تقریر کے ذریعہ مجمع کا دل اپنی

مٹھی میں لے لیتا ہے؛ لیکن دو سطریں لکھ نہیں سکتا، ایک آدمی ایسا قلمکار ہے کہ پوری دنیا میں اس کے زورِ قلم کی دھوم مچی ہوتی ہے؛ لیکن بولنے پر قادر نہیں، ایک شخص صحافت کے میدان میں لوگوں کی داد وتحسین حاصل کرتا ہے اور ایک کو سیاست کے میدان میں دادِ شجاعت ملتی ہے، کوئی معرکۂ تحقیق کا شہ سوار ہے اور کوئی میدان دعوت وتبلیغ کا درِ تابدار، ان میں سے ہر شخص اگر اپنے اپنے میدان میں رہ کر امت کی خدمت انجام دے اور دوسرے کے کام کو بھی قدر و وقعت کی نظر سے دیکھے تو اس سے بڑا فائدہ ہوگا، خود اس کا بھی اور امت کا بھی۔

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ ؓ کی صلاحیت اور ان کی استعداد کو دیکھتے ہوئے انہیں کام حوالہ کیا، جنگ کے میدان میں دادِ شجاعت دینے کا موقع تھا تو حضرت خالد بن ولید ؓ اور حضرت ابوعبیدہ ؓ کو بھیجا، رفقاء کی خدمت اور دعوت دین کا مرحلہ تھا تو حضرت علی ؓ، حضرت صہیب رومی ؓ اور حضرت معاذ ؓ کو بھیجا، بعض صحابہ ؓ کو تعلیم وتعلم کی خدمت سپرد کی، بعض وحی لکھنے پر مامور کئے گئے، اور بعض سے انتظامی امور متعلق کئے گئے، غرض مختلف صحابہ ؓ کو مختلف ذمہ داریاں دی گئیں، جس کو جو ذمہ داری دی گئی، اس نے بسر وچشم اسے قبول کیا، اور دل وزبان کی رفاقت کے ساتھ اس پر لبیک کہا؛ لیکن کبھی اس نے اپنے ساتھی کے کام کو حقیر اور غیر اہم نہ سمجھا اور نہ کہا؛ بلکہ ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی کی خدمت کو اپنی خدمت سے بڑھ کر اور زیادہ اہم سمجھتا تھا؛ مگر موجودہ دور میں صورت حال اس کے برعکس ہے، جو شخص، جو ادارہ یا جو جماعت جس میدان میں کام کر رہی ہے، وہ سمجھتی ہے کہ دوسروں کا کام غیر اہم یا کم اہم ہے اور اصل خدمت دین وہی ہے جو ہم کر رہے ہیں، اس سے محبت کی بجائے نفرت، باہمی تعاون کی بجائے ایک دوسرے کی مخالفت اور ایک دوسرے کے تئیں احسان مندی اور ممنونیت کے بجائے بغض وعناد کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔

دوسرا غلط اثر یہ پڑتا ہے کہ مختلف افراد اور تنظیمیں اپنی صلاحیت کے میدان سے ہٹ جاتی ہیں اور جو مفید خدمات ان کے ذریعہ انجام پاسکتی تھیں، امت ان سے محروم ہوجاتی ہے، اگر ایک اچھا ڈاکٹر مریضوں کا علاج کرنے کے بجائے مکان کی تعمیر کا مشورہ دینے لگے، ایک ماہر انجنیئر کو عدالت میں مقدمات کی پیروی پر مامور کر دیا جائے اور ایک کامیاب وکیل مریضوں کے لئے دوائیں لکھنے لگے تو اس بدقسمت شخص کے مکان، اس مظلوم کے مقدمہ اور اس کم نصیب مریض کی

صحت کا جو حال ہوگا، وہ محتاج اظہار نہیں، بعض دفعہ ایسی ہی صورت حال قومی واجتماعی سطح پر پیدا ہوجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ''تقوی والوں'' کی ایک صفت بیان فرمائی ہے: {وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ} (البقرۃ: ۳)—— بعض مفسرین نے اس سے مالی انفاق یا زکوۃ مراد لیا ہے، اور بعض کے نزدیک اس کی مراد میں عموم ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے جس بندہ کو جو کچھ میسر فرمایا ہے، وہ اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، خیال ہوتا ہے کہ اس میں انسانی صلاحیتیں اور لیاقتیں بھی داخل ہیں، ہر انسان کے اندر کوئی نہ کوئی امتیازی صلاحیت اور خصوصی لیاقت موجود ہوتی ہے، انسان کو چاہئے کہ اپنی اس خصوصی صلاحیت کو پہچانے اور اس کو اللہ کی رضاء اور دین کی حفاظت واشاعت اور تائید وتقویت نیز قوم وملک کی فلاح بہبود کے لئے استعمال کرے، وہ اپنی اس صلاحیت کے ذریعہ امت کو زیادہ فائدہ پہونچا سکتا ہے، اور صلاحیت مفقود ہونے کے باوجود کسی کام کو انجام دینے سے امکانی طور پر جو نقصان ہوسکتا ہے، قوم اس محفوظ رہتی ہے۔

اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان آپسی ٹکراؤ سے محفوظ رہتا ہے، کام کے بعض میدان ایسے ہیں جن میں مواقع محدود ہوتے ہیں، ان میں اگر ایک سے زیادہ افراد کود پڑیں تو تصادم کی نوبت آجاتی ہے، جیسے: سیاست کا میدان، ایک ہی حلقہ میں اگر دو مسلمان امیدوار کھڑے ہوں، تو تصادم یقینی ہے اور قوت برداشت کی کمی کی وجہ سے یہ ٹکراؤ بعض اوقات تلخی اور کڑواہٹ کا سبب بن جاتی ہے، اس کے برخلاف کام کے بہت سے میدان ایسے ہیں، جن میں غیر محدود مواقع ہیں اور کوئی ٹکراؤ نہیں، جیسے: تعلیم کا میدان، اس میں عزت بھی ہے، حقیقی خدمت بھی، اور اگر کوئی شخص مادی نفع ہی کے لئے اس کا انتخاب کرے تو نامناسب ہونے کے باوجود یہ ایک زبردست تجارت بھی ہے اور بہر حال قوم وملت کی طرف اس کا نفع لوٹتا ہے، اسی طرح خدمت خلق کا میدان ہے، اس میں مسلمانوں کا حصہ ''نہیں'' کے برابر ہے، سنگھ پریوار اور عیسائی کمیونٹی کی خدمات ہمارے لئے مایۂ عبرت ہیں، اگر مسلمان تنظیمیں اور ادارے اس کو اپنی توجہ کا مرکز بنائیں تو بڑا مفید کام انجام پاسکتا ہے اور اس کو اسلام کی دعوت واشاعت کے لئے بھی بہترین اور مؤثر وسیلہ بنایا جاسکتا ہے، مسلمانوں میں آج تک کوئی مدر ٹریسا پیدا نہیں ہوسکی، ہندوستانی مسلمانوں کے ذریعہ دنیائے انسانیت کو کوئی عبد

الستارایدھی حاصل نہ ہوسکا، اگر مسلمان تنظیمیں اس خلا کو پُر کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوں تو وہ نفرت کا نشانہ بننے کے بجائے محبت کا مرکز بن سکتی ہیں، بے آسرا خواتین اور بے سہارا بوڑھوں کے لئے مسلمانوں کے پاس اپنے ادارے نہیں ہیں، اس کا نتیجہ ہے کہ ایسے مجبور لوگوں کو سرکاری اداروں اور دوسرے مذاہب کے آسرا گھروں میں پناہ لینی پڑتی ہے، پھر ارتداد کے بھی واقعات پیش آتے ہیں اور غیر مسلموں سے شادی بیاہ کے بھی، اور اس وقت احتجاج کر کے ہم اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو ریت میں منہ چھپانے کے مترادف ہوتا ہے۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے حیدرآباد کے اردو روزنامہ نے قابل استعمال کپڑوں کو اکٹھا کرنے اور انہیں غریبوں تک پہونچانے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ نہایت بہتر اور قابل تحسین اقدام ہے، اور اسے مزید وسعت دی جاسکتی ہے، اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ وطالبات سے ان کی وہ کتابیں جمع کی جاسکتی ہیں، جن کی انہیں اب ضرورت نہیں رہی اور اس طرح بک بینک قائم کر کے غریب بچوں کو پڑھنے کے لئے کتابیں فراہم کی جاسکتی ہیں، ایک اہم خرچ یونی فارم کا ہوتا ہے، مسلم علاقہ میں بچوں کے لئے یونیفارم کا سلانا آسان نہیں ہوتا ہے، جبکہ بہت سے مالدار گھروں میں یونیفارم کے قابل استعمال ہونے کے باوجود نئے کپڑے سلائے جاتے ہیں، اگر استعمال شدہ یونیفارم کو جمع کیا جائے اور اس سے غریب بچے وبچیوں کی ضرورت کو پوری کیا جائے تو بہت سے خاندانوں کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔

غرض کہ کام کے بہت سے میدان ہیں جو خالی پڑے ہیں، اگر باہمی الجھاؤ اور تصادم کے بجائے تقسیم کار کے فارمولے کو اختیار کیا جائے، تو کام بھی زیادہ ہوگا، قوم وملت کو نفع بھی ہوگا، نیک نامی بھی حاصل ہوگی، اور اگر نیت خالص کو ہو تو اجر وثواب بھی، ضرورت اس بات کی ہے کہ جذبات کی رو میں بہنے اور حاسدانہ انداز فکر کا شکار ہونے کے بجائے امت کے وسیع تر مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے منصوبہ بندی کی جائے، اور ایسا راستہ اختیار کیا جائے، جو ہر شخص یا گروہ کے مقاصد سے بھی ہم آہنگ ہو اور باہمی ٹکراؤ سے بھی محفوظ، یہ ایسا راستہ ہے جس میں ملت کا ہر فرد جیت حاصل کر سکتا اور اپنے آپ کو شکست سے بچا سکتا ہے۔

٢٩/مئی ٢٠٠٩ء

بہترین انسان

انسان کو اس کائنات کا تاجدار بنایا گیا ہے، دنیا کی ہر چیز اس کی خدمت میں مصروف ہے، اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل سے اس نے سمندر کی گہرائیوں اور فضا کی بلندیوں کو فتح کر لیا ہے؛ لیکن وہ جس قدر عظیم ہے، اسی قدر محتاج وضرورت مند بھی ہے، اسے ہر کام میں اپنے جیسے انسانوں کی ضرورت پیش آتی ہے، گیہوں کی دو روٹیاں، چند گز کپڑے اور سر چھپانے کی جگہ بھی، جو اسے میسر آتی ہے، اس میں کتنے ہی لوگوں کی جد وجہد اور کد وکاوش شامل ہوتی ہے؛ اسی لئے ہر مذہب میں خلقِ خدا کی خدمت کو خاص اہمیت دی گئی ہے، اسلام میں اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اللہ کی بندگی اور کسی انسان کی مدد کو ایک درجہ میں رکھا گیا ہے؛ اسی لئے اگر کوئی کبر سنی یا بیماری کی وجہ سے روزہ نہ رکھ پائے تو ایک روزہ کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا مقرر کیا گیا ہے: {وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ} (البقرۃ: ۱۸۴)، بعض گناہوں کا کفارہ ساٹھ روزہ رکھنا ہے اور اگر روزہ نہ رکھ سکتا ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے، گویا بھوکے کا پیٹ بھرنا روزہ جیسی عبادت کا ہم درجہ ہے۔

نماز اتنی اہم عبادت ہے کہ حضور ﷺ نے اسے اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ہے، (نسائی، کتاب عشرۃ النساء، باب حب النساء، حدیث نمبر: ۳۳۹۱) روزہ کے بارے میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ روزہ میرے لئے ہے اور میں خود اس کی جزاء ہوں، (بخاری، کتاب الصوم، باب فضل الصوم، حدیث نمبر: ۱۸۹) حج کے بارے میں ارشاد ہے کہ جیسے اسلام پچھلے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے، اسی طرح حج بھی پچھلے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے؛ لیکن بہتر انسان کا مصداق کون شخص ہے؟ اس کے بارے میں حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو سب سے زیادہ نماز پڑھنے والا ہو، جو زیادہ روزے رکھتا ہو، جس نے متعدد حج کئے ہوں؛ بلکہ آپ ﷺ نے

فرمایا کہ بہترین انسان وہ ہے، جو لوگوں کو نفع پہونچائے: ''خیر الناس من نفع الناس'' (شعب الإیمان للبیهقي، حدیث نمبر: ۷۶۵۸) گویا انسانی خدمت کرنے کو ایک ترجیحی حیثیت دی ہے؛ کیوں کہ اس کا نفع دوسروں تک متعدی ہوتا ہے، قرآن نے اس امت کو خیر امت قرار دیا اور اس کا سبب یہی بتایا کہ یہ امت صرف اپنے نفع کے لئے نہیں؛ بلکہ انسانیت کے نفع کے لئے پیدا کی گئی ہے کہ انہیں اچھے کاموں کی طرف بلائے اور بُرے کاموں سے بچائے: { كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ } (آل عمران: ۱۱۰) اسی طرح آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اسلام کا بہترین عمل کھانا کھلانا اور سلام کو رواج دینا ہے: ''إطعام الطعام و إفشاء السلام'' (بخاری، کتاب الإیمان، باب افشاء السلام، حدیث نمبر: ۲۸)۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس کا بہترین نمونہ تھی، آپ ﷺ پر جب پہلی وحی نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے اس گراں بار ذمہ داری کی وجہ سے کچھ گھبراہٹ محسوس کی، گھر واپس تشریف لائے تو غمگسار شریک حیات ام المؤمنین سیدنا خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کیفیت سن کر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ضائع نہیں کریں گے اور اس موقع پر آپ ﷺ کی پانچ خصوصی صفات کا ذکر فرمایا، ایک یہ کہ آپ ﷺ صلہ رحمی کرتے ہیں اور رشتوں کا پاس ولحاظ کرتے ہیں، دوسرے: آپ ﷺ محتاج ونادار لوگوں کے ساتھ ایسا حسنِ سلوک فرماتے ہیں کہ گویا وہ آپ کی کمائی ہوں، تیسرے: آپ ﷺ لوگوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں، چوتھے: آپ ﷺ مہمانوں کی مہمان نوازی فرماتے ہیں، پانچویں: کسی پر کوئی مصیبت آجائے اور یہ مصیبت اس کی غلطی کا نتیجہ نہ ہو تو اس کی مدد فرماتے، (بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحي إلی رسول اللہ ﷺ، حدیث نمبر: ۳) غور کیجئے کہ یہ پانچوں اوصاف خدمتِ خلق کے مختلف پہلوؤں کو شامل ہیں، اس میں حسن سلوک بھی ہے، بدنی تعاون بھی ہے اور مالی اعانت بھی، اگر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد کی روشنی میں سیرتِ نبوی کا مطالعہ کیا جائے تو پوری حیاتِ نبوی اس کا نمونہ نظر آتی ہے۔

جب ہم خدمتِ خلق کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے صرف مسلمانوں کی یا انسانوں کی خدمت ہی مراد نہیں ہوتی؛ بلکہ پوری خلق اللہ کی خدمت اس میں شامل ہے اور اسلام میں خدمت کا یہی وسیع تصور ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص گذر رہا تھا اور سخت

پیاسا تھا، وہ ایک کنویں میں اترا اور پانی پی کر باہر آیا، اس نے باہر دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے بے قرار ہے؛ چنانچہ پھر دوبارہ کنویں میں واپس گیا اپنے موزوں میں پانی بھر کر واپس لایا اور کتے کو پلایا اسی عمل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمادی، (مسلم، کتاب السلام، باب فضل سقی البہائم ،حدیث نمبر:۸۵۹) گویا انسان تو انسان، اللہ کی کسی بھی مخلوق کی خدمت انسان کے لئے پروانۂ نجات بن سکتی ہے، اسی کا اثر تھا کہ مسلمانوں میں مختلف ضرورتوں کے لئے اوقاف قائم کرنے کا مزاج پیدا ہوا، علماء کے لئے ،طلبہ کے لئے، مسافروں کے لئے، بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کے لئے اور بیماروں کے لئے ؛ یہاں تک کہ بیماروں کی عیادت اور تیمارداری کرنے والوں کے لئے بھی ، اسی طرح جانوروں کے لئے چراگاہیں وقف کی گئیں ، پرندوں کی خوراک کے لئے خصوصی باغ وقف کئے گئے اور پینے کے پانی وغیرہ کے لئے مسلمانوں نے جو خدمت انجام دی ہے، اس کی تو مستقل تاریخ ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا اسوہ ان کے سامنے تھا، ان کے ذہن میں حضور ﷺ کا ارشاد تھا کہ جو خود آسودہ ہوکر سوئے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو، وہ مسلمان نہیں ہوسکتا:

"ليس بالمؤمن الذى يبيت شبعانا وجاره جائع إلي جنبه"

(المستدرک للحاکم، کتاب البیوع، حدیث نمبر:۲۱۶۶، الأدب المفرد للبخاری، باب لا يشبع دون جاره، حدیث نمبر:۱۱۲)

انہیں اپنے نبی ﷺ کی یہ بات مستحضر تھی کہ اگر تمہارے لگائے ہوئے درخت یا پودے سے پرندہ کھالے تو یہ بھی صدقہ ہے، (بخاری، کتاب الحرث، باب فضل الزرع والغرس ،حدیث نمبر: ۲۳۲۰) ان کے سامنے حضور ا کی یہ تلقین تھی کہ جب تم سفر کرو اور کوئی ہرا بھرا علاقہ آئے تو جانور کو چرنے کا موقع دو، (ترمذي، كتاب الأدب، باب مراعاة الإبل ،حدیث نمبر: ۲۸۵۸) یہ حقیقت ان کے سامنے تھی کہ جب کوئی انسان دنیا سے گذر جاتا ہے تو اس سے عمل کا رشتہ منقطع ہوجاتا ہے، سوائے اس کے کہ وہ کوئی ایسی علمی خدمت چھوڑ کر جائے، جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں، کوئی صدقۂ جاریہ کا کام چھوڑ کر جائے جس کا نفع باقی ہو، یا اس کے پیچھے اس کی صالح اولاد ہو، جو اس کے حق میں دعاء گو رہے۔

(مسلم، کتاب الوصية، باب مايلحق الإنسان من الثواب بعدوفاته ،حدیث نمبر: ۴۲۲۳)

افسوس کہ جس امت کو انسانیت کے لئے نافع امت بنا کر بھیجا گیا تھا، اور جس دین میں بہترین انسان ہونے کا معیار اس کی نافعیت کو قرار دیا گیا تھا، آج خدمتِ خلق کے کاموں میں وہی امت اور اسی دین کے ماننے والے سب سے پیچھے ہیں، خدمتِ خلق کے تمام کام ایسے نہیں ہیں، جن میں پیسوں ہی کی ضرورت ہو، کبھی زبان کے دو بول سے بھی خدمتِ خلق ہوسکتی ہے، کبھی فنی مہارت کے ذریعہ بھی خلقِ خدا کی خدمت کی جاسکتی ہے، کبھی معمولی محنت کے ذریعہ مخلوق کو فائدہ پہونچایا جاسکتا ہے، کبھی معمولی مدد کے ذریعہ اللہ کے بندوں تک نفع رسائی ہوسکتی ہے اور اگر انسان چاہے اور اس کو گنجائش میسر ہو تو نسبتاً زیادہ پیسے خرچ کر کے صدقۂ جاریہ کا کوئی کام انجام دے سکتا ہے۔

کوئی ایسا طالب علم جو تعلیم سے ہمت ہار چکا ہو، آپ اس کی ہمت بندھائیں اور اس کا حوصلہ بڑھائیں، کسی مریض کو محبت اور دلداری کے دو جملے کہہ دیں، کسی شخص کو اچھے کام پر مبارک باد دیں اور اس کی حوصلہ افزائی کریں، تو ان صورتوں میں ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوگا؛ لیکن ہوسکتا ہے کہ آپ کا یہ عمل اس کے روشن مستقبل کی ضمانت بن جائے، یہ بھی خدمتِ خلق کی ایک صورت ہے، اسی طرح بعض اوقات آپ کی معمولی سفارش سے کسی نوجوان کو روزگار حاصل ہوسکتا ہے، کسی طالب علم کو داخلہ مل سکتا ہے، کسی بیمار کا مفت یا کم خرچ کا علاج ہوسکتا ہے، کسی لڑکی یا لڑکے کے لئے مناسب رشتہ فراہم ہوسکتا ہے، نیز کسی خاندان کا اختلاف آپ کی تھوڑی سی کوشش کے ذریعہ دور ہوسکتا ہے، یہ سب بھی خدمتِ خلق ہی کی صورتیں ہیں اور اس میں صرف آپ کے دو بول کے ذریعہ ایک مفید خدمت انجام پاسکتی ہے۔

خدمت کی بہت سی صورتیں وہ ہیں، جن کے لئے آپ کو صرف فنی مہارت استعمال کرنے کی ضرورت ہوگی، مثلاً آپ عالم دین ہیں، آپ اپنا کچھ وقت لوگوں کی دینی تعلیم اور شرعی مسائل کی رہنمائی کے لئے مخصوص کرلیں اور لوگوں کو اس کی اطلاع کردیں کہ وہ مقررہ اوقات میں آپ سے استفادہ کریں، آپ ڈاکٹر ہیں، تو طئے کرلیں کہ روزانہ مثلاً پانچ فی صد غریب مریضوں کو بغیر فیس کے دیکھیں گے، یا ہفتہ میں مثلاً ایک دن ایسے مریضوں کے لئے رکھیں گے، اگر آپ وکیل ہیں تو ایک دن مفت قانونی مشورہ کے لئے نکال لیجئے، آپ ٹیچر ہیں تو کچھ غریب بچوں کو مفت ٹیوشن

پڑھا دیجئے ، اس طرح کی بہت سی صورتیں ہیں ، جن میں آپ اپنی مہارت سے کسی بڑی محنت اورصرفہ کے بغیر لوگوں کی خدمت کر سکتے ہیں ۔

خدمتِ خلق کی بعض صورتیں ایسی ہیں ، جن میں آپ کی مہارت کے ساتھ ساتھ معمولی محنت بھی درکار ہوتی ہے ، جیسے آپ الیکٹریشن ہیں اور ہفتہ میں ایک دن یا چند گھنٹے مسلم آبادی میں پہنچ جائیں اور لوگوں سے خواہش کریں کہ جن کے یہاں آپ کے شعبہ کا کوئی کام ہو ، تو وہ آپ سے استفادہ کریں ، اسی طرح اگر آپ پلمبر ہیں ، تو آپ اپنی صلاحیت اور تھوڑی محنت سے بہت سے ان غریب لوگوں کو فائدہ پہونچا سکتے ہیں ، جو پیسہ خرچ کرنے کے موقف میں نہیں ہیں ، آپ اپنے طور پر سڑک پر بہتے ہوئے نل کی مرمت کر سکتے ہیں ، جس سے اللہ کے بہت سے بندوں کو راحت پہونچے گی ۔

اسی طرح خدمتِ خلق کی بعض ایسی صورتیں بھی ہیں ، جس میں نہ پیسوں کی ضرورت ہے ، نہ کسی مہارت کی ، معمولی محنت اور حسنِ سلوک کے ذریعہ آپ اسے انجام دے سکتے ہیں ، جیسے آپ راستہ چلتے ہوئے وزنی سامان اٹھانے میں کسی کی مدد کر دیجئے ، آپ ٹرین یا بس وغیرہ میں اپنے ساتھی مسافروں کا سامان چڑھانے اور اتارنے میں مددگار ہوجایئے ، آپ کسی بوڑھے شخص یا خاتون مسافر کو سمٹ کر یا حسبِ سہولت اٹھ کر تھوڑی دیر کے لئے جگہ دے دیجئے ، آپ کی برتھ نیچے ہو ، کسی بوڑھے ، بیمار یا خاتون کو اس کی ضرورت ہو تو آپ اپنی جگہ اس سے تبدیل کرلیں ، یہ اور اس طرح کی بہت سی صورتیں ہیں ، جن کے ذریعہ آپ خدمتِ خلق کے کام میں حصہ دار بن سکتے ہیں ، اسی سلسلہ کی ایک اہم خدمت وہ ہے ، جس کو رسول اللہ ﷺ نے ایمان کا شعبہ قرار دیا ہے ، یعنی یہ بات کہ آدمی راستہ سے تکلیف دِہ چیز کو ہٹادے : ''**إماطة الأذی عن الطریق**'' (مسلم ، کتاب الإیمان ، باب بیان عدد شعب الإیمان ، حدیث نمبر : ۱۵۳) ، اس حدیث کا دائرہ بہت وسیع ہے ، راستہ میں کوئی ایسی چیز ہو ، جس سے ٹھوکر لگنے کا اندیشہ ہو ، جس کے چبھ جانے کا خطرہ ہو ، جس سے انسان کو یا گاڑی کو نقصان پہونچ سکتا ہو ، جس پر آدمی کے پھسل جانے کا اندیشہ ہو ، یہ ساری چیزیں اس میں داخل ہیں کہ انسان انہیں ہٹادے ، اسی طرح آپ کسی راہ گیر کو مناسب طریقہ پر راستہ بتادیں یا کسی راستہ چلتے شخص کو اپنی سواری پر بٹھالیں ، یہ بھی خدمتِ خلق کی ایک آسان صورت ہے ۔

آپ ان چیزوں سے بھی خلقِ خدا کی مدد کر سکتے ہیں، جو آپ کی ضرورت سے زیادہ ہو، مثلاً اس وقت شہر میں سال میں کئی جوڑے کپڑے سلانے کا رواج سا ہو گیا ہے، یہ کپڑے اچھے بھی ہوتے ہیں اور مضبوط بھی اور ان کا استعمال ترک کر دیا جاتا ہے؛ حالاں کہ وہ ابھی قابلِ استعمال ہوتے ہیں، اسی طرح شادی مین دلہا دلہن کے لئے جو جوڑے بنائے جاتے ہیں، وہ قیمتی ہوتے ہیں اور ایک دو بار سے زیادہ استعمال نہیں کئے جاتے ، یہی حال لڑکے اور لڑکیوں کے اسکول یونیفارم کا ہے کہ متمول گھرانے کے بچے ہر سال نئے یونیفارم سلاتے ہیں؛ حالاں کہ وہ ابھی قابلِ استعمال ہوتے ہیں، اگر ایسے کپڑے جمع کئے جائیں اور انہیں غریبوں تک پہونچایا جائے تو یہ بھی ایک بڑی خدمت ہوگی اور بہت سے غریب گھرانوں کو جسم چھپانے کا وسیلہ ہاتھ آ جائے گا، اسی طرح فاضل فرنیچر، پکوان اور استعمال کے برتن وغیرہ بھی اس طرح سلم آبادی کے لوگوں کو مہیا کئے جا سکتے ہیں۔

اسی نوعیت کی ایک اہم خدمت استعمال شدہ نصابی کتابوں کو جمع کرنے کی ہے، ساتویں جماعت سے پہلے تک اسکول کی انتظامیہ من چاہا نصاب رکھتی ہے، اور سال دو سال پر تبدیل بھی کرتی رہتی ہے؛ تا کہ انہیں زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کا موقع مل سکے؛ لیکن ساتویں جماعت سے یکساں سرکاری نصاب نافذ ہوتا ہے، جو ایک سال پڑھنے کے بعد ان طلبہ کے لئے بے فائدہ ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں اگر کوئی شخص یا ادارہ ان کتابوں کا عطیہ حاصل کر لے اور بک بینک بنائے، اس بینک سے غریب بچے اور بچیوں کو کتابیں فراہم کی جائیں اور سال پورا ہونے پر ان سے وصول کر لیا جائے تو بہت سے غریب طلبہ و طالبات کی مدد ہو سکتی ہے اور وہ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔

خدمتِ خلق کی بہت سی صورتیں وہ ہیں، جن کا تعلق انفاق سے ہے، جیسے دیہاتوں میں بور ویل کھودانا، راستوں میں میٹھے پانی کا نظم کرنا، یتیم بچوں اور بچیوں کے لئے یتیم خانہ، بیوہ عورتوں کے لئے آسرا گھر، لاوارث بوڑھوں کے لئے دار المعمرین کا قیام، ان میں سے بعض کام تو انفرادی طور پر بھی انجام دئے جا سکتے ہیں، اور بعض وہ ہیں، جن کو ادارے اور تنظیمیں کر سکتی ہیں، اسی ضمن میں میڈیکل کیمپ، مسلم گھرانوں میں کھانوں کے پیکج، غریب خواتین کے لئے ٹیلرنگ سنٹر، دیہاتوں کے غریب طلبہ و طالبات کے لئے ہوسٹل وغیرہ شامل ہیں، غرض کہ بہت سے میدان ہیں،

جن میں خدمت کے وسیع مواقع موجود ہیں، مگر افسوس کہ اس میدان میں مسلمان نہ صرف عملی طور پر پیچھے ہیں ؛ بلکہ اس کی اہمیت بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا ہاتھ اونچا ہاتھ رہنے کے بجائے نیچا ہاتھ بن گیا ہے اور ہماری پہچان ایک ایسے گروہ کی ہوگئی ہے، جس کے پاس دوسروں سے مطالبات کی تو ایک لمبی فہرست ہے ؛ لیکن لوگوں کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں۔

۵ / جون ۲۰۰۹ء

دہشت گردی کا اصل علاج

امریکہ کے پہلے سیاہ فام صدر بارک حسین اوباما نے جامع ازہر میں جو خطاب کیا ہے، اس کی گونج اس وقت پوری دنیا میں محسوس کی جارہی ہے، صدر امریکہ کے بقول ان کا مقصد امریکہ عالم اسلام اور پوری دنیا کے مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج کو پاٹنا ہے، اگر اس تقریر کا مقصد اُمت مسلمہ کو لفظوں کا کھلونا دے کر بہلانا نہیں تو اسے ایک ایسا تاریخی خطاب بھی کہا جاسکتا ہے، جو نئے مستقبل کی تعمیر کی بنیاد بن سکتا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ سینئر بش اور جونیئر بش نے عالم اسلام پر ایک ایسی جنگ مسلط کر دی ہے، جو لاکھوں افراد کو کھا گئی ہے اور کمال یہ ہے کہ یہ سب کچھ انسانی حقوق کے تحفظ اور قیامِ امن کے نام پر کیا گیا ہے، آج مسلمان اور عالم اسلام عدمِ تحفظ کی جس صورت حال سے دوچار ہیں، تاتاریوں کے دور میں بھی شاید اس قدر مجبور و بے بس نہ رہے ہوں۔

صدر اوباما نے ایک طرف فلسطینیوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اسرائیل کو تسلیم کریں اور دوسری طرف اسرائیل سے کہا ہے کہ وہ باہمی معاہدات پر عمل کریں، انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ عراق اور افغانستان سے اپنی فوج کو واپس بلا لینا چاہتے ہیں؛ بشرطیکہ امن قائم ہوجائے، انھوں قرآنِ مجید کی ان آیات کو بھی نقل کیا ہے، جن میں انسانی زندگی کی اہمیت، راست گوئی اور انسانی مساوات و برابری کی تعلیم ہے؛ یہاں تک کہ معراج کے اس واقعہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور رسول اللہ ﷺ نے ایک ساتھ نماز ادا کی اور دُعاء فرمائی؛ حالاں کہ اوباما کے خطاب کو صد فیصد انصاف کا آئینہ دار نہیں کہا جاسکتا اور اس میں ظالم اور مظلوم دونوں ایک ہی کٹہرے میں نظر آتے ہیں؛ لیکن پھر بھی بش کے جارحانہ خطاب اور مظلوم کو ظالم ٹھہرانے کے رویہ سے چوں کہ یہ خطاب مختلف ہے؛ اس لئے یہودی میڈیا اسے بھی ہضم نہیں

کر پا رہا ہے، اور مغربی ملکوں میں بعض عناصر کی طرف سے اس کی مخالفت ہو رہی ہے۔

صدر اوباما نے یہ بات بھی کہی ہے کہ ہمیں صادق القول اور صاف گو ہونا چاہئے اور ہم دیوار کے پیچھے جس بات کو کہتے ہیں، اس کو سامنے بھی کہنا چاہئے، اسی سلسلہ کی ایک بات خود ان کے لئے قابل توجہ ہے، وہ یہ ہے کہ ہم شر پسندی اور دہشت گردی کی بات تو کہتے ہیں؛ لیکن ہم ان اسباب کا ذکر کرنے سے ہچکچاتے ہیں، جن کی وجہ سے دہشت گردی وجود میں آتی ہے، جڑوں کو اُکھاڑے بغیر اگر ٹہنیوں اور شاخوں کو کاٹا جائے، تو اس سے درخت کا وجود ختم نہیں ہو سکتا، دنیا میں کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں، جن کی فطرت میں کجی ہوتی ہے، جن کی انسانیت اس قدر مسخ ہو جاتی ہے کہ انھیں ظلم وجور کرنے میں لطف آتا ہے اور ان کو انسانوں کا خون دیکھ کر وہی لذت محسوس ہوتی ہے، جو کسی مئے خوار کو بادۂ وصہبا کے دیکھنے سے ہوتی ہے؛ لیکن ایسے لوگ بہت ہی کم ہوتے ہیں، شاید ان کی تعداد ایک دو فی کڑور ہو؛ لیکن انسانوں کی غالب ترین تعداد ظلم وزیادتی کو ناپسند کرتی ہے، امن اور آشتی کی دلدادہ ہوتی ہے، وہ ''جیئو اور جینے دو'' کے اُصول پر عمل کرنا چاہتے ہیں، اُنھیں پھول جیسے بچوں کا زخمی ہونا بے قرار کر دیتا ہے، خواہ اس کا تعلق کسی بھی طبقہ سے ہو، انھیں لطیف الخلقت عورتوں کی ہلاکت اور ضعیف و معذور بوڑھوں کا قتل ہرگز پسند نہیں آتا، بے قصور انسانوں کی جان سے کھیلنا انھیں گوارہ نہیں ہوتا، اگر انسانی فطرت میں رحم دلی، محبت اور امن پسندی کا جذبہ نہ ہوتا تو سماج میں بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کے لئے اپنے وجود کو بچانا مشکل ہو جاتا؛ کیوں کہ وہ خود اپنا تحفظ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

دہشت گردی اور شدت پسندی کا اصل سبب ظلم وزیادتی اور ناانصافی ہے، جب کسی گروہ کے ساتھ ظلم کیا جائے اور مظلوم کے انصاف حاصل کرنے کے لئے کوئی صورت باقی نہ رہے تو ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کے مصداق وہ تشدد پر آمادہ ہو جاتا ہے، یہ کسی ایک قوم یا گروہ کی بات نہیں ہے؛ بلکہ یہ نہ صرف انسانیت؛ بلکہ تمام جاندار کی فطرت ہے، اگر آپ گائے اور بیل یہاں تک کہ بکرے پر حملہ کرنا چاہیں، تو وہ بھی آپ پر جوابی وار کرتا ہے، بچے معصوم ہوتے ہیں اور ان کا ہر عمل فطرت کی آواز کا درجہ رکھتا ہے، اگر بچے کو بھی کوئی شخص تھپڑ مارنا چاہے، تو وہ بھی احتجاج کرتا ہے اور بعض اوقات جوابی وار کرنا چاہتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اپنے آپ کو ظلم سے بچانے اور ظالم

کے خلاف جو کچھ بَن پڑے، وہ کر گزرنا فطرتِ انسانی کا حصہ ہے، دنیا کے مختلف خطوں میں آزادی کے حصول کے لئے جو جنگیں ہوئی ہیں، وہ اسی نوعیت کی ہیں، استعماری قوتوں کے خلاف یہ جنگ امریکہ نے بھی لڑی ہے اور ہندوستان نے بھی، یہ عجیب بات ہے کہ اپنے حق کی یہ جائز لڑائی نتیجہ خیز ہوجائے، تو اسے جنگ آزادی کہا جاتا ہے اور مبارکباد دی جاتی ہے اور اگر بہ زور طاقت ایسی تحریک کو کچل دیا جائے تو اسے دہشت گردی کا نام دیا جاتا ہے؛ حالاں کہ کوششوں کا درجہ مقاصد سے متعین ہونا چاہئے، نہ کہ جیت ہار سے؛ کیوں کہ دنیا میں حق اور سچائی کی ہار کے اعداد وشمار جمع کئے جائیں تو وہ شاید جیت سے کم نہ ہوں گے۔

دہشت گردی اور تشدد اکثر کسی نہ کسی واقعہ کا ردعمل ہوتا ہے، اگر اس کو ختم کرنا ہے، تو ہمیں ان اسباب کو تلاش کرنا ہوگا، جن کی وجہ سے دہشت گردی اور شدت پسندی پیدا ہوتی ہے، مثلاً اس وقت مشرقِ وسطیٰ کا علاقہ ایک ایسے آتش فشاں کی طرح ہے، جس کی آگ پورے خلیجی ممالک پر پھیلی ہوئی ہے، اس کا سبب محتاجِ وضاحت نہیں، پہلے تو نہایت عیاری کے ساتھ برطانیہ نے اپنا اور مغرب کا کینسر، — جو یہودیت کی شکل میں تھا اور جسے ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف دھکیلتے ہوئے یورپ پریشان تھا — مسلمانوں کے سینے پر مسلط کردیا گیا اور اسرائیل وجود میں آیا، پھر اسرائیل نے کئی بار فلسطینیوں کا قتل عام کیا، بستی کی بستی اُجاڑ دی اور لاکھوں لوگوں کو اپنی سرزمین چھوڑ کر در در بھٹکنے پر مجبور کردیا گیا، آج بھی صورتِ حال یہ ہے کہ غزہ میں مریض دواؤں کے لئے اور معصوم بچے دودھ کے لئے ترس رہے ہیں؛ لیکن مغرب کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی، فلسطین میں شاید کوئی گھر ہو، جس کا کوئی مرد یا عورت اسرائیلی جبر وتشدد کا شکار نہ ہوا ہو، ان حالات میں ان کو تشدد کا مجرم ٹھہرانا یقیناً انصاف کو دھوکہ دینا اور حقیقت سے منھ چرانے کے مترادف ہے۔

قرآن صرف مسلمانوں کے لئے ہی خدا کا پیغام نہیں، وہ پوری انسانیت کے لئے نسخۂ کیمیا ہے، اس کی بنیادی تعلیم عدل واحسان ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: {**إِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ**} (النحل: ۹۰) رسول اللہ ﷺ سے متعلق ذمہ داریاں جو خدا کی طرف سے آپ ﷺ سے متعلق کی گئیں تھیں، اسے خود قرآن مجید نے اس طرح بیان کیا ہے:

{ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ اللهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ

أَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ اللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَإِلَيْهِ الْمَصِيْرُ }
(الشوریٰ:۱۵)

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تم لوگوں کے درمیان انصاف سے کام لوں کہ اللہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی ، ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے ، ہمارے اور تمہارے درمیان حجت ختم ہوگئی ، اللہ ہم لوگوں کو جمع فرمائیں گے اور اللہ ہی کی طرف واپس لوٹنا ہے''

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کا خطاب غیر مسلموں سے ہے، یہ اس بات کا اعلان ہے کہ عدل پوری انسانیت کے ساتھ ہمارا فریضہ ہے، قرآن نے اس بنیاد پر انصاف میں تفریق کی اجازت نہیں دی کہ ایک گروہ ایمان پر ہے اور دوسرا کفر پر، وہ ان کے کفر ومعصیت کے عمل کو اللہ کے حوالے کرتا ہے؛ کیوں کہ آخری عدالت اسی کی عدالت ہے، ایک اور موقع پر قرآن مجید نے اور زیادہ وضاحت کے ساتھ اس کو بیان کیا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اے ایمان والو! تم اللہ کے لئے انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بنو، کسی قوم کی برائی تمہیں ان کے ساتھ ناانصافی پر آمادہ نہ کرے، عدل سے کام لو، جو تقویٰ سے قریب ہے اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہیں''

انصاف ہی سے امن متعلق ہے؛ کیوں کہ اگر ہر شخص کو اُس کا حق مل جائے، تو وہ دوسروں پر دست درازی کا مرتکب کیوں ہو؟ —— اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ مغربی دنیا نے دو الگ الگ پیمانے رکھے ہیں، ایک اپنے لئے اور ایک دوسروں کے لئے، انھیں اجازت ہے کہ وہ نیوکلیر اسلحہ بنائیں؛ لیکن دوسروں کو اس کی اجازت نہیں، دنیا کے پانچ ممالک اپنا فیصلہ پوری دنیا پر مسلط کر سکتے ہیں؛ لیکن پوری دنیا مل کر بھی فیصلہ کرے، تو ان میں سے کوئی ایک ملک ویٹو پاور استعمال کر کے اس فیصلے کو رد کر سکتا ہے، اسرائیل درجنوں عالمی فیصلے کو رد کر چکا ہے؛ لیکن اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی اور نہ عالمی عدالت اس کے بارے میں حرکت میں آسکتی ہے؛ لیکن

سوڈان کے صدر کے خلاف عالمی عدالت کا وارنٹ جاری ہوسکتا ہے، یہ اور اس طرح کے ترجیحی، جانبدارانہ اور نامنصفانہ اقدامات ہیں کہ جن سے مغرب کا حقیقی چہرہ ہمارے سامنے آتا ہے، ایسی صورتِ حال میں مظلوموں سے اپنی مدافعت جو کچھ بَن پڑے، اس کے سوا وہ اور کیا کر سکتے ہیں؟ حالاں کہ ایسی کوششیں اکثر نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتیں؛ لیکن ڈوبتے کو کشتی نہ ملے تو تنکے کا سہارا لینا اس کے لئے مجبوری ہوجاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ جس زمانہ اور جس علاقہ میں تشریف لائے، وہاں دہشت گردی کی حیثیت ایک طریقۂ زندگی کی تھی، طاقتور کا حق سمجھا جاتا تھا کہ وہ نہ صرف کمزور کے زر و زمین پر قابض ہوجائے؛ بلکہ وہ اس کی عزت وآبرو سے بھی کھیلتا تھا، لوگ ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرنے کی ہمت نہ پاتے تھے اور ان مہینوں کا انتظار کرتے تھے، جن کو عرب ''حرام'' (حرمت واحترام والا) سمجھتے تھے، جن میں قدیم روایت کے مطابق وہ کسی کی جان ومال پر ہاتھ نہ ڈالتے تھے، پیغمبر اسلام ﷺ نے دہشت گردی کے خلاف نہ کوئی جلسہ و کانفرنس کیا، نہ کوئی اعلان لکھ کر عرب کے قدیم دستور کے مطابق غلافِ کعبہ سے آویزاں کروایا، نہ اس کے لئے کوئی تحریک چلائی، نہ عربوں کے جنگجو یانہ ذہن کے تنقیدی تجزیہ کی طرف توجہ فرمائی؛ بلکہ ایک بنیادی بات فرمادی کہ کسی بھی قیمت پر عدل کا دامن نہ چھوڑا جائے اور معاملہ اپنوں کا ہو یا بے گانوں کا، دوستوں کا ہو یا دشمنوں کا، انصاف کا پیمانہ ایک ہی رکھا جائے، اسی اُصول پر آپ نے معاشرہ کی تشکیل فرمائی، اس طرح ظلم و جور، دہشت گردی اور قتل وقتال کی فضا خود بہ خود امن وامان، صلح وآشتی اور ایثار وحسن سلوک میں بدل گئی؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اے ایمان والو! تم انصاف قائم کرنے والے اور اللہ کے لئے گواہی
دینے والے بنو، چاہے خود تمہارے یا والدین اور قریب ترین لوگوں
کے خلاف کیوں نہ پڑے'' (النساء: ۱۳۵)

طاقت کے ذریعہ گردنیں جھکائی جاسکتی ہیں، زمین و مکان پر قبضہ کیا جاسکتا ہے، خون بہائے جاسکتے ہیں اور ظلم کا آتش فشاں سلگایا جاسکتا ہے؛ لیکن دل و دماغ کو بدلا نہیں جاسکتا، اس سے فکر کی دنیا میں کوئی انقلاب نہیں آسکتا اور دہشت گردی کے خاتمہ اور انصاف کے قیام کے لئے

ضرورت ہے سوچ میں تبدیلی کی ، انسانیت کے تئیں جذبۂ محبت کی اور احترام آدمیت کو پروان چڑھانے کی ، یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ پورے معاشرہ کو انصاف میں حصہ ملے اور سماج کا کوئی طبقہ اس احساس سے دوچار نہ ہو کہ اسے ظالموں کے مقابلہ انصاف حاصل نہیں ہو سکتا اور اس کے آگ کے دریا سے تیر کر ہی پار کرنا مقدر ہے!

۱۲/ جون ۲۰۰۹ء

خواتین کے لئے پردہ فطرت کی آواز

مغرب کو اس بات پر ناز ہے کہ اس نے دنیا کو جمہوریت اور سیکولرزم کا تحفہ دیا ہے، جس میں ہر شخص کو اظہار خیال کی، اپنی تہذیبی اور ثقافتی شناخت کے ساتھ زندہ رہنے کی اور اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہے اور کسی پر کوئی رائے تھوپی نہیں جاسکتی، عالم اسلام پر ان کا دباؤ ہے کہ وہ اپنے یہاں خواتین کو اپنے خیال کے مطابق زندگی گذارنے کی اجازت دیں، ہر گروہ کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کا اختیار دیں اور اس میں جبر اور زور زبردستی کا طریقہ اختیار نہ کریں، مگر شاید مغرب میں آزادی کا حقیقی مقصد انسان کو اخلاقی اور مذہبی قدروں سے آزاد کرنا ہے، نہ کہ آزادی سے ہم کنار کرنا؛ اسی لئے فرانس کے موجودہ صدر نکولس سرکوزی نے فرانس میں آباد چالیس لاکھ مسلمانوں کو ان کی مذہبی شناخت سے محروم کرنے کی اور مسلمان خواتین کو نقاب سے روکنے کی ایک پر جوش مہم شروع کر رکھی ہے اور اب برقعہ پر پابندی کے لئے باضابطہ کمیشن تشکیل دیا گیا ہے، اس سے پہلے اسکولوں اور سرکاری اداروں میں سکھوں کے لئے پگڑی، مسلمان خواتین کے لئے اسکارف، یہودیوں کے لئے ان کی مخصوص ٹوپی اور عیسائیوں کے لئے صلیب رکھنے کی ممانعت کی جاچکی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ جمہوریت کے اس تصور کے بالکل مغائر ہے، جس میں تمام لوگوں کو یکساں حقوق دینے اور اپنی سوچ کے مطابق عمل کا حق دینے کا دعوی کیا جاتا ہے، کیا سیکولرزم کا مطلب یہی ہے، کہ ایک شخص کو جانوروں کی طرح بے لباس رہنے کی تو اجازت ہو؛ لیکن اگر وہ اپنی خوشی اور خواہش سے ساتر لباس پہننا چاہے، تو اس پر پابندی ہو؟

خدا کا نظام یہ ہے کہ جو چیز اہم بھی ہوتی ہے اور نازک بھی، اسے حفاظتی حصار میں رکھا جاتا ہے، انسان کے ہاتھ پاؤں پر کوئی حصار نہیں رکھا گیا؛ لیکن دماغ کو سخت ہڈیوں والی کھوپڑی کے اندر رکھا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اس کا تحفظ ہو سکے، دل کی جگہ سینہ کی لچک دار ہڈیوں کے بیچ رکھی

گئی؛ تاکہ زیادہ سے زیادہ اس کی حفاظت ہوسکے، آنکھوں پر پلکوں کا پہرا بیٹھا یا گیا، یہ ان اعضاء کی تحقیر ہے یا ان کی حفاظت؛ بلکہ ان کا اعزاز؟—— نباتات ہی کو دیکھئے، اگر آم پر دبیز چھلکوں کا لباس نہ ہوتا، تو کیا مکھیوں اور بھڑوں سے بچ کر وہ انسانوں کے ہاتھ آسکتا؟ اگر چاول اور گیہوں کے دانوں پر ان کی حفاظت کے لیے چھلکے نہ ہوتے، تو انسان انہیں اپنی خوراک بنا بھی سکتا؟ خود انسانی معاشرہ میں دیکھئے، ملک کا ایک عام شہری کھلے عام ہر جگہ آمد ورفت کرتا ہے، نہ اس کے ساتھ سیکورٹی گارڈ ہے، نہ اس کی رہائش گاہ پر پہرہ دار ہیں، جبکہ اہم شخصیتوں کے لئے تحفظ کا خصوصی نظم کیا جاتا ہے۔

مردوں اور عورتوں میں عورتیں حفاظت کی زیادہ محتاج ہیں، خدا نے ان کو مردوں کے لیے وجہ کشش بنایا ہے؛ اسی لیے ان کی تراش وخراش میں حسن کاری اور لطافت کو قدم قدم پر ملحوظ رکھا گیا ہے، اور لطافت 'نزاکت' کو چاہتی ہیں، اسی لیے بھینس اور بیل تو لطافت سے خالی ہیں، مگر خدا نے ہرن کو نازک اندام اور سبک خرام بنایا ہے، عورتوں کے اس تخلیقی پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے وہ حفاظت کی زیادہ محتاج ہوتی ہیں، اگر کسی کا لڑکا شہر جائے، اسے چار بجے شام کو آجانا چاہیے تھا؛ لیکن وہ رات کے دس بجے لوٹے، تو اس سے گھبراہٹ نہیں پیدا ہوتی؛ لیکن اگر یہی واقعہ کسی لڑکی کے ساتھ پیش آئے، تو دل کا قرار چھن جاتا ہے، اور ماں باپ کی کروٹیں بے سکون ہو جاتی ہیں، اسی کو دیکھئے کہ پوری دنیا میں اور ہندوستان میں بھی مردوں اور عورتوں کے عددی تناسب میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے، خدا نے ان دونوں صنفوں کو ایک توازن کے ساتھ پیدا فرمایا ہے؛ تاکہ دونوں طبقات کی ضرورتیں پوری ہوسکیں اور پوری دنیا میں سو سال سے زیادہ عرصہ سے جمہوریت سکۂ رائج الوقت بنی ہوئی ہے، جس کا ایک نعرہ عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق دینا بھی ہے؛ لیکن اس کے باوجود آج بھی عورتیں حقوق مانگتی ہیں اور مرد انہیں حقوق واختیارات دیتے ہیں، یہ فرق کیوں ہے؟ کیوں امریکہ وروس میں آج تک کوئی خاتون صدر نہیں بن سکی اور یورپ میں مارگریٹ تھیچر کے علاوہ کوئی خاتون وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر نہیں پہنچ سکی؟، یہ ظلم وحق تلفی کا معاملہ نہیں ہے؛ بلکہ یہ قانونِ فطرت کا فیصلہ ہے، قدرت نے خود دونوں کی صلاحیتوں میں فرق رکھا ہے اور صلاحیتوں کے لحاظ سے دائرۂ کار متعین کیا ہے۔

پردہ بھی اسی فرق کا ایک حصہ ہے، جانور بھی کھاتے پیتے ہیں، اور شہوانی جذبات رکھتے ہیں؛ لیکن ان کی فطرت لباس کے تصور سے عاری ہے، انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو عریانیت سے بچائے اور لباس زیب تن کرے، وہی فطرت اس بات کا بھی مطالبہ کرتی ہے کہ مردوں کے مقابلہ عورتیں زیادہ ڈھکی چھپی ہوں، فرض کیجئے دولڑکیاں راستہ سے گذر رہی ہیں ، ایک لڑکی کا لباس چست اور شوخ ہو، اس کا سر کھلا ہو، اس کے بازو کھلے ہوں، اس کا پیٹ نگاہِ ہوس کو دعوت نظارہ دیتا ہو اور اس کا کسا ہوا لباس جسم کے نشیب وفراز کو نمایاں کرتا ہو، دوسری لڑکی سرتا پا نقاب میں ہو یا کم سے کم ڈھیلا ڈھالا لباس اور سر پر دوپٹہ ہو، تو اوباش قسم کے لڑکے ان میں سے کس کو چھیڑنے کی کوشش کریں گے، ہوس ناک نگاہوں کا تیر کس کی طرف متوجہ ہوگا، برائی کے جذبات ان میں سے کس کے تئیں دلوں میں کروٹ لیں گے؟ یقیناً بے پردہ لڑکی اس کا نشانہ بنے گی ، کچھ عرصہ پہلے جب دہلی میں لڑکیوں کو چھیڑنے اور جنسی طور پر ہراساں کرنے کے واقعات کی کثرت ہوگئی ، تو پولیس کمشنر نے ہدایت جاری کی کہ لڑکیاں چست اور نیم عریاں لباس پہن کر بازاروں اور تعلیم گاہوں میں نہ جائیں؛ کیوں کہ اس سے جرم کی تحریک پیدا ہوتی ہے، مگر افسوس کہ حقوقِ نسواں کی تنظیموں نے اس معقول تجویز کے خلاف ایسا شور برپا کیا کہ تجویز واپس لینی پڑی۔

پردہ کے بارے میں اسلامی تعلیمات تو نہایت واضح ہیں ہی ، قرآن مجید نے عورتوں کو پورے جسم کے علاوہ چہرہ پر بھی گھونگھٹ ڈالنے کا حکم دیا ہے، (الأحزاب: ۵۹) خواتین کے لیے رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں پیچھے کی صف رکھی اور یہ بھی فرمایا کہ ان کا مسجد میں نماز پڑھنے سے گھر میں نماز ادا کرنا بہتر ہے، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۵۷۰، ۶۷۸) ان سے بنیادی طور پر ایسی ذمہ داریاں متعلق کی گئیں، جو اندرون خانہ کی ہیں، اور انہیں شمعِ محفل بننے کے بجائے گھر کی ملکہ بنایا گیا؛ لیکن اسلام کے علاوہ دوسرے مذہب میں بھی پردہ کا تصور رہا ہے، بائبل میں کئی خواتین کا ذکر ملتا ہے جو کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھیں ؛ بلکہ بعض وہ ہیں جو پردے کی وجہ سے پہچانی نہیں گئیں ، آج بھی چرچوں میں حضرت مریم علیہا الصلاۃ والسلام کا جو فرضی مجسمہ بنایا جاتا ہے، اس میں چہرے کے علاوہ پورا جسم ڈھکا ہوتا ہے، حالانکہ رومن تہذیب اور اس کے بعد یورپ میں عورتوں کے عریاں مجسمے بنانے اور جسم کے ایک ایک نشیب وفراز اور خط وخال کو نمایاں کرنے کا رواج عام ہے، گویا جو

لوگ عریانیت اور بے پردگی کے مبلّغ ہیں وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عورتوں کا تقدس باپردہ رہنے ہی میں ہے۔

ہندو مذہب میں بھی قدیم عہد سے پردہ کی روایت رہی ہے، سیتا جی کا مشہور واقعہ ہے کہ جب راون نے انہیں اغوا کیا، تو شری رام جی کے چھوٹے بھائی لکشمن جی انہیں پہچان بھی نہیں سکے، اور انہوں نے کہا کہ ایک ہی جگہ رہنے کے باوجود ہم نے کبھی اپنی بھاوج کی صورت نہیں دیکھی اور جب شری رام جی نے سیتا کے لیے ہار بھیجے، تو سیتا جی مختلف عورتوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھیں؛ اس لیے لکشمن انہیں پہچاننے سے قاصر رہے، یہ واقعات جن کا برادرانِ وطن کی کتابوں میں آج بھی ذکر موجود ہے، واضح کرتے ہیں کہ ہندو مذہب میں عورتوں کی عفت وعصمت، شرم وحیا اور پردہ وغیرہ کو کتنی اہمیت حاصل تھی، یہی وجہ ہے کہ ہندو سماج میں اکثر اونچی ذات کی عورتیں پردہ کیا کرتی تھیں، اب بھی مارواڑیوں، کائستوں اور پرانی وضع کے حامل برہمن خاندانوں میں عورتوں کے باپردہ رہنے کا رواج ہے، گوان کے ہاں برقعہ کا استعمال نہیں ہوتا؛ لیکن گھونگھٹ لٹکا کر رکھنے کا رواج پایا جاتا ہے۔

پردہ نہ ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے اور نہ اس سے ترقی کے مواقع ختم ہوتے ہیں، اسلامی تاریخ میں بہت سی باکمال خواتین پیدا ہوئی ہیں، جن کے حالات پر کئی کئی جلدیں لکھی گئی ہیں، اسلام نے مردوں کی طرح عورتوں کو بھی علم حاصل کرنے کی اجازت دی ہے، وہ معلم ہوسکتی ہیں، وہ طبیب ہوسکتی ہیں، وہ شرعی اصولوں کے مطابق تجارت کرسکتی ہیں، وہ کارِ افتاء انجام دے سکتی ہیں، وہ حدود وقصاص کے علاوہ دوسرے مقدمات میں جج بن سکتی ہیں، اگر مردوں اور عورتوں کے لیے جداگانہ ضروریات کا نظم کیا جائے، الگ الگ اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں ہوں، الگ الگ ہاسپٹل ہوں، عورتوں کے لیے مخصوص مارکیٹ ہوں، وغیرہ تو خواتین کے لیے معاشی تگ ودو کے بھی اتنے مواقع پیدا ہوجائیں گے، جو انہیں اِس وقت میسر نہیں ہیں اور وہ آزادانہ ماحول میں بہتر طور پر کام کرسکیں گی، اگر ٹرین میں خواتین کے لیے مخصوص کوچ ہوسکتے ہیں، بسوں میں ان کے محفوظ سیٹیں ہوسکتی ہیں، ہسپتالوں میں ان کے وارڈ الگ رکھے جاسکتے ہیں تو زندگی کے دوسرے شعبوں میں خواتین کے لیے علیحدہ اور مستقل انتظام ہو تو اس میں کیا دشواری یا برائی ہے؟

پس، پردہ خواتین کو مجرمانہ ذہن سے بچانے کا ذریعہ ہے اور اس کا مقصد ان کی حفاظت ہے، اگر معاشرہ میں پردہ کا رواج ہو جائے اور خواتین کے لیے ایسا نظم کیا جائے کہ وہ زندگی کے مختلف میدانوں میں مردوں سے الگ رہتے ہوئے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں تو یہ عورتوں کو بے پردہ کرنے، مخلوط ماحول میں انہیں تناؤ کا شکار بنانے اور مردوں کی نگاہِ ہوس کو ٹھنڈی کرتے ہوئے اپنے فرائض انجام دینے سے کہیں بہتر ہوگا، کاش! اہل مغرب عورتوں کے حقیقی مسائل کو سمجھ سکیں اور ان کے دکھ کا مداوا کر سکیں۔

یہ تاریخ کا ایک عجوبہ ہے کہ عیسائیوں کے نزدیک حضرت مریم علیہا السلام ایک مقدس ترین شخصیت کی مالک ہیں؛ بلکہ بعض تو انہیں عیسائی عقیدہ کے مطابق تین خداؤں میں ایک خیال کرتے ہیں، ان کی زندگی کا امتیازی پہلو یہ تھا کہ وہ کنواری تھیں، انہیں کسی مرد نے ہاتھ بھی نہ لگایا تھا اور اللہ تعالی کے خصوصی حکم کی بناء پر وہ حاملہ ہوئیں؛ لیکن عجیب بات ہے کہ جس عورت کو نکاح کے ذریعہ بھی نہ چھوا گیا ہو، آج ان ہی پر ایمان رکھنے والی عیسائی قوم دامن عفت تارتار کرنے کو بے قرار ہے، لباس ان کے لئے ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے اور چاہتی ہے کہ جسم پر ایک تار لباس بھی باقی نہ رہے، دنیا میں شاید ہی اس سے بڑھ کر کوئی حیرت انگیز تضاد موجود ہوگا، **فیاعجباہ ویا أسفاہ** !

۳/ جولائی ۲۰۰۹ء

پردہ ـــــ حقیقت اور پروپیگنڈہ

محترمہ جناب پرتیبھا پاٹل ملک کے اعلیٰ ترین عہدہ ''صدارت'' کے لیے امیدوار ہیں اور جو سیاسی پارٹیاں ان کی تائید کر رہی ہیں، اس سے امید ہے کہ وہ ملک کی پہلی خاتون صدر جمہوریہ بننے کا اعزاز حاصل کریں گی اور دنیا کے ممتاز سائنس داں بھارت رتن اے، پی، جے عبد الکلام کی جگہ لیں گی، جس آدمی پر ذمہ داری کا بوجھ رکھا جاتا ہے، قدرتی طور پر اس میں احساس ذمہ داری بڑھ جاتا ہے اور وہ زبان و بیان کے معاملے میں محتاط ہو جاتا ہے؛ لیکن بدقسمتی سے پرتیبھا پاٹل نے صدارت کی امیدوار بننے کے بعد ایسے بیانات دیے، جو حقائق سے ناواقفیت پر تو مبنی ہیں ہی، ان کی ذمہ دارانہ حیثیت کے بھی منافی ہیں، میری مراد ان کے اس بیان سے ہے، جو انہوں نے ادے پور (راجستھان) میں منعقدہ ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے دیا، کہ ہندوستان میں پردہ سسٹم مغلوں کے حملہ کے بعد خواتین کو حملہ آوروں سے بچانے کے لیے شروع کیا گیا تھا، یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ محترمہ پاٹل نہ صرف اسلام کے بارے میں بہت محدود واقفیت رکھتی ہیں؛ بلکہ وہ ہندو روایات سے بھی ناواقف ہیں۔

مغربی تہذیب جو اخلاق، شرافت اور حیا سے بالکل آزاد ہو چکی ہے، وہ بجائے اپنی بے حیائی پر شرمسار ہونے کے مشرقی اور مذہبی اقدار و روایات کو ہی نشانہ بنا رہی ہے، جیسے پاگل خانہ میں ایک صحت مند آدمی پہنچ جائے، تو وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگے گا اور سارے پاگل سمجھیں گے کہ یہی شخص بیمار ہے، اسی طرح بے حیائی کے غلبہ کی اس فضا میں جو لوگ شرم و حیا اور مذہبی اور اخلاقی قدروں کی بات کرتے ہیں وہ اجنبی شہر نظر آنے لگتے ہیں؛ لیکن اس سے سچائی بدل نہیں سکتی ،حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کے لیے پردہ فطرت کی آواز ہے، یہ مہذب معاشرہ کی علامت ہے، یہ مذاہب کی مشترکہ تعلیمات کا حصہ ہے اور خود ہندو روایات خواتین کے لیے پردہ کی قائل رہی ہیں،

یہ عورتوں کی تحقیر یا ان کی اہانت نہیں ہے اور نہ یہ تعلیم وترقی میں رکاوٹ ہے۔

خدا کا نظام یہ ہے کہ جو چیز اہم بھی ہوتی ہے اور نازک بھی، اسے حفاظتی حصار میں رکھا جاتا ہے، انسان کے ہاتھ پاؤں پر کوئی حصار نہیں رکھا گیا، لیکن دماغ کو سخت ہڈیوں والی کھوپڑی کے اندر رکھا گیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اس کا تحفظ ہو سکے، دل کی جگہ سینہ کی لچک دار ہڈیوں کے بیچ رکھی گئی؛ تا کہ زیادہ سے زیادہ اس کی حفاظت ہو سکے، آنکھوں پر پلکوں کا پہرا بیٹھا یا گیا، یہ ان اعضاء کی تحقیر ہے یا ان کی حفاظت؛ بلکہ ان کا اعزاز؟ —— نباتات ہی کو دیکھئے، اگر آم پر دبیز چھلکوں کا لباس نہ ہوتا، تو کیا مکھیوں اور بھڑوں سے بچ کر وہ انسانوں کے ہاتھ آسکتا؟ اگر چاول اور گیہوں کے دانوں پر ان کی حفاظت کے لیے چھلکے نہ ہوتے، تو انسان انہیں اپنی خوراک بنا بھی سکتا؟ خود انسانی معاشرہ میں دیکھئے ملک کا ایک عام شہری کھلے عام ہر جگہ آمد ورفت کرتا ہے، نہ اس کے ساتھ سیکورٹی گارڈ ہے، نہ اس کی رہائش گاہ پر پہرہ دار ہیں؛ لیکن محترمہ پاٹل کے ساتھ بحیثیت گورنر حفاظت کا کیا کچھ انتظام نہ ہوگا اور وہ جب صدر جمہوریہ بن جائیں گی، تب تو پرندہ کے لیے بھی ان کے قریب پر مارنا مشکل ہو جائے گا اور ہوائی جہاز بھی قصر صدارت کے قریب سے پرواز نہیں کر سکیں گے، کیا یہ سب کچھ توہین ہے؟

مردوں اور عورتوں میں عورتیں حفاظت کی زیادہ محتاج ہیں، خدا نے ان کو مردوں کے لیے وجہ کشش بنایا ہے، اسی لیے ان کی تراش وخراش میں حسن کاری اور لطافت کو قدم قدم پر ملحوظ رکھا گیا ہے، اور لطافت ''نزاکت'' کو چاہتی ہیں؛ اسی لیے بھینس اور بیل تو لطافت سے خالی ہیں، مگر خدا نے ہرن کو نازک اندام اور سبک خرام بنایا ہے، عورتوں کے اس تخلیقی پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے وہ حفاظت کی زیادہ محتاج ہوتی ہیں، اگر کسی کا لڑکا شہر جائے، اسے چار بجے شام کو آ جانا چاہیے تھا؛ لیکن وہ رات کے دس بجے لوٹے، تو اس سے گھبراہٹ نہیں پیدا ہوتی؛ لیکن اگر یہی واقعہ کسی لڑکی کے ساتھ پیش آئے، تو دل کا قرار چھن جاتا ہے، اور ماں باپ کی کروٹیں بے سکون ہو جاتی ہیں، اسی کو دیکھئے کہ پوری دنیا میں اور ہندوستان میں بھی مردوں اور عورتوں کے عددی تناسب میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے، خدا نے ان دونوں صنفوں کو ایک توازن کے ساتھ پیدا فرمایا ہے؛ تا کہ دونوں طبقات کی ضرورتیں پوری ہو سکیں اور پوری دنیا میں سو سال سے زیادہ عرصہ سے جمہوریت سکۂ

رائج الوقت بنی ہوئی ہے، جس کا ایک نعرہ عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق دینا بھی ہے؛ لیکن اس کے باوجود آج بھی عورتیں حقوق مانگتی ہیں اور مرد انہیں حقوق و اختیارات دیتے ہیں، یہ فرق کیوں ہے؟ کیوں امریکہ و روس میں آج تک کوئی خاتون صدر نہیں بن سکی اور یورپ میں مارگریٹ تھیچر کے علاوہ کوئی خاتون وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر نہیں پہنچ سکی؟، یہ ظلم و حق تلفی کا معاملہ نہیں ہے؛ بلکہ یہ قانونِ فطرت کا فیصلہ ہے، قدرت نے خود دونوں کی صلاحیتوں میں فرق رکھا ہے اور صلاحیتوں کے لحاظ سے دائرۂ کار متعین کیا ہے۔

پردہ بھی اسی فرق کا ایک حصہ ہے، جانور بھی کھاتے پیتے ہیں، اور شہوانی جذبات رکھتے ہیں؛ لیکن ان کی فطرت لباس کے تصور سے عاری ہے، انسان کی فطرت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو عریانیت سے بچائے اور لباس زیب تن کرے، وہی فطرت اس بات کا بھی مطالبہ کرتی ہے کہ مردوں کے مقابلہ عورتیں زیادہ ڈھکی چھپی ہوں، فرض کیجئے دو لڑکیاں راستہ سے گذر رہی ہیں، ایک لڑکی کا لباس چست اور شوخ ہو، اس کا سر کھلا ہو، اس کے بازو کھلے ہوں، اس کا پیٹ نگاہِ ہوس کو دعوت نظارہ دیتا ہو اور اس کا کسا ہوا لباس جسم کے نشیب و فراز کو نمایاں کرتا ہو، دوسری لڑکی سرتا پا نقاب میں ہو یا کم سے کم ڈھیلا ڈھالا لباس اور سر پر دوپٹہ ہو، تو اوباش قسم کے لڑکے ان میں سے کس کو چھیڑنے کی کوشش کریں گے، ہوس ناک نگاہوں کا تیر کس کی طرف متوجہ ہوگا، برائی کے جذبات ان میں سے کس کے تئیں دلوں میں کروٹ لیں گے؟ یقیناً بے پردہ لڑکی اس کا نشانہ بنے گی، کچھ عرصہ پہلے جب دہلی میں لڑکیوں کو چھیڑنے اور جنسی طور پر ہراساں کرنے کے واقعات کی کثرت ہوگئی تو پولیس کمشنر نے ہدایت جاری کی کہ لڑکیاں چست اور نیم عریاں لباس پہن کر بازاروں اور تعلیم گاہوں میں نہ جائیں؛ کیوں کہ اس سے جرم کی تحریک پیدا ہوتی ہے، مگر افسوس کہ حقوقِ نسواں کی تنظیموں نے اس معقول تجویز کے خلاف ایسا شور برپا کیا کہ تجویز واپس لینی پڑی۔

پردہ کے بارے میں اسلامی تعلیمات تو نہایت واضح ہیں ہی، قرآن مجید نے عورتوں کو پورے جسم کے علاوہ چہرہ پر بھی گھونگھٹ ڈالنے کا حکم دیا ہے، (الأحزاب: ۵۹) خواتین کے لیے رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں پیچھے کی صف رکھی اور یہ بھی فرمایا کہ ان کا مسجد میں نماز پڑھنے سے گھر میں نماز ادا کرنا بہتر ہے، (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۵۷۰، ۶۷۸) ان سے بنیادی طور پر ایسی ذمہ داریاں

متعلق کی گئیں جو اندرون خانہ کی ہیں، اور انہیں شمعِ محفل بننے کے بجائے گھر کی ملکہ بنایا گیا؛ لیکن اسلام کے علاوہ دوسرے مذہب میں بھی پردہ کا تصور رہا ہے، بائبل میں کئی خواتین کا ذکر ملتا ہے جو کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھیں؛ بلکہ بعض وہ ہیں جو پردے کی وجہ سے پہچانی نہیں گئیں، آج بھی چرچوں میں حضرت مریم علیہا الصلاۃ والسلام کا جو فرضی مجسمہ بنایا جاتا ہے، اس میں چہرے کے علاوہ پورا جسم ڈھکا ہوتا ہے، حالانکہ رومن تہذیب اور اس کے بعد یورپ میں عورتوں کے عریاں مجسمے بنانے اور جسم کے ایک ایک نشیب وفراز اور خط وخال کو نمایاں کرنے کا رواج عام ہے، گویا جو لوگ عریانیت اور بے پردگی کے مبلّغ ہیں وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عورتوں کا تقدس باپردہ رہنے ہی میں ہے۔

ہندو مذہب میں بھی قدیم عہد سے پردہ کی روایت رہی ہے، سیتا جی کا مشہور واقعہ ہے کہ جب راون نے انہیں اغوا کیا، تو شری رام جی کے چھوٹے بھائی لکشمن جی انہیں پہچان بھی نہیں سکے، اور انہوں نے کہا کہ ایک ہی جگہ رہنے کے باوجود ہم نے کبھی اپنی بھاوج کی صورت نہیں دیکھی اور جب شری رام جی نے سیتا کے لیے ہار بھیجے، تو سیتا جی مختلف عورتوں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھیں؛ اس لیے لکشمن انہیں پہچاننے سے قاصر رہے، یہ واقعات جن کا برادرانِ وطن کی کتابوں میں آج بھی ذکر موجود ہے، واضح کرتے ہیں کہ ہندو مذہب میں عورتوں کی عفت وعصمت، شرم وحیا اور پردہ وغیرہ کو کتنی اہمیت حاصل تھی، یہی وجہ ہے کہ ہندو سماج میں اکثر اونچی ذات کی عورتیں پردہ کیا کرتی تھیں، اب بھی مارواڑیوں، کائستوں اور پرانی وضع کے حامل برہمن خاندانوں میں عورتوں کے باپردہ رہنے کا رواج ہے، گو ان کے ہاں برقعہ کا استعمال نہیں ہوتا؛ لیکن گھونگھٹ لٹکا کر رکھنے کا رواج پایا جاتا ہے۔

انگریزوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان نفرت پیدا کرنے اور اس اختلاف سے فائدہ اٹھا کر اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ تاریخ میں غلط واقعات کو سمویا جائے اور ان کو ان دونوں قوموں کے درمیان فاصلہ بڑھانے کے لیے استعمال کیا جائے، انہیں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ''خواتین کو مغل حملہ آوروں سے بچانے کے لیے پردہ کا رواج شروع ہوا''، حقیقت یہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے خاص کر عزت وآبرو کے معاملے میں زیادہ تر اخلاقی پہلو

کو ملحوظ رکھا ہے ؛ کیوں کہ کسی بھی صورت میں غیر مسلم خواتین کی عزت و آبرو مسلمان کے لیے حلال نہیں ہوسکتی، تقسیمِ ملک کے وقت مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کے اتنے واقعات پیش آئے کہ اگر آسمان خون کے آنسو بہاتا تب بھی بے جا نہ ہوتا، مگر مسلم علاقوں میں غیر مسلم عورتوں کے ساتھ شاذ و نادر ہی ایسے واقعات پیش آئے ؛ اس لیے یہ سراسر تہمت ، بہتان ، اپنی تاریخ سے ناآگہی اور دشمنوں کی گڑھی ہوئی کہانیوں پر یقین کرتا ہے۔

پردہ نہ ترقی میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے اور نہ اس سے ترقی کے مواقع ختم ہوتے ہیں، اسلامی تاریخ میں بہت سی باکمال خواتین پیدا ہوئی ہیں، جن کے حالات پر کئی کئی جلدیں لکھی گئی ہیں ، اسلام نے مردوں کی طرح عورتوں کو بھی علم حاصل کرنے کی اجازت دی ہے، وہ معلم ہوسکتی ہیں، وہ طبیب ہوسکتی ہیں، وہ شرعی اصولوں کے مطابق تجارت کرسکتی ہیں، وہ کارِ افتاء انجام دے سکتی ہیں، وہ حدود و قصاص کے علاوہ دوسرے مقدمات میں جج بن سکتی ہیں، اگر مردوں اور عورتوں کے لیے جداگانہ ضروریات کا نظم کیا جائے ، الگ الگ اسکول ، کالج اور یونیورسٹیاں ہوں ، الگ الگ ہاسپٹل ہوں، عورتوں کے لیے مخصوص مارکیٹ ہوں، وغیرہ، تو خواتین کے لیے معاشی تگ و دو کے بھی اتنے مواقع پیدا ہوجائیں گے جو انہیں اِس وقت میسر نہیں ہیں اور وہ آزادانہ ماحول میں بہتر طور پر کام کرسکیں گی ، اگر ٹرین میں خواتین کے لیے مخصوص کوچ ہوسکتے ہیں، بسوں میں ان کے محفوظ سیٹیں ہوسکتی ہیں، ہسپتالوں میں ان کے وارڈ الگ رکھے جاسکتے ہیں، تو زندگی کے دوسرے شعبوں میں خواتین کے لیے علیحدہ اور مستقل انتظام ہو تو اس میں کیا دشواری یا برائی ہے؟

پس، پردہ خواتین کو مجرمانہ ذہن سے بچانے کا ذریعہ ہے اور اس کا مقصد ان کی حفاظت ہے، اگر معاشرہ میں پردہ کا رواج ہوجائے اور خواتین کے لیے ایسا نظم کیا جائے کہ وہ زندگی کے مختلف میدانوں میں مردوں سے الگ رہتے ہوئے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں، تو یہ عورتوں کو بے پردہ کرنے، مخلوط ماحول میں انہیں تناؤ کا شکار بنانے اور مردوں کی نگاہِ ہوس کو ٹھنڈی کرتے ہوئے اپنے فرائض انجام دینے سے کہیں بہتر ہوگا، کاش! محترمہ پرتیبھا پاٹل ایک عورت ہونے کی حیثیت سے عورتوں کے حقیقی مسائل کو سمجھ سکیں اور ان کے دکھ کا مداوا کرسکیں۔

۲۰/ جولائی ۲۰۰۷ء

بے خدا تمدن

رب کائنات نے انسان کو جن نعمتوں سے نوازا ہے، ان میں ایک بڑی نعمت آزادی ہے ، دنیا کی بہت سی مخلوقات قدرتی طور پر قید کی حالت میں ہیں ، درخت جس جگہ لگایا جاتا ہے اور نشو و نما پاتا ہے ، ہمیشہ وہیں کھڑا رہتا ہے ، اس کے پاؤں میں ایسی بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں کہ وہ دو قدم بھی نہیں چل سکتا ، پہاڑ کی صلابت وقوت کی مثال دی جاتی ہے ؛ لیکن دوسری طرف اس کو اس طرح قید کر دیا گیا ہے کہ صدیاں گزر جاتی ہیں اور وہ کروٹ نہیں لے سکتا ، سمندر کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجیں کائنات کے بڑے حصہ پر قابض ہیں ؛ لیکن کیا مجال کہ وہ مستقل طور پر اپنے دائرہ سے باہر نکل جائیں ، یہاں تک کہ سورج اور چاند جیسی قدرت کی نشانیاں اپنے تمام تر جلال و جمال کے باوجود قدرت کی طرف سے کھینچی ہوئی لکیروں پر ہی رقص کرنے پر مجبور ہیں ، مجال نہیں کہ وہ بالشت بھر بھی آگے یا پیچھے ہو جائیں ؛ لیکن خدا نے حضرت انسان کو کچھ اس طرح بنایا ہے کہ بحر و بر ، خشکی و تر ، یہاں تک کہ فضائیں بھی اس کے قدموں سے پامال ہیں ، چنانچہ کسی انسان کو اگر چلنے پھرنے سے روک دیا جائے اور ایک کمرہ یا عمارت میں قید کر دیا جائے تو اس کے لئے یہ ناقابل برداشت تکلیف ہوتی ہے ۔

اس آزادی کو ثمر آور اور نتیجہ خیز بنانے کے لئے قدرت نے اس کو اختراعی صلاحیتوں سے بھی نوازا ہے ، وہ اپنے وجود سے لے کر اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی دنیا تک ہر جگہ اپنی صلاحیت کے جلوے دکھاتا رہتا ہے ، اس کی یہ کاوشیں کبھی صحیح سمت میں ہوتی ہیں اور کبھی غلط سمت میں ؛ چوں کہ انسان کا امتحان مقصود ہے ؛ اسی لئے اسے ایک خاص حد تک ارادہ و عمل کی طاقت عطا کی گئی ہے ، اس سے فائدہ اٹھا کر بعض اوقات انسان اپنی صلاحیت کو خاص کر شہوات و خواہشات کو پورا کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے ، یہ خواہشات بنیادی طور پر تین قسم کی ہیں : ایک خورد و نوش

کی، دوسرے: رہائش کی، تیسرے: صنفی تقاضوں کی۔

کھانا پینا انسان کی سب سے بڑی ضرورت بھی ہے اور اس کے لئے سامان لذت بھی؛ اسی لئے تمدن کے ابتدائی دور سے ہی انسان عمدہ سے عمدہ پکوان کا تجربہ کرتا رہا ہے اور آج تک اس کا سلسلہ جاری ہے، اگر انسان صحیح رخ پر اس کی کوشش کرتا تو یقینا یہ اس کے لئے نفع کی بات ہوتی؛ لیکن انسان کے مزاج میں جو لذت پرستی اور تکمیل شہوات کا جذبہ ہے، اس نے اس کو جائز حدود پر قانع رہنے نہیں دیا، اس کی مثال منشیات کا استعمال ہے، ساری دنیا کے اصحاب دانش متفق ہیں کہ نشہ انسان کی عقل کو بھی متأثر کرتا ہے اور مختلف اعضاء رئیسہ پر بھی اثر انداز ہوتا ہے؛ لیکن لذت پرستوں کے نزدیک یہ زائد خشک کا وعظ ہے اور قطعا قابل توجہ نہیں، اس سے آگے بڑھ کر بعض انسانوں نے سانپ، کیڑے مکوڑے اور درندہ خونخوار جانوروں کو بھی کھانا شروع کر دیا اور کھانے پینے کے معاملہ میں ان کے یہاں حلال اور حرام کے درمیان کوئی سرحد باقی نہیں رہی، آج مختلف قسم کی بیماریوں کا ایک سبب یہ بھی ہے۔

انسان اپنے مکان اور بہتر سے بہتر رہائش کے لئے شروع سے کوشاں رہا ہے، قرآن میں بعض ایسی قوموں کا ذکر ہے، جو پہاڑوں کو تراش کر اپنے عشرت کدے بناتے تھے، ہندوستان میں بھی بودھوں کی تراشیدہ خانقاہیں موجود ہیں، آج نہ صرف تعمیر میں تنوع اور نت نئے ڈیزائن کا سیلاب آیا ہوا ہے؛ بلکہ انسان سمندر میں وقت گزاری کا اور پانی کے سینہ پر تیرتے ہوئے مکانات کا لطف اٹھا رہا ہے اور اب تو فضاء میں بھی پکنک منانے کے لئے کوشاں ہے۔

انسان کی لذت اندوزی کا تیسرا ذریعہ اس کی صنفی خواہشات ہیں، بعض دفعہ جب انسان خدا کے خوف سے آزاد ہوجاتا ہے تو وہ دوسری خواہشات سے بڑھ کر اس کا پرستار ہوجاتا ہے، یہی نفس کی غلامی اور ہوس کی بندگی انسان کو غیر قانونی اور غیر شریفانہ جنسی تعلقات کی طرف لے آتی ہے، یہ ایسی آگ ہے، جو اخلاق اور شرم وحیاء کے لباس کو خاکستر کر کے رکھ دیتی ہے، دنیا کی مختلف قومیں اس کی مرتکب ہوتی رہی ہیں اور یہی چیز بالآخر ان تہذیبوں کے زوال؛ بلکہ بعض اوقات نام ونشان تک مٹ جانے کے باعث ہوئے ہیں، یونان وروم اور ایران کی تمدنی تاریخ اس پر گواہ

ہے اور اس وقت مغرب اسی راستے پر اپنے قدم بڑھا رہا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کی خواہشات کو دو ہی چیزیں لگام دے سکتی ہیں: ایک تو مادی نقصان کا خطرہ، دوسرے مذہب کا یقین، مادی نقصان کا خطرہ یقیناً مادہ پرست انسانوں کو روکنے میں بہت سی دفعہ مؤثر ثابت ہوتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی مریض اپنی مرغوب اشیاء سے پرہیز نہیں کرتا؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے انسان جب مادی خواہشات کا دیوانہ بن جاتا ہے تو وہ ایسے خطرات کو بھی خاطر میں نہیں لاتا؛ مذہب خواہ کوئی بھی ہو، توحید پر مبنی ہو یا شرک پر، انسان آمیزشوں اور ملاوٹوں کا شکار ہو چکا ہو یا اس محفوظ ہو، اس کی بنیاد خدا کے یقین اور آخرت کے تصور پر ہوتی ہے، یہ تصور انسان کے اندر جواب دہی کے احساس کو ابھارتا ہے، یہ یقین رات کی تاریکی اور کمرے کی تنہائی میں بھی اس کے قدم تھام لینے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ ضمیر کو زندہ رکھتا ہے اور وہ جرم کے ارادہ پر اسے ملامت کرتا ہے، یہ محض ایک نظریہ نہیں ہے؛ بلکہ ہر زمانہ میں مذہب سے تعلق رکھنے والوں کی زندگی اس پر شاہد ہے؛ اس لئے مذہب ایک پُرسکون اور عدل پر مبنی سماج کے لئے ضرورت کا درجہ رکھتا ہے۔

افسوس کہ مغرب میں ایک طویل عہد تک مذہب اور اقتدار کے درمیان کشمکش رہی ہے، حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ کلیسا کو اس کا حق دو اور قیصر کو اس کا حق؛ لیکن ہوا یہ کہ یہ دونوں اپنی اپنی حدود سے تجاوز کرنے لگے، کلیسا کی زیادتیاں اس درجہ بڑھ گئیں کہ حکومتیں ان کے آگے بے بس تھیں اور عوام ان کے رویہ سے پریشان، عیسائی مذہبی رہنماؤں نے مذہب کو لوگوں کے استحصال کا ذریعہ بنالیا، وہ جسے چاہتے مرتد اور گمراہ قرار دے کر زندہ جلانے کی سزا دیتے، عوام کی آزادیاں سلب کر لیتے اور پیسے کمانے کے لئے مغفرت نامے فروخت کرتے، آخر یہ لڑائی کلیسا کی شکست پر ختم ہوئی اور یورپ میں آزادی کا ایسا سورج طلوع ہوا، جسے مذہب کے نام اور اس کی ایک ایک علامت سے نفرت تھی، چوں کہ یورپ بحیثیت مذہب صرف عیسائیت ہی سے آشنا تھا؛ اس لئے وہ مطلقاً مذہب کا باغی ہوگیا، اور مذاہب کی مسلمہ قدروں کو بھی اس نے ناقابل اعتناء اور ناقابل توجہ قرار دے دیا، اسی بغاوت نے ان کے گمان کے مطابق انہیں آزادی عطاء کی؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس بغاوت نے انہیں شہوات وخواہشات

کی بدترین قسم کی غلامی میں مبتلا کردیا، اور آج یہ غلامی اس مقام پر پہنچ گئی ہے، جہاں شاید جانور بھی انسان سے شرماتے ہوں گے۔

آج مغرب میں خاندانی نظام کا بکھراؤ اور قلب و روح کی بے سکونی اسی صورت حال کا نتیجہ ہے، آزادی کے اسی تصور کے تحت زنا کی تعریف بدل گئی اور زنا مرد و عورت کے غیر قانونی تعلق کا نام نہیں رہا؛ بلکہ ایسے جنسی تعلق کا نام ہوگیا، جس سے کسی انسان کا حق مجروح ہوتا ہو؛ اس لئے کسی عورت سے بالجبر بدکاری کرنا یا دوسرے کی بیوی سے جنسی تعلق زنا کہلایا؛ کیوں کہ پہلی صورت میں اس عورت کے ساتھ اور دوسری صورت میں اس کے شوہر کے ساتھ زیادتی روا رکھی گئی؛ لیکن اگر یہی فعل باہمی رضامندی سے کیا جائے تو اسے جرم نہیں سمجھا گیا، اس سے ایک دوسری صورت یہ پیدا ہوئی کہ شوہر و بیوی کی ایک دوسرے کے ساتھ وفاداری ختم ہوتی چلی گئی اور ازدواجی زندگی ایک ایسی راہ گزر بن گئی، جس میں زندگی کے مسافر کچھ دور تک ایک دوسرے کے ساتھ چلیں اور پھر اپنی اپنی پسند کے راستے پکڑلیں؛ اسی لئے نکاح کی شرح کم ہونے لگی اور ایک ایسے طریقۂ زندگی کی طرف رجحان بڑھنے لگا کہ بغیر نکاح کے مرد و عورت جب تک جی چاہے ایک دوسرے کے ساتھ رہیں اور جب یہ رفاقت بوجھ محسوس ہونے لگے تو الگ ہوجائیں، جس کو آج کل ''لیونگ لائف'' کہتے ہیں، اس طرح وہ نکاح اور طلاق کے بعد آئندہ ہونی والی ذمہ داریوں سے محفوظ رہیں گے اور اپنی خواہش پر عمل کرنے میں بھی آزاد ہوں گے۔

زندگی گزارنے کے اسی طریقہ نے پھر اس تصور کو جنم دیا کہ اولاد سے دامن بچایا جائے؛ کیوں کہ بچے ماں باپ کی عیش کوشی میں بھی رکاوٹ بن جاتے ہیں، اور جب مرد کا ساتھ چھوٹ جاتا ہے تو وہ عورت کے لئے بوجھ بن جاتے ہیں؛ اس لئے مغرب میں شرح پیدائش کم ہوتی جارہی ہے، اور اگر ایشیاء و افریقہ کے تارکین وطن نہ ہوں تو شاید بالکل ہی تھم جائے؛ لیکن انسان کے اندر صاحب اولاد ہونے کا ایک فطری جذبہ بھی پایا جاتا ہے؛ اس لئے اولاد کو گود لینے کا سلسلہ شروع ہوا، اور مغربی ملکوں میں اس کو قانونی حیثیت دے دی گئی، جس کا اصل مقصد تو صاحب اولاد ہونے کے جذبہ کی تسکین ہے؛ لیکن اسے نام بچوں کی بہبود اور ان کی خدمت کا دیا جاتا ہے،

پھر خواہشات کے عفریت نے اسی پر اکتفاء نہیں کیا؛ بلکہ لذت چشتی کے نئے نئے تجربات کرتے ہوئے ہم جنسی اور محرم رشتہ داروں کے ساتھ جنسی تعلق کو بھی بہت سے ملکوں میں قانونی طور پر جائز قرار دے دیا گیا اور بہت سے ملکوں میں اس کی کوشش جاری ہے، قرآن مجید کے بیان کے مطابق جب قوم لوط کو وقت کے پیغمبر حضرت لوط علیہ السلام نے ان کے اس فعل پر ملامت کی تو انہوں نے یہ تو کہا کہ ہماری رغبت اس غیر فطری عمل کی طرف ہے، مگر وہ اس کے لئے کوئی دلیل نہیں دے سکے؛ لیکن یہ زمانہ چوں کہ علمی اور تہذیبی ترقی کا ہے؛ اس لئے غلط سے غلط عمل کیوں نہ ہو، اس کے لئے دلیلیں تراش لی جاتی ہیں اور پھر اتنی قوت سے اس کی تشہیر کی جاتی ہے، کہ لوگوں کو تاریکی روشنی اور جھوٹ سچ نظر آنے لگتا ہے، چنانچہ اس وقت مغرب کی کوشش ہے کہ جس گلوبلائزیشن کا نعرہ لگایا جارہا ہے، وہ تجارت ہی تک محدود نہ رہے؛ بلکہ زندگی کے بنیادی تصورات اور طریقۂ زندگی کو بھی مغرب سے مشرق کی طرف ایکسپورٹ کیا جائے۔

اس کی عملی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، کہنے کو ہم ایک آزاد قوم ہیں اور بڑے تزک واحتشام کے ساتھ یوم آزادی مناتے بھی ہیں؛ لیکن حقیقت میں ہم اس وقت بدترین غلامی کے دور سے گذر رہے ہیں، جس میں ہمارے دل و دماغ کو غلام بنالیا گیا ہے، حال ہی میں ایک مسلمان دانش ور کا مضمون نظر سے گذرا، جس میں نہ صرف ہم جنسی؛ بلکہ بغیر شادی کے مرد وعورت کے ایک ساتھ زندگی گذارنے اور محرم رشتہ داروں سے ازدواجی تعلق کو بھی بہت ہلکے انداز میں پیش کیا گیا ہے اور ہم جنسی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے، مذہب سے تعلق رکھنے والوں کو خواہ مخواہ اس میں دخل نہیں دینا چاہئے، کسی بھی برائی کی کثرت جب عادت کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو یہ ایک بیماری ہی بن جاتی ہے، بہت سے قاتل بھی اپنے اندر پائے جانے والے غیر معمولی جذبۂ انتقام اور جوش وغضب کی وجہ سے قتل کرتے ہیں، شراب پینے والا شراب پینے کے لئے بے چین رہتا ہے، تو کیا ان کو جرم نہیں سمجھا جائے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ جو ارادہ و اختیار کے ساتھ عقل وشعور سے بہرہ ور ہونے کے باوجود کسی غیر قانونی فعل اور غیر فطری عمل کا ارتکاب کرتا ہے، وہ مجرم ہے۔

مسلمانوں کی نئی نسل کو چاہئے کہ وہ ایسے فتنوں کو سرسری انداز سے نہ دیکھیں اور اسے اتفاقی

واقعہ تصور نہ کریں، دراصل اس کے پیچھے تحریف شدہ عیسائیت اور انسانیت کی کشمکش، پھر عیسائی مذہبی اداروں کی شکست اور اس کے نتیجہ میں مغربی دنیا کا مذہب کے خلاف بغاوت اور مذہب کی مسلمہ اقدار کی مخالفت کی طویل تاریخ کارفرما ہے، جس کے نتیجہ میں مغربی سماج میں خاندانی نظام بکھر چکا ہے اور اب مغرب چاہتا ہے کہ جس آگ میں وہ خود جل رہا ہے، اسے مشرق تک پہنچا دے، یہ سب کچھ بے خدا تمدن کی بازگشت ہے اور پوری قوت کے ساتھ اسے روکنا پوری انسانیت کا فریضہ ہے۔

۳۱/ جولائی ۲۰۰۹ء

خواصِ امت اور ہمارا سماج

گنے کی پہچان اس کی مٹھاس ہے اور مرچ کی شناخت اس کی تیزی ہے، اگر گنا مٹھاس سے اور مرچ تیزی سے خالی ہو جائے تو بجا طور پر انسان کو حیرت ہوتی ہے، اسی طرح علماء، حفاظ، مذہبی قائدین، دعوتی کارکنان دینی اعتبار سے امت کے خواص ہیں، لوگ بجا طور پر توقع رکھتے ہیں کہ ان کی زندگی کی دینی سطح عام لوگوں سے بہتر ہو، دینداری ہی سے ان کی شناخت ہوتی ہے اور اسی نظر سے لوگ انہیں دیکھتے ہیں، ایسے لوگ اگر کھلے عام احکام شریعت کو پامالی کریں اور سنتِ نبوی کو قابلِ اعتناء نہ سمجھیں، تو بجا طور پر لوگوں کو حیرت ہوتی ہے اور وہ حیرت کرنے میں حق بجانب ہیں، انسان چاہتا ہے کہ اس کی زندگی کیسی بھی ہو؛ لیکن اس کے مقتدا کی زندگی بہتر ہو؛ کیوں کہ عام افراد سے صرف اس کا عمل متعلق ہوتا ہے اور جو لوگ قوم کے رہنما اور رہبر ہوتے ہیں، ان سے پوری قوم کی زندگی متعلق ہوتی ہے، ان کی حیثیت قبلہ نما کی ہے، انہیں دیکھ کر لوگ اپنی دینی زندگی کے لئے نقشہ بناتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے مقتدیوں کے لئے کوئی معیار نہیں فرمایا کہ نماز کا مقتدی یہی ہوسکتا ہے، جو سنت کا عالم ہو، بہتر طور پر قرآن پڑھ سکتا ہو، اس کے اندر ورع وتقوی ہو، وغیرہ، اس طرح کی صفات آپ ﷺ نے نماز میں اقتدا کرنے والوں کے لئے بیان نہیں فرمائی؛ لیکن امام کے لئے آپ ﷺ نے ضرور معیارات مقرر کئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ امامت کا سب سے زیادہ مستحق ہے جو قرآن زیادہ بہتر طور پر پڑھنے سے واقف ہو، پھر وہ ہے، جو سنت سے زیادہ واقف ہو، پھر وہ ہے، جو ورع وتقوی میں بڑھا ہوا ہو۔۔۔ (صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب من أحق بالإمامة، حدیث نمبر: ۲۹۰ / ۶۷۳)

افسوس کہ معاشرہ کی عام سطح تو گرتی ہی جارہی ہے، خواصِ امت کا حال بھی بہتر نہیں ہے، اور ان کے اندر بھی اخلاقی انحطاط جو پیدا ہو رہا ہے، وہ بھی معاشرہ کے انحطاط کا ایک سبب ہے، اس

وقت مسلم سماج کا ایک سلگتا ہوا مسئلہ نکاح کی تقریبات میں فضول خرچی ہے، قرآن مجید میں بار بار فضول خرچی سے منع کیا گیا ہے؛ بلکہ یہاں تک فرمایا کہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں: {إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا إِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ} (الإسراء: ۲۷) یوں تو پوری زندگی میں سادگی ہونی چاہئے، رسول اللہ ﷺ نے خود اس کا عملی نمونہ امت کے سامنے رکھ دیا؛ لیکن نکاح کے بارے میں خاص طور پر فرمایا کہ اس میں جس قدر سادگی ہو اور جتنا کم خرچ کیا جائے، اتنی ہی برکت ہوگی: ''إن أعظم النكاح بركة أيسره مؤنة'' (مسند أحمد بن حنبل، حدیث نمبر: ۲۴۵۷۳) —— لیکن اس وقت اسراف، فضول خرچی، نمائش اور اس میں مسابقت کا سب سے بڑا موقع نکاح بن گیا ہے، عام لوگوں کا اس موقعہ پر جو رویہ ہوتا ہے، وہ مخفی نہیں ہے؛ لیکن مذہبی شخصیتیں بھی اب بعض اوقات عوام ہی کی سطح پر آجاتی ہیں، یہ بہت افسوس ناک اور قابلِ فکر مسئلہ ہے، مجھے اور مجھ جیسے کئی لوگوں کو چند سال پہلے ایک ایسی تقریب میں شرکت کا موقع ملا، جس میں شہر کی کئی اہم مذہبی شخصیتیں اسی مسئلہ پر غور کرنے کے لئے بیٹھی تھیں، ایک معروف شخصیت —— جن سے بہت سے لوگ عقیدت رکھتے ہیں، —— انہوں نے نکاح کے بارے میں بڑا عمدہ خطاب فرمایا اور اس بات پر زور دیا کہ جن تقریباتِ نکاح میں فضول خرچی سے کام لیا جارہا ہو، علماء ومشائخ کا فریضہ ہے کہ وہ ہرگز اس نکاح میں شریک نہ ہوں، اس کے چند ہی دنوں کے بعد ان کی صاحبزادی کا عقد تھا، یہ حقیر بھی ان کی دعوت پر شریک ہوا، وہاں مذہبی، سیاسی وسماجی قائدین، عمائدین شہر اور علماء ومشائخ کی بڑی تعداد شریک تھی؛ لیکن افسوسناک بات ہے کہ فضول خرچی کا جو مظاہرہ وہاں دیکھنے میں آیا، کم ہی اس درجہ تزک واحتشام اور اسراف دیکھنے میں آتا ہے، ظاہر ہے کہ جن رہبروں کا یہ حال ہو اور جن کا عمل ان کی زبان کا رفیق نہ ہو تو بیچارے عوام کو کیا قصور وار ٹھہرایئے؟

ابھی چند دنوں پہلے روزنامہ منصف حیدرآباد میں ایک حافظِ قرآن کی تقریبِ نکاح کی داستان آئی ہے، مجھے نہیں معلوم ہے کہ یہ کس حد تک مبنی برحقیقت ہے، خدا کرے کہ یہ افسانہ ہو، نہ کہ حقیقی داستان؛ لیکن اس مضمون کے مطابق مضمون نگار نے آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے اور نہ صرف الفاظ کے ذریعہ واقعہ کی عکاسی کی ہے؛ بلکہ اسٹیج کی تصویر بھی دے دی ہے، جس میں لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کررہے ہیں، بیان کے مطابق ایک حافظِ قرآن نے اپنی

شادی میں اپنے والد کے منع کرنے کے باوجود چار رقاصاؤں کو مدعو کیا، دو مرد اور دو خاتون گلوکار بھی بلائے گئے، یہ سب ایسے مختصر لباس میں تھیں کہ گویا ان کے لئے کپڑے کا بوجھ اٹھانا مشکل ہو رہا ہو، نوشہ کی خواہش پر گلوکار نے پہلے حمد، پھر نعت، پھر تہنیتی نظم پڑھی اور بیہودہ نغموں کا دور اس پر رقص کا سلسلہ شروع ہو گیا، جوس اور کھانے کی سپلائی کے لئے بھی بہ طور ویٹر نوجوان لڑکیوں کو بلایا گیا تھا، غرض کہ زیادہ سے زیادہ بے حیائی اور بے ہودگی ایسی تقریبات میں کی جاسکتی ہے، ان سب کا سروسامان کیا جاسکتا تھا، ان نوشہ صاحب نے پہلے حفظِ قرآن کریم کی تکمیل کی، پھر تجارت شروع کی، ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے اس تجارت میں اسبابِ دنیا ہی کو نہیں بیچا؛ بلکہ متاع دین، غیرتِ علم اور حمیتِ ایمانی کو بھی فروخت کر دیا، **فیاعجباہ ویا اسفاہ!!**

غور کیا جائے کہ جب علماء، مشائخ، حفاظ اور دینی کام کرنے والے لوگ اس سطح پر آجائیں، تو عوام سے کیا شکایت ہو؟ بعض علماء نے نقل کیا ہے کہ اگر علماء مستحبات و آداب پر عمل کرنے لگیں تو عوام اپنے آپ کو جائز اور مباح پر قائم رکھ سکے گی اور حرام سے بچ سکے گی اور اگر علماء مباح اور جائز پر قناعت کرلیں گے تو عوام مکروہ اور حرام میں پڑ جائے گی؛ کیوں کہ اقتدا کرنے والوں کی سطح بہر حال ان لوگوں سے کم تر ہوتی ہے، جن کی اقتدا کی جاتی ہے؛ کیوں کہ خواص امت کی حیثیت امت کے لئے آئینہ کی ہے، جن کی زندگی میں جھانک کر عوام اپنے لئے زندگی کا نقشہ بناتی ہے اور اگر آئینہ ہی غبار آلود ہو تو سامنے رکھ کر کیسے چہرے کے خط و خال درست کئے جاسکتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے علماء کا بڑا اونچا درجہ بیان فرمایا ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ علماء کی زمین پر وہی حیثیت ہے، جو آسمان پر ستاروں کی:

"إن مثل العلماء في الأرض كمثل النجوم في السماء يهتدى بها في ظلمات البر و البحر، فإذا انطمست النجوم أو شک أن تضل الهداة" (مسند أحمد بن حنبل، حدیث نمبر: ۱۲۶۲۱)

دوسرے ستارے آسمان کے لئے زینت و آرائش کا ذریعہ ہیں: **{إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ}** (الصافات: ۶) تیسرے یہ ستارے شیاطین کو بھگاتے ہیں اور ان کے شر و فتنہ سے دنیا کو بچاتے ہیں:

{ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُوماً لِّلشَّيَاطِينِ} (الملک:۵)

اس سے معلوم ہوا کہ علماء تین بنیادی ذمہ داریاں ہیں، ایک یہ کہ وہ امت کے رہنمائی کا فریضہ انجام دیں، دوسرے وہ امت کے لئے دین کے اعتبار سے زینت کا درجہ رکھتے ہیں، یعنی ان کی زندگی اس قدر پاکیزہ صاف ستھری اور شریعت کے مطابق ہو کہ وہ مذہبی پہلو سے وہ اعلیٰ ترین معیار پر ہوں، تیسرے وہ شیطانی فتنوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور یہ فتنہ فکر وعقیدہ کے راستہ سے آیا ہو یا عمل کے راستے، غور کیجئے کہ کیا قول وفعل کے تضاد کے ساتھ کیا ان ذمہ داریوں کو انجام دیا جاسکتا ہے؟

اس لئے اس پہلو پر غور کرنے اور توجہ دینے کی ضرورت ہے، امام ابوحنیفہؒ کے بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ کوئی بوڑھی عورت پھسل رہی تھی اور اس کے گرجانے کا اندیشہ تھا؛ امام صاحب نے توجہ فرمائی تو اس مردم شناس عورت نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا: تم میری فکر نہ کرو، میں پھسلوں گی تو ایک شخص پھسلے گا اور آپ پھسلیں گے تو ایک دنیا پھسل جائے گی، اسی حقیقت کو بعض اہل علم نے کہا ہے کہ '' عالم کی لغزش پورے عالَم کی لغزش ہے: ''**زلة العالِم زلة العالَم**'' (رفع الأستار: ۱/ ۴۷، المستقصی في أمثال العرب: ۲/ ۱۱۰) —— خواصِ امت کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہئے اور علماء کا لفظ تو علامتی لفظ ہے، اس حکم میں وہ تمام لوگ شامل ہیں، جو امت میں مقتدا کا درجہ رکھتے ہیں، جو دینی کاموں کے ذمہ دار ہوں، جو مذہبی اداروں، جماعتوں اور تحریکوں کے رہنما ہوں، لوگوں کی مذہبی قیادت جن کے ہاتھوں میں ہو، جو اصحابِ نظر اور اصحاب قلم ہوں، جن کی شرکت کو پروگراموں کی کامیابی سمجھا جاتا ہو، جن کے وجود سے اسٹیجوں کی صفائی میں ان کی مثال دی جاتی ہو، ان کے اخلاق کی شیرینی مخاطب کی کڑواہٹوں کو بھی کافور کردیتی ہو؛ لیکن اس وقت صورت حال یہ ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں اور خاص کر مال ودولت اور عزت وجاہ کی طلب اور مادیت کے مظاہرہ میں عوام وخواص کے درمیان سرحدیں مٹتی جارہی ہیں اور فرق کم یا ختم ہوجاتا رہا ہے، اگر خواصِ امت کا رویہ یہ رہے تو صرف وعظ وتقریر اور مضامین ومقالات سے سماج میں کوئی بہتر تبدیلی نہیں آسکتی۔

خواصِ امت کو نہ صرف اپنی زندگی کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنا چاہئے ؛ بلکہ ایسا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے کہ لوگ سمجھ سکیں کہ یہی بہتر طریقۂ زندگی کا معیار ہے، وہ ایسی تقریبات میں شرکت سے گریز کریں، جو شریعت کے دھارے سے ہٹی ہوئی ہو، خواصِ امت کے رویہ سے لوگ محسوس کرنے لگیں کہ جو لوگ ایسی فضول خرچیاں کرتے ہیں، وہ ناپسندیدہ لوگ ہیں، جو توقیر کی مستحق نہیں ہیں ؛ بلکہ نظر انداز کئے جانے کے لائق ہیں، جب تک خواصِ امت اپنے مزاج اور طرز عمل میں تبدیلی نہ لائیں گے، اس وقت تک سماج میں کوئی صالح انقلاب نہیں آسکتا ؛ کیوں کہ اگر کھانے کا ذائقہ خراب ہو تو نمک کے ذریعہ اسے درست کیا جاتا ہے ؛ لیکن اگر نمک ہی خراب ہو تو کس طرح اس کا علاج ہو سکتا ہے ؟ ؟

۷/ اگست ۲۰۰۹ء

شرعی مسائل میں اختلاف اوراس کے آداب

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کوتنوع اوراختلاف کی اساس پر پیدا کیا ہے، دنیا کی تمام چیزوں میں یہ کیفیت نمایاں ہے، نباتات اور درختوں کو دیکھئے! کوئی سبز ہے، توکوئی زرد اور کوئی سرخ، ہر ایک کے پتوں کے ڈیزائن الگ الگ ہیں، پھلوں کی جسامت اور شکلیں بھی مختلف ہیں، رنگ و روپ کے ساتھ ساتھ مزے بھی الگ الگ ہیں اوران کے اثرات اورخاصیتیں بھی علاحدہ ہیں، یہی صورتِ حال جانوروں میں ہے اوریہی طرزِ تخلیق بنی نوعِ انسان میں بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان کے رنگ وروپ، قدوقامت، جسمانی ساخت اورآواز میں فرق رکھا ہے، اسی طرح اس کے اندازِ فکر اورسوچ میں بھی فرق واقع ہوا ہے؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کوسفید رنگ پسند ہے اورکسی کوسرخ، کسی کوسیاہ اورکسی کوسبز، کسی کی ترجیح سیب ہے اورکسی کی انار، کسی کوگرم موسم راس آتا ہے، کسی کوسرد موسم، اسی اختلافِ ذوق سے کائنات کی رنگارنگی قائم ہے، ورنہ یہ پوری دنیا یک رنگ ہوجاتی اور جونظارہ اس وقت ہمیں دیکھنے کوملتا ہے، آنکھیں اس سے محروم رہتیں۔

اسلام چوں کہ دین فطرت ہے؛ اس لئے اس نے انسان کوفکر ونظر کے اعتبار سے ایسے بے لچک احکام نہیں دیئے کہ اس کے لئے غور وفکر کا کوئی موقع باقی نہ رہ جائے — اللہ تعالیٰ نے حق کی رہنمائی فرمائی اورحق پر چلنے والوں کے لئے جنت اور باطل کا راستہ اختیار کرنے والوں کے لئے دوزخ بھی قائم کردی، اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو ہدایت یافتہ لوگوں کو پابند کرتے کہ وہ گمراہ لوگوں کو بزورِ طاقت اللہ کے بھیجے ہوئے دین کوقبول کرنے پر مجبور کردیں؛ لیکن قرآن میں ایسا حکم نہیں دیا گیا؛ بلکہ فرمایا گیا کہ ہدایت اورگمراہی پوری طرح واضح ہے، اب دین کے معاملہ میں کوئی جبر روا نہیں؛ البتہ آخرت میں انسان کے اعمال کے اعتبار سے ثواب وعذاب کا ترتب ہوگا:

{لاَ إِكْرَاهَ فِيْ الدِّيْنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ

بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لاَ انفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ} (البقرۃ:۲۵۶)

پھر انسان کو جو احکام دیئے گئے ، ان میں کچھ تو وہ ہیں ، جن کا قرآن وحدیث سے یقینی طور پر ثبوت ہے اور اس کا مفہوم بھی اتنا واضح ہے کہ انسان کا ذہن فوراً اس کے معنی ومقصود کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے ، ایسے احکام فقہ کی اصطلاح میں 'قطعی احکام' کہلاتے ہیں ، یعنی ان کا ثبوت بھی یقینی ہے اور اس کلام کی اپنے معنی ومفہوم پر دلالت بھی واضح ہے ، ان احکام کی حیثیت دین کی حدودِ اربعہ کی ہے ، کسی مسلمان کے لئے ان سے باہر چلا جانا جائز نہیں ؛ بلکہ اس سے باہر نکلنا انسان کو دائرہ ایمان ہی سے باہر کر دے گا ، جیسے اللہ تعالیٰ کا ایک ہونا ، رسول اللہ ﷺ پر سلسلۂ نبوت کا ختم ہو جانا ، آپ ﷺ کا معصوم ہونا ، پانچ وقت کی نماز کا فرض ہونا ، قرآن وحدیث کا دین میں حجت ہونا ، رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی ایسے انسان کا نہیں آنا ، جو معصوم ہو اور جس کا قول وفعل حجت ہو ، نیکو کاروں کے لئے آخرت میں جنت اور بدکاروں کے لئے آخرت میں دوزخ کا ہونا ، نجات کے لئے شریعتِ محمدی پر ایمان کا ضروری ہونا وغیرہ ، یہ اور اس طرح کے بہت سے عقائد واعمال وہ ہیں ، جو قرآن وحدیث سے پوری تصریح کے ساتھ ثابت ہیں ، ان کا انکار بالواسطہ کتاب وسنت کا انکار کرنا ہے ؛ اس لئے اگر کوئی شخص اس سے اختلاف کرتا ہے ، تو وہ ہدایت سے محروم ہے ۔

دوسرا درجہ ان احکام کا ہے ، جو ایسی حدیثوں سے ثابت ہیں کہ محدثین کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی طرف ان کی نسبت یقین کے درجہ میں نہیں ہے یا ان کے بارے میں ایک سے زیادہ روایتیں ہیں اور ان کا مضمون ایک دوسرے سے کسی قدر مختلف ہے ؛ —— البتہ یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل میں کوئی تضاد نہیں ہو سکتا ؛ اس لئے یہ اختلاف نقل کرنے والوں کی غلط فہمی کی وجہ سے واقع ہوا ہے ، یا اس لئے کہ آپ کے مختلف ارشادات ومعمولات کا موقع ومحل الگ الگ ہے ، راوی اس کی وضاحت نہیں کر سکا ، یا اس لئے کہ ایک حکم پہلے کا ہے اور دوسرا بعد کا ، —— اسی طرح بعض مسائل ثابت تو ہوتے ہیں یقینی دلیلوں سے ؛ لیکن ان میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال ہوتا ہے ؛ کیوں کہ ہر زبان کی طرح عربی زبان میں بھی ایسے الفاظ موجود ہیں ، جن کے ایک سے زیادہ مفہوم ہو سکتے ہیں یا ایک حقیقی معنی ہوتا ہے اور تشبیہ کے طور پر دوسرے معنی میں

بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے، نیز بعض احکام ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کا قرآن وحدیث میں صریحاً ذکر نہیں ہوتا، فقہاء ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے رفقاء عالی مقام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فتاویٰ سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور ان میں اختلاف ہوتا ہے، یا خود کتاب وسنت سے مستنبط اُصولوں اور نظیروں کو سامنے رکھ کر رائے قائم کرتے ہیں — یہ احکام جو اپنے ثبوت یا وضاحت کے اعتبار سے یقینی درجہ کے حامل نہیں، ان کو ظنی اور اجتہادی مسائل کہا جاتا ہے۔

گذشتہ اُمتوں میں اللہ کے رسولوں اور پیغمبروں ہی کے ذریعہ اللہ کے احکام کی وضاحت ہوتی تھی اور وہی اس مقام پر فائز تھے؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کی ختم نبوت کی برکت سے اس اُمت کو یہ اعزاز بخشا گیا کہ اس کے علماء ایسے مسائل میں اجتہاد سے کام لیں؛ بشرطیکہ وہ احکام شریعت میں اجتہاد کرنے کے اہل بھی ہوں، آپ ﷺ نے نہ صرف اجتہاد کی تلقین کی ہے؛ بلکہ حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر کسی فقیہ کا اجتہاد درست اور صائب نکلے تو اس کو تو دہرا اجر ہے؛ لیکن جس سے اجتہاد میں چوک ہوجائے، وہ بھی اجر سے محروم نہیں رہے گا: ''**من اجتهد فأصاب فله أجران، و من أخطأ فله أجر**'' — اب سوال یہ ہے کہ کیا دنیا میں ان دو میں ایک اجتہاد کو غلط کہا جائے گا؟ جب کہ ہمارے سامنے یقینی طور پر کسی رائے کا صحیح اور کسی کا غلط ہونا واضح نہیں ہے، تو اس سلسلہ میں ایک رائے یہ ہے کہ دونوں کو صائب ہی سمجھا جائے گا اور اس اختلافِ رائے کی حیثیت ایسی ہی ہوگی، جیسے بعض غلطیوں کے مختلف کفارات متعین کئے گئے ہیں اور انسان کو اس کی صلاحیت اور استطاعت کے اعتبار سے کفارہ ادا کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، یہ رائے مختلف علماء اور ہندوستان کے علماء میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، دوسری رائے یہ ہے کہ اس میں ایک ہی رائے درست سمجھی جائے گی اور دوسری خطا؛ لیکن ہر دو نقطۂ نظر میں درستی اور نادرستی کے احتمال کو تسلیم کیا جائے گا، یہ زیادہ تر اہل علم کی رائے ہے؛ لیکن اجتہاد میں خطا نہ دنیا میں قابل گرفت ہے نہ آخرت میں؛ بلکہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی رائے ہے کہ کن آراء میں کس فقیہ کی رائے درست تھی اور کن کی غلط؟ میدانِ حشر میں بھی اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر نہیں فرمائیں گے اور علامہ کشمیری کی یہ رائے سمجھ میں آتی ہے؛ کیوں کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کا اعزاز فرمائیں گے اور یہ بات کہ ان کی کمزوریوں کو حشر میں ظاہر کیا جائے، ان کے اعزاز وتوقیر کے خلاف محسوس ہوتی

ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا اجتہاد کی اجازت دینا اور اجتہادی غلطی کو قابل عفو قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت کے بہت سے احکام وہ ہیں، جن میں ایک سے زیادہ رائیوں کی گنجائش ہے اوران میں فقہاء اُمت کے درمیان اختلاف ہوسکتا ہے، نیز یہ کوئی مذموم اور ناپسندیدہ بات نہیں، اگر اللہ تعالیٰ کو یہ بات منظور ہوتی کہ احکام شریعت میں کوئی اختلاف نہ ہو، تو جیسے قرآن میں ایمانیات کو واضح کردیا گیا ہے، اسی طرح تمام عقائد اور اعمالِ صالحہ کو ایسی وضاحت سے بیان کردیا گیا ہوتا کہ صحابہ ؓ اور بعد کے دور میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوتا؛ کیوں کہ یہ بات یقینا خدائے علام الغیوب کے علم میں تھی کہ میرے بندوں میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے، جن کے درمیان اس کی تشریح وتوضیح میں اختلاف ہوگا۔

یہ اختلافِ رائے اُمت کے لئے زحمت نہیں رحمت ہے، اُمت کے ایک بڑے فقیہ علامہ ابن قدامہ حنبلی نے لکھا ہے کہ اس اُمت کا اتفاق حجت قاطعہ ہے اور اس کا اختلاف رحمتِ واسعہ ہے: ''**إتفاقهم حجة قاطعة و اختلافهم رحمة واسعة**'' (مقدمہ، المغنی) —— یہ بات مختلف علماء نے لکھی ہے، جن میں شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ بھی شامل ہیں؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے صحابہ کے درمیان بعض مسائل میں اختلاف پیدا ہوا یا اس کی تشریح وتوضیح مختلف حضرات نے الگ الگ طور پر کی اور آپ نے اس کا برا نہیں مانا، مثلاً غزوۂ خندق کے بعد آپ نے اعلان فرمایا کہ تمام لوگ بنوقریظہ کی طرف کوچ کریں اور وہیں عصر کی نماز پڑھیں، اب بعض حضرات نے اس کا مطلب سمجھا کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ بلا تاخیر بنوقریظہ کی طرف نکل جائیں، یہ مقصد نہیں ہے کہ لازماً بنوقریظہ ہی میں نماز عصر ادا کی جائے؛ اس لئے وہ مدینہ سے فوراً روانہ ہوگئے ؛لیکن راستہ میں نماز پڑھتے ہوئے بنوقریظہ تشریف لائے، اور بعض نے تعمیل حکم نبوی کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بنوقریظہ پہنچ کر ہی نماز عصر ادا کی اور ان میں سے کسی گروہ پر بھی نکیر نہیں کی گئی، اسی طرح آیت تیمم نازل ہونے کے بعد ایک سفر میں حضرت عمر ؓ اور حضرت عمار بن یاسر ؓ دونوں کو غسل کی ضرورت پیش آئی اور پانی میسر نہیں تھا، اب حضرت عمر ؓ نے اجتہاد کیا ان کو خیال ہوا کہ تیمم صرف وضو کی جگہ پر کفایت کرتا ہے، اگر غسل واجب ہوجائے، تو یہ کافی نہیں اور حضرت

عمار بن یاسر ﷺ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جب وضو کا تیمم چہرہ اور ہاتھ کا مسح ہے، تو غسل کا تیمم پورے بدن کا مسح ہونا چاہئے ؛ اس لئے وہ ریت میں لُوٹ گئے ، تا کہ پورے بدن کا تیمم ہوجائے ، پھر جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے یہ واقعہ پیش کیا گیا، تو آپ ﷺ نے کسی کی مذمت نہیں فرمائی ؛ بلکہ فرما دیا کہ تیمم غسل کا بھی قائم مقام ہے اور ہر صورت میں تیمم کا ایک ہی طریقہ ہے، اگر اجتہاد کی بنا پر پیدا ہونے والا اختلاف مذموم و ناپسندیدہ ہوتا، تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہوتا۔

یوں تو رسول اللہ ﷺ پوری امت ؛ بلکہ پوری انسانست کے معلم و مربی تھے ؛ لیکن جس مقدس گروہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے براہ راست استفادہ کی سعادت مقرر فرمائی تھی ، وہ ہیں صحابۂ کرام ، صحابہ کے درمیان سیکڑوں مسائل میں اختلاف رائے پایا جاتا تھا ، مگر نہ وہ اسے برا سمجھتے تھے اور نہ یہ ان کے درمیان باہمی محبت ، تعلق ، ایک دوسرے کی اقتداء اور ایک دوسرے کی خوبیوں کے اعتراف میں رکاوٹ بنتا تھا ، عملی احکام سے زیادہ اہمیت اعتقادی احکام کی ہوتی ہے ؛ لیکن ان میں بھی بعض امور میں صحابہ ﷺ کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا تھا ، حضرت عبد اللہ بن عباس ﷺ کی رائے تھی کہ معراج میں رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوا اور ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس سے انکار تھا ، (فتح الباری ، کتاب التفسیر : ۸ / ۲۷۴ - ۲۷۵) ان کی رائے ہے کہ معراج کے موقع سے حضور ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اپنی اصل شکل میں دیکھا تھا ؛ حالاں کہ یہ دونوں صحابہ حضور ﷺ کے قریب ترین اہل تعلق ہیں ، حضرت عبد اللہ بن عباس ﷺ چچازاد بھائی ہیں اور کم عمر ہونے کی وجہ سے شب و روز حضور ﷺ کے ساتھ رہا کرتے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نہ صرف ازواج مطہرات میں ہیں ؛ بلکہ انہیں ازواج میں بھی خصوصی مقام حاصل تھا ، اسی طرح بعض صحابہ ﷺ کا خیال تھا کہ میت کے اہل خانہ کے میت پر رونے اور آہ و بکا کرنے کی وجہ سے میت پر عذاب ہوتا ہے ؛ لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس کی قائل نہیں تھیں ، (فتح الباری : ۳ / ۱۹۰) اسی طرح بعض صحابہ کی رائے تھی کہ مُردے سنتے ہیں اور دوسرا نقطۂ نظر تھا کہ مردے نہیں سنتے ہیں ، (فتح الباری : ۳ / ۲۷۷) غرض کہ وہ عقائد جن پر اہل سنت والجماعت متفق نہیں ہیں ، ان میں صحابہ کے دور میں بھی اختلاف رہا ہے۔

عملی مسائل میں تو اختلاف کی کثرت رہی ہے، اب تو صحابہ ﷺ کے فتاوی اور اقوال کو کتابی شکل میں جمع بھی کر دیا گیا ہے، اس اختلاف کی وجہ سے کبھی امت میں کوئی جدال پیدا نہیں ہوا اور اس نے ان کے دلوں کو نہیں توڑا، بلکہ بعد کے فقہاء نے اس اختلافِ رائے کو تحسین کی نظر سے دیکھا؛ چنانچہ خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبد العزیز علیہ الرحمۃ سے منقول ہے:

''مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ ﷺ میں کوئی اختلاف نہ ہوتا؛ اس لئے کہ اگر ہر مسئلہ میں صحابۂ کرام ﷺ کی ایک ہی رائے ہوتی تو لوگ تنگی میں پڑ جاتے؛ کیوں کہ صحابہ ﷺ امت کے مقتدیٰ ہیں، صحابہ ﷺ کے اختلاف نے سہولت پیدا کر دی کہ امت کے افراد اگر ان میں سے کسی رائے کو قبول کر لیں، تو ان کے لئے اس کی گنجائش ہے''

(أدب الاختلاف: ص: ۳۰، بحوالہ جامع بیان العلم و فضلہ، لابن عبد البر)

حضرت عمر بن عبد العزیز ہی کے ہم عصر عون بن عبد اللہ ہیں، یہ حضرت عبد اللہ بن مسعود ﷺ کے پڑپوتے ہیں اور تابعین کے ممتاز علماء میں ہیں، الفاظ کے کسی قدر فرق کے ساتھ یہی بات ان سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں:

''مجھے صحابہ ﷺ کا اختلاف محبوب ہے؛ کیوں کہ اگر وہ کسی بات پر متفق ہوں اور اسے چھوڑ دیا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے سنت ہی کو چھوڑ دیا اور ان کے اختلاف کا فائدہ یہ ہے کہ اگر صحابہ رسول میں سے کسی کی رائے پر عمل کیا جائے تو اس نے حضور ﷺ کی ایک سنت پر عمل کر لیا''

الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ اسی طرح کی بات امام قاسم بن محمد سے بھی منقول ہے، (أدب الاختلاف، بحوالہ جامع بیان العلم و فضلہ: ۲/ ۸۰) جو حضرت ابوبکر صدیق ﷺ کے پوتے ہیں اور تابعین کے عہد کے اکابر فقہاء میں ان کا شمار ہے۔

اختلافی مسائل میں فراخ چشمی، کشادہ قلبی اور اس کو اہمیت نہ دینے کا رویہ ہمیشہ سے علماء کا طریقہ رہا ہے، مشہور محدث یحیی بن سعید انصاری کا قول (أدب الاختلاف: ص: ۳۰) ہے کہ اہل علم

کے درمیان حلال وحرام کے بعض مسائل میں بھی اختلاف ہوتا رہا ہے؛ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ جس نے کسی چیز کے حرام ہونے کا فتوی دیا، اس نے اپنے مخالف فتوی دینے والے کو یہ سمجھا ہو کہ اس نے اپنے لئے ہلاکت کا راستہ اختیار کیا اور نہ ایسے امور کے حلال ہونے کا فتوی دینے والوں نے دوسرے فریق کو گمراہ اور ہلاکت کا راستہ اختیار کرنے والا قرار دیا، نہ یہ ان پر کوئی عیب لگاتے اور نہ وہ ان پر کوئی عیب لگاتے ؛ بلکہ اختلاف کے لفظ سے چوں کہ بظاہر ایک دوسرے سے دور ہونے کی بُو آتی ہے؛ اس لئے بعض علماء تو اختلاف کی تعبیر کو پسند نہیں کرتے تھے، علامہ ابن تیمیہ نے امام احمد کے بارے میں نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے فقہاء کے اختلاف پر ایک کتاب مرتب کی اور اس کا نام ''کتاب الاختلاف'' رکھا، امام احمد نے فرمایا کہ اس کو ''کتاب الاختلاف'' نہ کہو؛ بلکہ یہ ''کتاب السعۃ'' ہے: ''لا تسمه كتاب الاختلاف ولكن سمه كتاب السعة'' (مجموع الفتاوی: ۳۰/۷۹) — یعنی ''فقہاء کا اختلاف امت کے لئے سہولت اور گنجائش سے عبارت ہے''

اختلاف کے معاملہ میں وسعت اور گنجائش کی بہترین مثال امام دار الہجرۃ حضرت امام مالکؒ کی ہے، جن کی کتاب مؤطا امام مالک حدیث کی دستیاب کتابوں میں پہلی کتاب ہے، ان سے عہد عباسی کے کم سے کم دو خلفاء نے یہ خواہش کی کہ جیسے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے قرآن کو جمع فرمایا اور تمام مسلمانوں پر اس نسخے کو لازم قرار دیا، اسی طرح ہم آپ کی کتاب کو پوری امت پر لازم قرار دینا چاہتے ہیں، اگر کوئی بندۂ نفس ہوتا، تو اس کے لئے یہ لوگوں پر اپنی بات کو مسلط کرنے کا سنہرا موقع ہوتا؛ لیکن امام مالکؒ نے اس رائے کو پسند نہیں فرمایا، آپ نے فرمایا:

> ''علماء کا اختلافِ رائے اس امت کے حق میں اللہ کی طرف سے رحمت ہے، جس کے نزدیک جو نقطۂ نظر زیادہ درست ہے، وہ اس کی پیروی کرتا ہے؛ اس لئے یہ سب کے سب ہدایت پر ہیں اور ہر ایک کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا ہے: ''کل علی ھدی، و کل یرید اللہ''
>
> (کشف الخفاء: ۱/۶۵)

امام مالک کا یہ قول جہاں ان کے اخلاص وللّٰہیت کی دلیل ہے، وہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فقہاء اور محدثین اجتہادی مسائل میں اختلافِ رائے کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔

''قلب ونظر کی اسی وسعت کا نتیجہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کی اقتدار میں نماز ادا کرتے تھے، صحابہ، تابعین اور ائمہ مجتہدین کے دور میں کبھی یہ سوال پیدا نہیں ہوا کہ ہم مخالف نقطۂ نظر کے حامل شخص کے پیچھے نماز ادا کر سکتے ہیں یا نہیں ؟ امام احمد کے یہاں خون نکلنے سے وضوء ٹوٹ جاتا ہے، امام مالک کے نزدیک وضوء نہیں ٹوٹتا، امام احمد سے مسئلہ دریافت کیا گیا، انہوں نے اس کی وجہ سے وضوء کے ٹوٹ جانے کا فتوی دیا، پھر ان سے پوچھا گیا کہ اگر کسی شخص نے پچھنا لگوایا ہو، یعنی جسم کا فاسد خون نکلوایا ہو، تو کیا اس کے پیچھے نماز پڑھی جاسکتی ہے، امام احمد نے فرمایا: سبحان اللہ! کیا میں امام مالک اور سعید بن مسیب جیسے بزرگوں کے پیچھے نماز نہیں پڑھوں گا؟

جو نقطۂ نظر خون کے نکلنے سے وضوء کے ٹوٹ جانے کا امام احمد کا ہے، یہی امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا بھی ہے، جن میں امام ابو یوسف شامل ہیں، انہوں نے خلیفہ ہارون الرشید کے پیچھے نماز ادا کی؛ حالاں کہ خلیفہ نے خون نکلوایا تھا اور امام مالک کے فتوی کے مطابق وضوء نہیں کیا تھا، جب ان سے اس بارے میں دریافت کیا گیا، تو انہوں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: کیا میں امیر المؤمنین کے پیچھے نماز نہ پڑھوں؟ پھر ایک اصولی بات فرمائی کہ ایسے اختلافات کی وجہ سے ائمہ کے پیچھے نماز نہیں پڑھنا اہل بدعت کا طریقہ ہے''

(أدب الاختلاف: ص: ٧٦)

امام ابو یوسف کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ انہوں نے غسل کیا اور جمعہ کی نماز پڑھائی بعد میں انہیں بتایا گیا کہ کنواں میں مردہ چوہا پایا گیا ہے، امام ابو یوسف کی اصل رائے کے مطابق وضو درست نہیں ہوا، اور ظاہر ہے کہ جب وضوء ہی درست نہیں ہوا، تو اصولی طور پر نماز لوٹانی چاہئے؛ لیکن اس میں دشواری تھی؛ اس لئے امام ابو یوسف نے نماز نہیں لوٹائی اور فرمایا کہ آج ہم علماء مدینہ

کی رائے پر عمل کرتے ہیں، جن کے نزدیک دو مٹکے سے زیادہ پانی ہو تو جب تک نجاست کے گرنے سے تبدیلی نہ پیدا ہو، پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ (حوالہ سابق)

فقہاء شوافع کے نزدیک پرندوں کی بیٹ بھی ناپاک ہوتی ہے، قاضی ابوالطیب بڑے شافعی عالم تھے، جب جمعہ کی نماز شروع ہوئی اور انہوں نے تکبیر کہنے کا ارادہ کیا، تو پرندہ نے ان پر بیٹ کردی، انہوں نے تحریمہ باندھ لیا اور کہا کہ آج میرا عمل امام احمد کی رائے پر ہے، (اُدب الاختلاف: ص: ۷۷، بحوالۂ فیض القدیر: ۱/ ۲۲۱) — ظاہر ہے کہ یہ بات اس پس منظر میں ہے کہ ان علماء کی شرعی دلائل پر نظر تھی؛ البتہ عوام کو کھلی چھوٹ نہیں دی جاسکتی کہ وہ جس قول پر چاہے عمل کرلیں ؛ کیوں کہ اس سے خواہشاتِ نفس کی اتباع کا راستہ کھل جائے گا؛ لیکن اہل علم کو اس سلسلہ میں وسیع النظر ہونا چاہئے اور فقہاء کے اس اختلاف کو اس نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے کہ یہ حق وباطل کا اختلاف ہے؛ کیوں کہ سلف اس بات پر متفق ہیں کہ ایسے مسائل میں مختلف نقطۂ نظر کے حاملین حق پر ہیں اور ان سب کا بنیادی مقصد اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور رسول اللہ ﷺ کی پیروی ہے، ایسی وسیع القلبی کی مثالیں بعد کے ادوار میں بھی کثرت سے ملتی ہیں، مثلاً ان دنوں حرمین شریفین میں نماز وتر کا جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، فقہاء احناف کے یہاں وہ درست نہیں؛ لیکن امام ابوبکر جصاص رازی ، (البحر الرائق، باب الوتر والنفل: ۲/ ۶۸) علامہ ابن ہمام (فتح القدیر، باب الوتر: ۱/ ۴۴۱ - ۴۴۲) ان کے استاذ شیخ سراج الدین اور ماضی قریب کے علماء میں مولانا عبد الحی فرنگی محلی وغیرہ — جو اپنے عہد میں فقہاء احناف کے سرخیل رہے ہیں — کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایسے امام کی اقتداء میں کوئی حرج نہیں ہے؛ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس طرح کے مسائل میں اختلافِ رائے کو نہ برا سمجھیں، نہ اس کو مناظرہ اور مجادلہ کا موضوع بنائیں اور نہ ان آراء کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ بے احترامی کا رویہ اختیار کریں۔

یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ علماء اہل سنت کے درمیان جو اختلافِ رائے پایا جاتا ہے، وہ نوے فی صد؛ بلکہ اس سے بھی زیادہ بہتر اور غیر بہتر اور زیادہ یا کم بہتر کا ہے، جائز و ناجائز اور حلال وحرام کا اختلاف بہت کم ہے، اور اس میں بھی فقہاء نے دو باتوں کی رعایت کی ہے، ایک

یہ کہ کسی عمل کو کسی معتبر فقیہ نے جائز قرار دیا ہو اور کوئی شخص اس کی اتباع میں اور اس کی رائے پر اعتماد کرتے ہوئے اس عمل کو کرے، تو اس پر نکیر نہیں کی جائے گی اور منکر یعنی غلط کام سے روکنے کا جو حکم دیا گیا ہے، یہ اس کے دائرہ میں نہیں آئے گا، مثلاً امام شافعیؒ اور بعض دیگر فقہاء کے نزدیک مچھلی کے علاوہ بھی بیشتر آبی جانوروں کا کھانا جائز ہے، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مچھلی کے سوا کوئی اور آبی جانور حلال نہیں، اب اگر امام شافعیؒ کا کوئی پیرو مچھلی کے علاوہ ان کے نزدیک جائز آبی جانوروں میں سے کوئی چیز کھائے، تو امام ابوحنیفہؒ کے متبع کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ وہ اس پر نکیر کرے اور اسے حرام شئ کھانے والا کہے۔

اسی طرح اکثر فقہاء اور جمہور کے نزدیک امام کے پیچھے جہری نمازوں میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی جائے گی؛ لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک مقتدی کے لئے بھی سورۂ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے؛ لہٰذا اگر کوئی شخص امام شافعیؒ کی رائے کا پیرو ہو اور وہ سورۂ فاتحہ پڑھے، تو دوسروں کا اس پر نکیر کرنا درست نہیں، اور جو لوگ جمہور کی رائے پر عمل کرتے ہوئے مقتدی کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھنے کو درست نہیں سمجھتے ہیں، فقہ شافعی کا کوئی متبع ایسے لوگوں کی نماز کو غلط ٹھہرائے، یہ درست نہیں؛ کیوں کہ یہ مختلف رائیں کتاب وسنت ہی کے دلائل پر مبنی ہیں اور ان کے درمیان اختلاف صواب وخطا کا اختلاف ہے، حق و باطل کا اختلاف نہیں، اس نے ایسے عالم کی رائے پر اعتماد کیا ہے، جو اس کی نظر میں کتاب وسنت سے زیادہ واقف اور اس کے معانی ومطالب سے زیادہ آگاہ ہے، عام مسلمان اسی کے مکلف ہیں اور انہیں اسی کا حکم دیا گیا ہے: {فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لاَ تَعْلَمُونَ} (النحل: ۴۳) نیز جن فقہاء نے کوئی رائے قائم کی ہے، انہوں نے بھی دین وشریعت کو سمجھنے کی آخری درجہ کوشش کی ہے، جس کو ''اجتہاد'' کہتے ہیں، اور وہ اسی کے مکلف ہیں، اگر صحیح نقطۂ نظر تک پہونچنے میں ان سے کوئی بھول چوک ہوئی ہے، تو یہ قابلِ گرفت نہیں ہے؛ کیوں کہ انسان اپنی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں ہے: {لاَ يُكَلِّفُ اللّهُ نَفْساً إِلاَّ وُسْعَهَا} (البقرۃ:۲۸۶)۔

یہ حقیقت شروع سے علماء امت کے سامنے رہی ہے؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ قرونِ خیر یعنی صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے عہد میں کثرت سے اختلاف رائے پیدا ہوا، بعض اہل علم نے ان اختلافات کو جمع کرنے کی کوشش بھی کی ہے، جو کئی ضخیم جلدوں میں ہے، پھر دوسرے فقہاء

مجتہدین کا دور آیا، جن کی تعداد درجنوں میں ہے، یہاں تک کہ چوتھی صدی ہجری سے من جانب اللہ امت اسلامیہ چار بڑے فقہاء —— امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ علیہم—— پر متفق ہوتی چلی گئی اور تقریباً ایک ہزار سال سے پوری دنیا کے مسلمان ان مکاتب فقہ سے مربوط ہیں؛ لیکن صحابہ، تابعین، تبع تابعین، فقہاء مجتہدین اور علماء مقلدین کے درمیان اختلافِ رائے کی بناء پر کوئی لڑائی ہوئی ہو، انہوں نے ایک دوسرے کو کافر وگمراہ قرار دیا ہو، کسی کی نماز اور عبادت کو غلط اور نامقبول ٹھہرایا ہو، ایک دوسرے کی اقتدا میں نماز پڑھنے سے انکار کیا ہو یا محض اس اختلافِ رائے کی بناء پر ایک دوسرے کو ناقابلِ احترام سمجھا ہو، ایک دوسرے سے علمی استفادہ میں یہ چیز ان کے لئے رکاوٹ بن گئی ہو، ایسا نہیں ہوا؛ بلکہ ہمیشہ صورتِ حال اس کے برعکس رہی ہے۔

اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ فقہاء عراق میں تھے اور فقہاء عراق اور فقہاء حجاز کے درمیان بہت سے مسائل میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے؛ اس لئے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی رائے بہت سے مسائل میں احناف سے مختلف ہے، اس کی وجہ سے بعض اوقات فقہاء حجاز ناواقفیت کے سبب امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے تھے، مگر عجیب بات ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے مناقب اور ان کی طرف سے دفاع میں زیادہ تر کتابیں مالکیہ اور شوافع نے لکھی ہیں اور فقہ حنفی کی بعض کتابوں پر تحقیق وتعلیق کی خدمت بھی شافعی علماء نے انجام دی ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی بڑے بلند پایہ شافعی عالم تھے اور اپنے مذہب میں تصلب بھی رکھتے تھے؛ لیکن انہوں نے اپنی شہرہ آفاق کتاب فتح الباری میں متعدد مواقع پر امام ابوحنیفہؒ کی طرف سے مدافعت کی ہے، ان کے شاگرد علامہ ابن ہمام ہیں، جو اعلیٰ درجہ کے محقق ہیں اور فقہ حنفی کے متبع؛ لیکن مسلک و مذہب کے اختلاف نے کبھی ان کے درمیان افادہ اور استفادہ میں کوئی خلل پیدا ہونے نہیں دیا، بعد کے ادوار میں بھی یہی صورت حال رہی ہے۔

تقریباً سو سال سے ایک نئے دبستانِ فقہ کا ظہور ہوا، یمن میں علامہ شوکانی اور ہندوستان میں نواب صدیق حسن خاں اس فکر کے بڑے ترجمان رہے ہیں، یہ دونوں حضرات اپنے عہد کے بڑے محقق علماء میں تھے اور ان کی علمی وفقہی خدمات کو یقیناً فراموش نہیں کیا جاسکتا، ان سے پہلے

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے شاگردوں میں ایک نمایاں نام شاہ نذیر حسین محدث دہلویؒ کا ہے، جن کے ذریعہ ہندوستان میں علم حدیث کا فیض وسیع پیمانے پر پھیلا ہے، ان کو اس دبستان فقہ کا سرخیل کہا جاسکتا ہے، ان حضرات نے زیادہ تر ان آراء کو اختیار کیا، جو اصحاب ظواہر کی تھیں، جس کے نمائندہ امام ابوداؤد ظاہری اور علامہ ابن حزم اندلسی شمار کئے جاتے ہیں، نیز انھوں نے اسلامی تاریخ کی دو بڑی عظیم شخصیتیں علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم کی بعض آراء کو زیادہ قابلِ قبول سمجھا ہے، جن سے جمہور کا اختلاف تھا، یہ حضرات اپنے آپ کو ''محمدی، سلفی، اثری، یا اہل حدیث'' کہتے آئے ہیں۔

عام طور پر اس گروہ کے اکابر اور علماء مقلدین کے درمیان کوئی بڑی نزاع پیدا نہیں ہوئی، شاہ نذیر حسین صاحب کے فتوے اکثر فقہ حنفی کی کتابوں کے حوالہ سے ہیں، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ ان کے محبوب استاذ تھے، مولانا عبدالجبار غزنوی — جو بڑے اہل حدیث عالم تھے — کے ان کے معاصر علماء احناف سے بڑے ہی اچھے روابط تھے اور انھوں نے ان لوگوں کی بڑی مذمت کی ہے، جو امام ابوحنیفہؒ کی شان میں گستاخی کر گذرتے ہیں، جو حنفی تھے، مولانا عبدالحی فرنگی محلی واقعی نابغۂ روزگار علماء میں تھے اور حنفی تھے، ان کے اور نواب صدیق حسن خان کے درمیان علمی چشمکیں رہا کرتی تھیں؛ لیکن صورت حال یہ تھی کہ نواب صاحب لکھنؤ جاتے، تو فرنگی محل میں قیام کرتے اور مولانا عبدالحی صاحب بھوپال آتے، تو نواب صاحب کے مہمان ہوتے، مولانا ابو الکلام آزاد کا جھکاؤ بھی مسلکِ اہلِ حدیث کی طرف تھا، لیکن ان کے تعلقعات زیادہ تر علماء احناف سے تھے اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی ان پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ وہ انھیں امیر الہند بنانا چاہتے تھے، علامہ سید سلیمان ندوی بھی اسی نقطۂ نظر کے حامل تھے؛ لیکن جس استاذ کی شاگردی کو تمغۂ افتخار خیال کرتے تھے، وہ ہیں امام ابوحنیفہؒ کے سیرت نگار اور معتقد خاص علامہ شبلی نعمانی، اور جن کے ہاتھوں پر رشد واصلاح کی بیعت کی اور جن کی نسبت کو اپنے لئے سعادت عظمی سمجھتے تھے، وہ ہیں اپنے عہد کے ممتاز حنفی عالم حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، مشہور مفسر قرآن مولانا احمد علی لاہوری حنفی عالم تھے؛ لیکن عید کی نماز التزاماً معروف اہل حدیث عالم مولانا سید داؤد غزنوی کے پیچھے ادا فرماتے تھے، اگر وہ اپنی الگ جماعت بناتے تو شاید وہ لاہور کی سب

سے بڑی جماعت ہوتی ؛لیکن انہوں نے کبھی اسی کی اجازت نہیں دی ؛ بلکہ ان کی ایک صاحبزادی بھی ایک اہل حدیث عالم کے نکاح میں تھیں۔ (دیکھئے : پرانے چراغ:۱/ ۱۵۹،تالیف: مولانا ابوالحسن علی ندویؒ)

مولانا علی میاں صاحب ہی کی روایت ہے کہ ایک زمانہ میں مولانا حفیظ اللہ صاحب دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم تھے اور پنج وقتہ نمازوں کی امامت بھی وہی کرتے تھے،مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی شیخ الحدیث سلفی عالم تھے،اس کے باوجود نماز انہیں کے پیچھے ادا کرتے تھے۔ (حوالہ سابق : ۱/۱۹۱)

حضرت تھانویؒ کے بارے میں ایک خلیفہ مولانا مفتی محمد حسن امرتسری بڑے حنفی دیوبندی الفکر علماء میں تھے، ان کے ایک دوست مولانا محمد حسین ہزاروی غیر مقلد تھے، وہ ان کے ساتھ حضرت تھانویؒ کی خدمت میں آئے ،مولانا امرتسری نے حضرت تھانوی سے بتادیا کہ ان کا تعلق مسلک اہل حدیث سے ہے،مولانا بہت خوش ہوئے اور حسب معمول مہمان کا اکرام کیا،ایک دن حضرت تھانوی نے مولانا امرتسری سے پوچھا کہ کیا بات ہے کہ نماز میں مولانا حسین صاحب کے آمین کی آواز نہیں آتی ہے؟ مولانا امرتسری نے کہا: شاید آپ کے مسلک کی رعایت میں ایسا کرتے ہیں،مولانا تھانویؒ نے فرمایا: آپ ان سے کہہ دیجئے کہ وہ جس چیز کو سنت سمجھتے ہیں اس کو ترک کرنے کا بوجھ میری گردن پر نہ ڈالیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک عمل سمندر کے اس پار سنت ہو اور اس پار بدعت ہو،مولوی صاحب سے کہئے کہ وہ آمین بالجہر کہیں، یہاں ان کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔

(دیکھئے: بزم ارجمنداں:ص:۳۳۳،تالیف: مولانا محمد اسحاق بھٹی)

اس طرح کی بہت سی مثالیں ماضیٔ قریب کی تاریخ میں موجود ہیں ، سید احمد شہید حنفی المسلک تھے؛لیکن علماء صادق پور کے بشمول ان کی تحریک میں بڑی تعداد گروہ اہل حدیث کے چوٹی کے علماء کی تھی ، نہ ان میں سے کسی نے دین وشریعت کے بجائے اپنے مسلک کی طرف دعوت دی نہ ان کی تبلیغ کی ، نہ دوسروں کی نماز کو غلط ٹھہرایا، نہ ان کو گمراہ قرار دیا؛ بلکہ نواب صدیق حسن خاں صاحب نے تو صراحتاً لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس نجات یافتہ فرقہ کا ذکر کیا ہے، ان میں

احناف، مالکیہ، شوافع، حنابلہ اور اہل حدیث، پانچوں گروہ شامل ہیں؛ نیز انہوں نے لکھا ہے:

''حق مذاہب اربعہ میں دائر ہے، منحصر نہیں؛ اس لئے اہل الحدیث، ظاہر یہ اور صوفیا بھی حق پر ہیں'' (ابقاء المنن: ۹۱)

مگر افسوس کہ کچھ عرصہ سے یہ صورتِ حال بدلتی جارہی ہے اور ان اختلافات نے ایسی شدت اختیار کر لی ہے کہ ان کی وجہ سے نمازوں کو غلط ٹھہرایا جاتا ہے، سلف پر طعن کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ دوسرے مسلمانوں کی تکفیر بھی کی جاتی ہے، یہاں تک کہ بعض دفعہ جنگ وجدال تک کی نوبت آجاتی ہے۔

دوسری بات جس کا اہل علم نے ہمیشہ خیال رکھا ہے، یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، اختلاف سے بچنے کی کوشش کی جائے، یعنی اگر کسی عمل کے بارے میں اختلاف ہو، تو اس کو اس طرح انجام دینے کی کوشش کی جائے کہ تمام اہلِ علم کے نزدیک اس کا عمل درست ہوجائے، مثلاً بعض اہل علم کے نزدیک وضو میں جو افعال انجام دیئے جاتے ہیں، ان میں ترتیب واجب نہیں؛ لیکن بہتر ہے، اور بعض کے نزدیک ترتیب واجب ہے، تو اس پر سب متفق ہیں کہ وضوء میں ترتیب کا خیال رکھا جائے؛ تا کہ تمام آراء کے مطابق وضو درست ہوجائے، یا جیسے بعض اہل علم کے نزدیک سر کے بالوں میں چند بالوں کا مسح کر لینا کافی ہے، بعض کے نزدیک چوتھائی سر کا اور بعض فقہاء کے نزدیک پورے سر کا مسح ضروری ہے، اب اگر پورے سر کا مسح کر لیا جائے، تو تمام لوگوں کے نزدیک اس کا وضو درست ہوجائے گا، اس طریقۂ کار کو تمام ہی فقہاء نے پسند کیا ہے۔

البتہ اختلافِ رائے ان ہی امور میں معتبر ہے، جن میں اختلاف کی گنجائش ہو، بعض ایسے لوگ بھی ہیں، جو رسول اللہ ﷺ کی ختم نبوت کے منکر ہیں، بعض لوگ نے صراحتاً ختم نبوت کا انکار تو نہیں کیا؛ لیکن وہ رسول اللہ ﷺ کے بعد ایسی شخصیت کی آمد کا یقین رکھتے ہیں، جو نعوذ باللہ آپ ﷺ کی طرح معصوم ہیں اور اس پر اللہ کی طرف سے احکام اترتے ہیں، ظاہر ہے یہ تصورات اسلام کے بنیادی عقائد کے مغائر ہیں؛ اس لئے ایسے لوگوں کو مسلمان نہیں کہا جاسکتا؛ کیوں کہ اسلام کچھ ٹھوس اور محکم حقیقتوں کا نام ہے، یہ موم کی ناک نہیں ہے کہ آپ جس طرح چاہیں اور جدھر چاہیں گھمادیں، اسی طرح اگر کوئی شخص دین کے اصل سرچشمہ قرآن کے مستند و معتبر ہونے کو نہ مانتا ہو، رسول اللہ

ﷺ کے رفقاء عالی مقام —— جن کے ذریعہ دین ہم تک پہونچا ہے —— کو مجروح و مطعون کرتا ہو، تو یہ اختلاف ہرگز قابلِ قبول نہیں؛ کیوں کہ جب دین کی بنیادیں ہی مجروح ہو جائیں گی اور جس ذریعہ سے اسلام ہم تک پہونچا ہے، وہ ذریعہ ہی نامعتبر قرار پائے گا، تو پھر خود اس دین پر لوگوں کا اعتماد کیسے باقی رہے گا؛ اس لئے اختلاف ان ہی باتوں میں معتبر ہے، جن کا ثبوت یقینی دلیل جیسے قرآن اور بہت سے لوگوں سے منقول حدیث —— جس کو اصطلاح میں متواتر کہتے ہیں —— سے نہ ہو، یا وہ ثابت تو ہو قرآن اور ایسی حدیث سے؛ لیکن اس کیلئے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، ان میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال ہو، اور اس کی واضح علامت یہ ہے کہ جس بات پر فقہاء امت کا اتفاق ہو، ان میں اختلاف معتبر نہیں؛ کیوں کہ یہ اختلاف کسی صحیح و معتبر دلیل پر مبنی نہیں ہوسکتا اور جن امور میں فقہاء کا اختلاف ہو، ان میں ایک سے زیادہ نقطۂ نظر کی گنجائش ہے؛ اس لئے اس اختلاف کی وجہ سے کسی کو گمراہ اور دائرۂ ہدایت سے باہر قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اس وقت اسلام دشمن طاقتیں بے دین مسلمانوں کو جغرافیائی، نسلی اور لسانی بنیادوں پر تقسیم کرنے میں مصروف ہیں اور دیندار مسلمانوں کو مسلکی بنیاد پر بانٹنے کی کوشش کر رہی ہیں، مسلمان ایک طرف پوری دنیا میں ظلم و جور اور جبر و تشدد کا بھی شکار ہیں اور دوسری طرف انتہائی انتشار اور بکھراؤ کی حالت میں ہیں، ہمارا یہ بکھراؤ دشمن کا اتنا طاقتور ہتھیار ہے اور وہ اس کے ذریعہ ہمیں اس قدر نقصان پہونچا رہے ہیں کہ نیوکلیر بم کے ذریعہ بھی ہمیں ایسا نقصان نہیں پہونچایا جاسکتا؛ اس لئے ضرورت ہے کہ علماء اپنی زبان و قلم میں اعتدال پیدا کریں اور عوام اپنے اندر ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کریں کہ اگر ہم نے اس حقیقت کو نہیں سمجھا، تو ہماری ناکامیوں اور نامرادیوں کی داستان دراز سے دراز تر ہوتی چلی جائے گی۔

۶، ۱۳، ۲۰ / نومبر ۲۰۰۹ء

ضروریات یا خواہشات؟

اس میں شبہ نہیں کہ مال و دولت بھی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، اس نعمت کی قدر ان بے کسوں سے پوچھئے، جن کو آسمان کے سایہ کے سوا کوئی سایہ میسر نہیں، جن کے لیے سڑک پر بنے ہوئے فٹ پاتھ بستر کا کام دیتے ہیں اور موسمِ گرما کی جھلساہٹ، سرما کی برفیلی ہوائیں اور برسات کی موسلا دھار بارش جن کے زخم پر نمک چھڑکتی رہتی ہیں، فاقہ کشی بار بار ان کے یہاں تسلط جمالیتی ہے اور دوا وعلاج سے محرومی ان کی بیماریوں کا حوصلہ بڑھاتی رہتی ہے، ایسے انسانوں کی تعداد نہ صرف پوری دنیا میں بہت بڑی ہے؛ بلکہ خود ہمارے ملک میں بھی ایک اچھی خاصی تعداد ایسے پریشان حال افراد اور خاندانوں کی ہے؛ لیکن دوسری طرف دنیا میں شاہ خرچ لوگوں کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے، ایک زمانہ میں بادشاہوں، رئیسوں اور نوابوں کے چونچلے مشہور تھے، ان کی عیش وعشرت کے نقشے افسانے کی طرح بیان کیے اور سنے جاتے تھے اور کسی کو دیکھنے کا موقع ملتا تو وہ اس عیش کوشی کو حیرت کی آنکھوں سے دیکھتا تھا؛ لیکن اب اس سلسلہ میں حاکم ومحکوم اور محمود وایاز کا فرق کم ہوگیا ہے، ہر آبادی میں بہت سے ایسے لوگ مل جاتے ہیں کہ ان کی فضول خرچی پچھلے نوابوں کو شرمندہ کرتی ہے اور اس کی وجہ سے سوسائٹی میں ایک طرح کا جذبۂ مسابقت پروان چڑھتا ہے۔

یہ رجحان معاشرہ کے لیے بہت ہی نقصان دہ اور ہلاکت خیز ہے، انسان کے ساتھ قدرت نے دو چیزوں کو جوڑ رکھا ہے، ضروریات اور خواہشات، انسان کی ضروریات محدود ہیں؛ لیکن خواہشات کی کوئی حد ونہایت نہیں ہے، اسلام کی تمام تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان دنیا کو ضروریات کے لیے رکھے اور خواہشات کے لیے آخرت کا انتظار کرے، انسان کا خواہشات کا بندہ بن جانا، اس کی بہت بڑی کمزوری ہے، خواہشات ان کو فضول خرچی کے راستے پر ڈال دیتی ہے؛ اسی لیے قرآن مجید نے بار بار فضول خرچی سے منع کیا، ارشاد ہوا: فضول خرچی مت کرو؛ کیوں کہ

اللہ کو فضول خرچی کرنے والے بندے پسند نہیں :{ وَلاَ تُسْرِفُوْا إِنَّهُ لاَ يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ } (الانعام:۱۴۱) یہ نہیں ہے کہ انسان اپنی ضرورتیں بھی پوری نہ کرے، اسی لیے فرمایا گیا کہ ڈھنگ کے کپڑے پہنو، کھاؤ، پیو، ہاں! فضول خرچی نہ کرو:

{يَا بَنِيْ آدَمَ خُذُواْ زِيْنَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وكُلُواْ وَاشْرَبُواْ وَلاَ تُسْرِفُواْ إِنَّهُ لاَ يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ} (الأعراف:۳۱)

ایک اور موقع پر فضول خرچی کرنے والے کو دوزخی قرار دیا گیا ہے:{ وَأَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ أَصْحَابُ النَّارِ } (الغافر:۴۳) آپ ﷺ نے اپنا مزاج اور اس امت کے لیے مطلوبہ مزاج یہ بنایا کہ ہمیں عیش وعشرت کا پرستار نہیں ہونا چاہیے؛ کیوں کہ اللہ کے حقیقی بندے اس مزاج کے نہیں ہوتے:''إياي والتنعم فإن عباد اللّٰه ليسوا بالمتنعمين'' (مسند احمد عن معاذ بن جبل:۵/ ۲۴۴)

لیکن آج اگر کوئی اس امت کی شادی بیاہ کی تقریبات اور زندگی گذارنے کا طریقہ دیکھے تو وہ محسوس کرے گا کہ امت کو اس مزاج سے دور کا بھی تعلق نہیں رہا، اس وقت دنیا کی سرمایہ دار طاقتوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا رکھا ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ فضول خرچی کا رجحان اختیار کریں، اس کے لیے بہت سے دوسرے وسائل کے علاوہ تشہیر کو نہایت ہی مؤثر وسیلہ کی حیثیت سے اختیار کیا جارہا ہے، ایسی چیزیں جو انسانی زندگی کے لیے غیر اہم ہیں یا نقصان دہ ہیں، اشتہارات کے زور پر ذہن کو ان کے لیے ہموار کیا جاتا ہے اور جو چیزیں ضروری نہیں ہیں، ان کے ضروریاتِ زندگی میں داخل ہونے کا یقین بٹھایا جاتا ہے، اس وقت ٹی، وی کا غالب حصہ اشتہارات کی نذر ہوتا ہے، کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں ہر شخص اپنی زندگی میں اوسطاً ایک ہزار گھنٹے ٹی، وی اشتہارات دیکھنے میں گذارتا ہے، اخبارات میں اشتہارات کی جو بہتات ہوتی ہے، وہ محتاج اظہار نہیں، سڑکوں کے کنارے تشہیری بورڈ اس کے علاوہ ہیں، اگر تشہیری اخراجات کو جوڑا جائے، تو شاید وہ ہمارے ملک کی کسی ریاست کے سالانہ بجٹ کو پہنچ جائیں۔

یہ اشتہارات نہایت ہی خود غرضی پر مبنی ہوتے ہیں، اور چونکہ ذرائع ابلاغ کے لیے سرمایہ کے اعتبار سے یہ ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے ہیں، اس لیے انہوں نے اشتہارات کو قبول کرنے کے لیے کوئی اخلاقی معیار نہیں رکھا ہے، ابھی کچھ عرصہ پہلے ہندوستان میں ''کوکا کولا'' کے بارے میں یہ

خبر آئی کہ ایک سائنٹفک ریسرچ ادارہ نے اس میں کچھ جراثیم کش دواؤں کے عنصر پائے ، اس رپورٹ نے پورے ملک میں ایک اضطراب پیدا کردیا ؛ لیکن اس کے بجائے کہ حکومت اس پر پابندیاں لگاتی ، ورلڈ بینک نے اپنی امداد بند کرنے کی دھمکی دی ، جس کی اطلاع ذرائع ابلاغ تک بھی آگئی اور ہماری آزاد اور عوام کی بہی خواہ حکومت نے ورلڈ بینک کے سامنے اپنے گھٹنے ٹیک دیے ، دوسری طرف ذرائع ابلاغ میں جوابی تشہیری مہم شروع ہوئی اور کہا گیا کہ یہ انتہائی محفوظ مشروبات ہیں ، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بات آئی گئی ہوگئی ، اس سے اندزہ کیا جاسکتا ہے کہ تشہیری ذرائع کس طرح عوام کے دل ودماغ کو اغوا کر لیتے ہیں ۔

جب انسان خواہشات کے دام میں آجاتا ہے ، تو پھر بے فائدہ چیزوں میں اس کے سرمایہ کا اتنا بڑا حصہ خرچ ہونے لگتا ہے کہ اگر اس سے غریبوں کی بنیادی ضروریات کا انتظام کیا جائے ، تو شاید کوئی شخص بھی بھوکا نہیں مل سکے ، مثلاً امریکہ میں کاسمیٹکس پر ۱۱ / بلین ڈالر ، یورپ میں آئس کریم پر ۱۱ / بلین ڈالر ، یورپ و امریکہ میں پرفیومس پر ۱۷ / بلین ڈالر ، جاپان میں تفریحات پر ۳۵ / بلین ڈالر ، یورپ میں سگریٹ پر ۵۰ / بلین ڈالر ، یورپ میں الکحل پر ۱۵۰ / بلین ڈالر ، دنیا بھر میں منشیات پر ۴۰۰ / بلین ڈالر اور فوج پر ۷۸۰ / بلین ڈالر خرچ کیے جارہے ہیں ، (رفیق منزل ، جولائی ۲۰۰۷ء) ایک طرف فضولیات پر خرچ کا یہ حال ہے ، دوسری طرف ترقی پذیر ممالک میں بنیادی تعلیم پر ۶ / بلین ڈالر ، پانی اور حفظان صحت پر ۹ / بلین ڈالر اور صحت پر ۱۳ / بلین ڈالر خرچ کیے جاتے ہیں ، یعنی دنیا بھر میں منشیات پر جتنا خرچ ہوتا ہے ، اس کا دس فیصد بھی ترقی پذیر ممالک (جو دنیا کی دو تہائی سے زیادہ انسانی آبادی کی نمائندگی کرتے ہیں) میں سماجی خدمات پر خرچ نہیں ہوتا ، یہ فضول خرچی ، خواہشات پرستی اور زائد از ضروریات صارفیت کا نتیجہ ہے ، اب گلوبلائزیشن کے نام پر ہر خواہش کو پوری کرنے اور نت نئی خواہشوں کو وجود میں لانے کا جذبۂ بے کراں غریب اور ترقی پذیر ملکوں میں برآمد کیا جارہا ہے ۔

اس وقت ہندوستان میں بھی کارآمد گاڑیاں بیچ کر نئی گاڑیاں خریدنے ، نئے نئے موبائیل سیٹ حاصل کرنے ، عمارتوں کی اعلیٰ ترین اور دیدہ زیب آرائش ، تقریبات کو رنگ ونور کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ آراستہ کرنا اور تکلفات پر پانی کی طرح پیسہ بہانے ، دعوتوں میں حد سے زیادہ تنوع

اور کھانے کی نت نئی قسموں کو جنم دینے کا مزاج اس تیزی سے پنپ رہا ہے کہ آج سے دس سال پہلے ہندوستان میں اس کا تصور بھی دشوار تھا ، اس فضول خرچی سے فرد ، سماج اور قوم پر بہت ہی مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں ، چونکہ اس وقت مغربی کمپنیاں پوری دنیا پر حاوی ہیں اور خواہشات کی پیاس بجھانے والی چیزیں وہی بناتی ہیں ؛ اس لیے ترقی پذیر ملکوں کی دولت کا بڑا حصہ ترقی یافتہ ملکوں کی جھولی میں چلا جاتا ہے ، بظاہر تو یوں لگتا ہے کہ ترقی پذیر ملکوں کی مدد کی جارہی ہے ؛ لیکن حقیقت میں یہ ایک ایسا دریا ہے ، جس کا نشیب مغرب کی طرف ہے ، چنانچہ دولت کا بڑا حصہ مختلف ذریعہ سے مغرب کی طرف چلا جاتا ہے ، امریکہ کے موجودہ صدر بش نے جب چین کا دورہ کیا ، تو انہوں نے برملا یہ شکوہ کیا کہ چین بچت بہت کرتا ہے ، حالانکہ ہمیں ایسے چین کی ضرورت ہے جو زیادہ خرچ کرے اور جہاں زیادہ کھپت ہو ، صدر بش کے اس بیان سے ترقی یافتہ ملکوں کی بدنیتی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔

اس کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ جب سماج میں عمومی مزاج خواہشات پرستی کا پیدا ہو جاتا ہے ، تو جو حقیقی ضرورتیں ہیں ، ان میں غریبوں کا حصہ کم ہوتا جاتا ہے ؛ کیوں کہ وہ گنجائش نہ ہونے کے باوجود اپنے سرمایہ کا ایک اچھا خاصا حصہ ایسی غیر ضروری چیزوں کی نذر کر دیتے ہیں ، چنانچہ چند برس پہلے اقوام متحدہ کے ڈیولپمنٹ پروگرام (U.N.D.P) کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ دنیا کے امیر ترین بیس فیصد لوگ پینتالیس فیصد مچھلی اور گوشت استعمال کر لیتے ہیں اور دنیا کے بیس فیصد غریب ترین لوگوں کو صرف ان کے پانچ فیصد پر اکتفا کرنا پڑتا ہے ، اسی طرح بیس فیصد امیر ترین لوگ توانائی کا ۵۸ / فیصد استعمال کرتے ہیں اور بیس فیصد غریب ترین لوگ چار فیصد ، ٹیلیفون لائنز میں سے ۷۴ / فیصد یہ امیر لوگ استعمال کرتے ہیں اور گیارہ فیصد تک غریب لوگ ، نیز دنیا کے ۲۲۵ / امیر ترین لوگوں کی آمدنی ایک ٹریلین ڈالر ہے ، جو دنیا کی تقریباً نصف آبادی کی آمدنی کے برابر ہے ، یہ معاشی ناہمواری اور امیر وغریب کے درمیان بڑھتا ہوا فاصلہ —— جو ترقی یافتہ ملکوں میں بھی تقریباً اسی طرح ہے ، جس طرح ترقی پذیر ملکوں میں ہے —— کا ایک اہم سبب ضروریات سے زیادہ صارفیت کا نتیجہ ہے ، دولت مندوں کی دولت ، غریب عوام پر خرچ ہونے کے بجائے حد سے گذری ہوئی عشرت کوشی پر خرچ ہو رہی ہے اور غریب عوام بھی ان کا دیکھا دیکھی ایسی مصنوعی

ضروریات کے دام میں پھنس جاتی ہے، جس کے نتیجہ میں انہیں طرح طرح کے مصائب اٹھانے پڑتے ہیں۔

خواہشات پرستی کا ایک مزاج یہ ہے کہ انسان کو اپنا رکھ رکھاؤ بہت بھانے لگتا ہے: { . . . كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ } (یونس: ۱۲) پھر وہ اپنے قول وفعل سے لوگوں کو بھی مسرفانہ زندگی کی دعوت دینے لگتا ہے، اسی لیے قرآن نے خاص طور پر متنبہ کیا ہے کہ ایسے فضول خرچ لوگوں کی بات نہ ماننی چاہیے: { وَلاَ تُطِيْعُوْا أَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ } (الشعراء: ۱۵۱) اور مسلمانوں سے کہا گیا کہ فضول خرچی کرنے والے دراصل شیطان کے بھائی ہیں: { إِنَّ الْمُسْرِفِيْنَ كَانُوْا إِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ } (الإسراء: ۲۷) رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلہ میں ایک بنیادی بات فرمائی ہے کہ انسان کو دین کے اعتبار سے اپنے بہتر لوگوں پر نظر رکھنی چاہیے؛ تاکہ خیر میں مسابقت کا جذبہ پیدا ہو اور دنیا کے اعتبار سے اپنے سے کم تر لوگوں پر نظر رکھنی چاہیے؛ تاکہ شکر کا جذبہ پیدا ہو اور انسان بندۂ ہوس نہ بن جائے، یہ بہترین علاج ہے انسان کی اس نفسیات کا کہ جب کسی سماج میں کچھ اہل زر دولت وثروت کا مظاہرہ کرتے ہیں، تو سماج کے غریب لوگوں میں بھی ان کی نقالی کا جذبہ انگڑائی لینے لگتا ہے اور یہ ان کے لیے مصیبت بن جاتی ہے۔

اس خواہش پرستی کا ایک نقصان قرض کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، جب انسان کی موجودہ آمدنی خواہشات کا ساتھ نہیں دیتی، تو وہ قرض کے ذریعہ ان کو پوری کرتا ہے اور اکثر یہ قرض سودی نوعیت کا ہوتا ہے، جو مکڑی کے جال کے طرح مقروض کو باندھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ بہت سی دفعہ خودکشی اس کے لیے آخری سہارا ہوتی ہے اور جو غریب قرض بھی لینے پر قادر نہیں ہوتا، محرومی کا احساس اسے بے قرار رکھتا ہے، یہی احساس بہت سی دفعہ انسان کے اندر مجرمانہ ذہن پیدا کرتا ہے اور اس طرح کی تشدد آمیز تحریکیں چلتی ہیں، جیسے اس وقت ہمارے ملک میں نکسلائٹ کی شکل میں جاری ہیں۔

غرض کہ خواہشات کو ضروریات میں داخل کر لینا انسان کے لیے ہر پہلو سے نقصان دہ ہے، معاشی اعتبار سے بھی، اخلاقی پہلو سے بھی، امن وامان کے لحاظ سے بھی اور روحانی اعتبار سے بھی، اس لیے ضروری ہے کہ سماج کی ایسی تربیت کی جائے کہ وہ ضروریات اور خواہشات کے فرق کو سمجھ

سکے اور عیش کوشی اور اس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا مزاج پیدا ہونے کے بجائے قناعت پیدا ہو کہ انسان کی عیش و عشرت کی زندگی جسم کے لیے کچھ لذت تو فراہم کر سکتی ہے، قلب کے لیے سکون کا سامان نہیں بن سکتی اور قناعت و استغناء وہ دولت ہے جو دل کو سکون و قرار کی دولت سے ہم کنار کرتی ہے۔

۱۰/ اگست ۲۰۰۷ء

گیتا سے رام سیتو تک
مسلمانوں کے لئے غور و فکر کی جہتیں

پچھلے دنوں دو ایسے واقعات سامنے آئے جس نے ہندوستان کی سیاست میں ایک تلاطم پیدا کر دیا، ان میں ایک واقعہ یہ ہے کہ الٰہ آباد ہائیکورٹ کے ایک جج نے نہایت ہی خلاف توقع اور اہل دانش اور ماہرین قانون کی نظر میں معقولیت سے عاری فیصلہ کیا کہ گیتا کو قومی کتاب کا درجہ دیا جانا چاہئے، گویا اس کتاب کو ماننا مسلمانوں اور عیسائیوں پر لازم ہونا چاہئے؛ کیوں کہ یہ کتاب ہندوستانی فکر اور ہندوستانی تہذیب کی ترجمان ہے، اس نزاعی فیصلہ نے ملک کے تمام سنجیدہ لوگوں کو صدمہ پہنچایا اور نہ صرف مسلمانوں نے؛ بلکہ ہندو دانشوروں اور قانون دانوں نے بھی اسے ملک کے دستور میں دی گئی مذہبی آزادی کے خلاف اور تمام مذاہب کے احترام کے مغائر قرار دیا۔

گیتا پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، اس کی موافقت میں بھی اور مخالفت میں بھی، بہت سے لوگ اسے ایک افسانوی کتاب قرار دیتے ہیں، گیتا کے ہیرو شری کرشن جی ہیں، اور ان کا فلسفۂ جنگ محض اقتدار کے حصول کے لئے جنگ کو جائز قرار دیتا ہے، اور انسان کے قتل کو پرانے کپڑے کی جگہ نئے کپڑے پہنانے سے تعبیر کرتا ہے، کیوں کہ انسان مرنے کے بعد پھر دوبارہ جنم لیتا ہے، اسی طرح کرشن جی اور رادھا کے تعلقات کو گیتا میں بہت عریاں طور پر پیش کیا گیا ہے، ایسے ہی گوپیوں کے ساتھ ان کا سلوک ڈھکا چھپا نہیں ہے، یہ ایسی باتیں ہیں جو کسی بھی طرح اخلاق کے معیار پر پوری نہیں اترتیں اور یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر واقعی شری کرشن جی ایک مقدس شخصیت تھے تو یہ ان پر بہتان اور سچائی میں جھوٹ کی آمیزش ہے۔

مذہب کی بنیاد خدا کے تعلق، آخرت میں جواب دہی کے احساس اور مسلمہ اخلاقی اقدار کی پاسداری پر ہے، برادرانِ وطن کی اصل مذہبی کتاب ویدوں، پرانوں اور اُپنشدوں میں ہمیں اس

کی جھلک اور زندگی کے بارے میں ہدایات ملتی ہیں؛ لیکن گیتا تو ایک رزمیہ نثر یا جنگ کا شاہنامہ ہے، جس میں شری کرشن جی کا متضاد قسم کا کردار سامنے آتا ہے؛ اسی لئے بہت سے ہندو بھائی بھی گیتا کو مذہبی کتاب کا درجہ نہیں دیتے، ایسی کتاب کو قومی کتاب کا نام دینا کیوں کر روا ہو سکتا ہے؟

اسلام کا موقف ایسے مسائل میں بالکل واضح ہے، اسلام کسی دوسری قوم سے یہ نہیں کہتا کہ وہ اس کتاب پر ایمان لائیں جسے ہم برحق سمجھتے ہیں، ان حقیقتوں کا یقین کریں، جن پر ہمارا عقیدہ ہے، ان اعمال و اطوار کو قبول کریں جنہیں ہم بہتر سمجھتے ہیں؛ اسی لئے صاف طور پر ارشاد ہوا کہ ہدایت اور گمراہی میں فرق پوری طرح واضح ہو چکا ہے، اب یہ خود انسان کا کام ہے کہ وہ خدا کی دی ہوئی عقل کو استعمال کرتے ہوئے حق اور باطل کا فیصلہ کرے اور اسے قبول کرے، اس میں جبر واکراہ کی گنجائش نہیں ہے: { لاَ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ } (البقرۃ: ۲۵۶) اس لئے مسلمانوں نے کبھی دوسری قوموں کو اس بات پر مجبور نہیں کیا کہ وہ قرآن مجید کو وہ درجہ دیں جس کا ہم عقیدہ رکھتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی مملکت کی بنیاد رکھتے ہوئے یہودیوں سے جو معاہدہ کیا، اس میں بنیادی دفعہ یہی تھی کہ سب لوگ اپنے اپنے مذہب پر عمل کریں گے، زنا کے ایک مقدمہ میں یہودیوں کے درمیان ہونے والی ایک نزاع کا فیصلہ آپ ﷺ نے تورات ہی کے مطابق فرمایا، مدینہ میں ''بیت المدراس'' کے نام سے یہودیوں کا مدرسہ موجود تھا، جس میں تورات وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی، آپ ﷺ نے کبھی اس سے تعرض نہیں کیا؛ بلکہ اس مدرسہ کا دورہ بھی فرمایا، اسی طرح ایشیاء افریقہ اور یورپ کے مختلف ملکوں میں مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں اور ان کے اقتدار کا سورج پوری آب وتاب کے ساتھ روشن رہا، مگر اس کے باوجود مسلمانوں نے کبھی دوسری قوموں کو اس بات کا پابند نہیں بنایا کہ وہ قرآن مجید کو اس حیثیت میں تسلیم کریں، اس کی جو حیثیت مسلمانوں کے نزدیک ہے۔

ہمارے ملک کا دستور سیکولرزم پر مبنی ہے، جس میں تمام مذہبی اکائیوں کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق عقیدہ رکھنے، عمل کرنے اور اس کی دعوت دینے کی اجازت ہے، اور کسی کو دوسرے کے مذہب میں دخل دینے یا دوسرے کو اپنے عقیدہ پر مجبور کرنے کا حق حاصل نہیں، پھر گیتا ایسی کتاب ہے جو خود برادران وطن کے نزدیک انتہائی نزاعی تالیف رہی ہے اور بعض دلت مصنفین نے گیتا پر

اتنے سخت تبصرے کئے ہیں کہ قلم کے لئے ان کا نقل کرنا بھی بار خاطر ہے، ایسی کتاب کو ''قومی کتاب'' کا درجہ دینے کی ہدایت ایک عجوبہ سے کم نہیں ہے۔

دوسرا مسئلہ ''رام سیتو'' کا کھڑا ہو گیا ہے، جس کو کچھ لوگ ''آدم برج'' بھی کہتے ہیں، یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جب جنت سے زمین پر اتارے گئے، تو سرندیپ یعنی سری لنکا میں آپ علیہ السلام کا نزول ہوا، شاید اسی لئے سری لنکا میں کئی چیزیں حضرت آدم علیہ السلام سے منسوب ہیں، جیسے آدم پہاڑ، آدم قدم اور آدم پل؛ لیکن قرآن وحدیث میں حضرت آدم علیہ السلام سے ان چیزوں کی نسبت کا کوئی ذکر نہیں ملتا، ہندوستان اور سری لنکا کے درمیان آبی سفر کی راہ ہموار کرنے اور خشکی کی سرحدوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کے لئے اس جگہ کو کھود کر گہرا کرنا تجارتی نقطۂ نظر سے ہندوستان کے لئے بہت مفید ہے، اس لئے این ڈی اے گورنمنٹ نے اپنے دور اقتدار میں اس جزیرہ نما خشکی کے حصہ کو کھود کر آبی راستہ بنانے کی تجویز منظور کی تھی اور اس تجویز کے پیچھے اٹل بہاری واجپائی اور ایل کے اڈوانی جیسے لوگوں کا دماغ کارفرما تھا؛ لیکن اسی فیصلہ پر جب موجودہ حکومت نے عمل کرنا چاہا تو اچانک سنگھ پریوار اور اس کی ذیلی تنظیموں کو شری رام جی کی یاد تڑپانے لگی، اور انہوں نے سیاسی فائدہ اٹھانے کے لئے اسے ایک بہت بڑا مسئلہ بنا دیا۔

رجعت پسند ہندو حضرات کا خیال ہے کہ تقریباً سترہ لاکھ سال پہلے اجودھیا میں ایک حکومت تھی، اس تخت کا وارث شری رام جی کو ہونا چاہئے تھا؛ لیکن بعض گھریلو اختلافات کی بنیاد پر ان کو اپنی بیوی سیتا جی کے ساتھ ۱۲ سال کا بن باس لینا پڑا، اس درمیان لنکا کے حکمراں راون نے حملہ کیا اور سیتا جی کو اغوا کر کے لے گئے اور انہیں ایک باغ میں قید رکھا گیا، رام جی اپنے بھائی لکشمن جی کے ساتھ راون کو کیفر کردار تک پہونچانے اور سیتا جی کو واپس لانے کے لئے اجودھیا سے جنوبی ہند کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے آخری سرحد کو پہنچ گئے، اور سمندر کی موجیں آگے بڑھنے میں رکاوٹ بن گئیں؛ باوجودیکہ ہندو بھائیوں کے نزدیک شری رام جی کے اندر خدائی قوت موجود تھی، مگر وہ اسے خود پار نہیں کر سکے، اس موقع پر ہنومان جی نے ان کی مدد کی، اور ان کی قیادت میں بندروں نے پتھر لا لا کر سمندر میں راستہ بنانا شروع کیا، اس راستہ کو پار کر کے شری رام جی کی

فوج لنکا میں داخل ہوئی، یہاں بھی ہنومان جی نے اپنا کرشمہ دکھایا، انہوں نے اور ان کی ذریت نے پورے لنکا میں آگ لگادی، اس طرح راون قتل کیا گیا اور سیتا جی واپس لائی گئیں، اس تصور کے تحت ان حضرات کے نزدیک اس پُل کو اچانک ایک تقدس حاصل ہوگیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ وہی ہنومان جی کا تعمیر کیا ہوا پل آج بھی موجود ہے۔

اس دیومالائی کہانی پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے؛ لیکن جب کسی چیز سے مذہبی تقدس متعلق ہوجاتا ہے، تو اس پر بعض حالات میں زبان کا بند رکھنا بہتر ہوتا ہے، ادھر حکومت کے بعض نمائندوں نے بجائے اس کے کہ وہ اس پُل کی قدامت کا انکار کرتے، انہوں نے اس سے آگے بڑھ کر پوری ہندو دیومالائی تاریخ پر نشتر لگادیا، اور کہا کہ شری رام جی کا کوئی حقیقی وجود نہیں تھا اور ان کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے، وہ محض افسانہ ہے، بی جے پی کو مایوسی اور ناامیدی اور شکست وہزیمت کے اس ماحول میں کسی نعرہ کی تلاش تھی، چنانچہ یہ موضوع ان کے لئے ایک زبردست نعرہ بن گیا، اللہ کا شکر ہے کہ مسلمانوں نے اس سلسلہ میں دانش مندی سے کام لیا اور اس پر تبصرہ سے اپنے آپ کو دور رکھا، ورنہ تو شاید پورے ہندوستان میں آگ لگ جاتی۔

حکومت نے تو اپنا یہ جواب فوراً واپس لے لیا، اور سجدۂ سہو کر لینے ہی میں عافیت سمجھی؛ لیکن جناب کروناندھی چیف منسٹر تمل ناڈو کی دراوڑ دی حس جاگ اٹھی اور انہوں نے اتنے سخت بیانات دئے کہ سنگھ قائدین کے لئے جواب دینا مشکل ہوگیا، انہوں نے اسی بات کو دوہرایا کہ رام سے جو دیومالائی کہانیاں متعلق ہیں وہ سب غلط ہیں، یہ تو شرابی و کبابی شخص تھا، انہوں نے وی، ایچ، پی قائدین سے یہ بھی دریافت کیا کہ رام یا ہنومان کس انجینئرنگ کالج کے پڑھے ہوئے تھے کہ سمندر پر پل بنالیا؟ انہوں نے کہا کہ رام ایک افسانوی نام ہے، جسے آریوں نے دراوڑ دیوں پر مسلط کیا، یہ ایسا چیلنج ہے کہ اس کے جواب میں ہندو انتہاء پسندوں اور دہشت گردوں کے پاس غصہ کرنے اور قتل کی دھمکی دینے کے سواء کوئی اور راستہ نہیں تھا، چنانچہ انہوں نے یہی کیا۔

مسلمانوں کو اسلامی نقطۂ نظر سے اس واقعہ میں دو باتیں غور کرنے کی ہیں، پہلی بات یہ ہے کہ مذہبی شخصیتوں کے بارے میں اس طرح کے اظہار خیال کو اسلام کس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے؟ ——— قرآن مجید نے اس سلسلہ میں اصولی بات کہی ہے کہ دوسری قومیں جن معبودانِ باطل کو پوجتی

ہوں ان کو برا بھلا نہ کہو ؛ کیوں کہ اس سے مذہبی تقدس پامال ہوگا اور لوگ ایک دوسرے کی مذہبی شخصیات اور قابل تقدیس چیزوں کو برا بھلا کہنے لگیں گے :

{وَ لاَ تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ} (الانعام : ۱۰۸)

رسول اللہ ﷺ نے جب مکہ میں نعرۂ توحید بلند کیا تو وہاں بعض ایسے بت نصب تھے ، جن کے بارے میں اہل مکہ کا تصور تھا کہ ان کو حرم میں بدکاری کرنے کی وجہ سے خدا نے پتھر بنادیا ، مگر اس کے باوجود وہ برابر ان کی پرستش بھی کرتے تھے ، یہ بات ممکن تھی کہ قرآن مجید میں اس پہلو کا ذکر کیا جاتا ؛ لیکن قرآن نے صرف عقیدۂ توحید کو سمجھانے کے لئے بتوں کی ناطاقتی اور عجز کو بتایا ، اس کے ساتھ مروج ان تصورات کا ذکر نہیں کیا ؛ اس لئے ملے جلے معاشرہ میں ہمارا رویہ یہی ہونا چاہئے کہ دوسری قوموں کے جو مسلمہ عقائد اور مقدس مقامات وشخصیات ہیں ، ان کے بارے میں تحمل سے کام لیا جائے ، ایسی بات نہ کہی جائے جو کسی گروہ کو ٹھیس پہونچانے والی ہو اور یہ بات قابل تعریف ہے کہ اس موقع پر مسلمانوں نے یہی راستہ اختیار کیا ہے ۔

دوسرا پہلو مذاہب کی تاریخیت کا ہے ، ہندو مذہب کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ یہ سترہ اٹھارہ لاکھ سال پہلے کا ہے ، ظاہر ہے کہ ان اعداد وشمار کے لئے کوئی تاریخی یا سائنسی بنیاد نہیں ہے ، ہندو مذہب میں کوئی ایسی کتاب نہیں ہے ، جس پر ہندوؤں کے تمام گروہوں کا اتفاق ہو ، کوئی ایسی شخصیت نہیں ہے جو ہندوؤں کے تمام فرقوں کے نزدیک آئیڈیل اور نمونہ ہو ، جن شخصیتوں کا نام لیا جاتا ہے نہ ان کی تاریخ ہے اور نہ ان کتابوں کی کوئی تاریخ ہے ، جنھیں آج ہندوؤں کے مختلف الگ الگ گروہوں میں مقبولیت حاصل ہے ۔

اس لحاظ سے دیکھیں تو دنیا میں کوئی مذہب اسلام کا ہمسر نظر نہیں آتا ، اسلام کے بنیادی عقائد وافکار عقل کے مطابق ، قانونِ فطرت سے ہم آہنگ اور انتہائی درجہ سائنٹفک ہیں ، اسلام کی بنیادی کتاب قرآن مجید ایک ایک حرف اور نقطہ کے ساتھ محفوظ ہے ، اس کا دعویٰ ہے کہ خدا نے خود اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے : {إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَإِنَّا لَہُ لَحَافِظُوْنَ} (الحجر : ۹) اور پوری تاریخ اس پر شاہد ہے ، خود قرآن مجید نے کہا ہے کہ یہ کتاب اختلاف وتضاد سے خالی ہے ، اگر یہ اللہ

کی کتاب نہ ہوتی، تو اس میں بہت سارا اختلاف وتضاد ہوتا:

{اَفَلاَ یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلاَفًا كَثِیْرًا} (النساء: ۸۲)

جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو خود قرآن نے اسوہ ونمونہ بنا کر پیش کیا ہے اور آپ ﷺ کی پوری زندگی تاریخ کی روشنی میں ہے، اسلام نے جن مقامات کو مقدس قرار دیا ہے، ان کا بھی یہی حال ہے، ان کی پشت پر تاریخ اور سائنس کی شہادت موجود ہے اور اس میں ایسی دیومالائی داستانیں نہیں ہیں، جن سے کان کو تو لذت حاصل ہو سکتی ہو اور عجوبہ پسند انسان کی تفریح کا سامان تو بن سکتا ہو؛ لیکن دماغ ان کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہو۔

ایسے واقعات ہمارے ایمان کو بڑھاتے ہیں اور اپنی سعادت بختی اور خوش قسمتی کے احساس کو دوبالا کرتے ہیں کہ خدا نے کیسی محفوظ کتاب سے اس امت کو نوازا ہے، اور کیسے پیارے رسول ﷺ کو اس کے لئے اسوۂ ونمونہ بنایا ہے، ہم اس پر فخر بھی کریں، اللہ کا شکر بھی ادا کریں، اور اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں بھی کہ کیا ہم اس بے مثال اور لازوال نعمت کا حق بھی ادا کر رہے ہیں اور کیا اس کتاب اور صاحب کتاب کو ہم نے اپنی زندگی کے لئے نمونہ بھی بنایا ہے؟

{فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ} (الحشر: ۲)

۵/اکتوبر ۲۰۰۷ء

فرشتوں سے بڑھ کر ہے انسان ہونا

کائنات کا عمومی نظام یہ ہے کہ جس شیٔ کے ذریعہ دوسری چیز وجود میں آتی ہے، اس شیٔ کی عمر اس سے زیادہ ہوتی ہے، درخت سے پھل پھول پیدا ہوتے ہیں، پھل پھول کی زندگی درخت کے مقابلہ بہت حقیر اور معمولی ہوتی ہے، مٹی سے اینٹ، اور پتھروں کے غبار سے سمینٹ بنائی جاتی ہے اور زمین و پہاڑ کی عمر اِن مصنوعات سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے؛ لیکن حضرت انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے، وہ خدا کی دی ہوئی عقل وصلاحیت سے بے شمار چیزیں بناتا ہے، فلک بوس عمارتیں، دیوہیکل مشینیں، آرام دہ اور مضبوط گاڑیاں، خوبصورت فرنیچر، اس کے لگائے ہوئے درختوں سے لہلہاتے ہوئے باغ وجود میں آتے ہیں؛ لیکن انسان کی زندگی خود اس کے اپنے ہاتھوں بنائی ہوئی چیزوں کے مقابلہ بہت کم ہوتی ہے، اس کا تعمیر کیا ہوا گھر کئی پشتوں کے لئے کافی ہوتا ہے، اس کے لگائے ہوئے درختوں سے کئی نسلوں کو لذت بخش پھلوں کی نعمت حاصل ہوتی ہے، لیکن اس کی متاعِ حیات کا حال یہ ہے کہ زیادہ عمر پائی تو ساٹھ ستر سال اور یقین تو ایک پل کا بھی نہیں، بقول فانی:

آدمی بلبلا ہے پانی کا
کیا ٹھکانا ہے زندگی کا ؟

اس لئے انسان کا لمحہ لمحہ قیمتی ہے، ہر ساعت جو گزرتی ہے زندگی کی مہلت کو کم کرتی جاتی ہے اور ہر دن جب سورج اپنی آنکھیں بند کرتا ہے، اور سرمئی شام طلوع ہوتی ہے، تو حیاتِ مستعار کا ایک دن کم ہو جاتا ہے، اگر انسان کو اس کی موت کا متعین وقت بتا دیا جائے، تو شاید وہ ''مرنے'' سے پہلے مر جائے، بہت سے جلاد صفت، طاقت ور اور بہادر مجرموں کو دیکھا گیا ہے کہ اگر سزائے موت کا فیصلہ ہو جائے، تو حوصلے ایسے ٹوٹ جاتے ہیں کہ پھانسی کے پھندے تک پہنچنے کے لئے بھی ان کو

سہارا دینا پڑتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ کوئی کمزور ونحیف شخص ہے، جو جرم کی طاقت بھی نہیں رکھتا اور اسے سزا دی جارہی ہو، اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے انسان سے اس بات کو چھپا رکھا ہے کہ زندگی سے کب اس کا رشتہ ٹوٹنے والا ہے؟ یہی ایک بات ہے جو قبر کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کو غفلت میں مبتلا کئے ہوئے ہے، وہ جیسے جیسے اپنے انجام کی طرف بڑھتا جاتا ہے، ویسے ہی اس کی حرص ولالچ بھی بڑھتی جاتی ہے، نئی نئی آرزوئیں اور تمنائیں کروٹ لیتی رہتی ہیں، انسان خود بوڑھا ہوتا جاتا ہے؛ لیکن نفس کے چونچلے جوان ہوتے جاتے ہیں۔

انسان اگر اس پہلو سے دیکھے تو ایک سال کا گزرنا اور نئے سال کا آنا خوشی کی بات نہیں ہے، سال گزرا تو زندگی کا ایک سال اور کم ہوگیا، اگر روپے پیسے کم ہوجائیں تو انسان رنجیدہ ہوتا ہے ؛ حالاں کہ مال ایک بار کھو جائے، تو دوبارہ حاصل کیا جاسکتا ہے، صحت میں کمی واقع ہوئی تو انسان پیکر فکر واَلم بن جاتا ہے، حالاں کہ وہ دوبارہ صحت یاب ہوسکتا ہے؛ لیکن انسان کی زندگی اور عمر ایسی نعمت ہے، جو گھٹنے کے بعد بڑھتی نہیں ہے، اور جسے کھونے کے بعد پایا نہیں جاسکتا:

{إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلاَ يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لاَ يَسْتَقْدِمُوْنَ}

(یونس: ۴۹)

اس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ جب سال گزرے تو انسان متفکر اور ایک درجہ میں رنجیدہ ہو، مگر عین اسی وقت انسان خوشی میں مست ؛ بلکہ بدمست ہوجاتا ہے، بجائے اس کے کہ اس کے دماغ میں فکر سمائی ہوئی ہو، اس پر نشہ سوار ہوتا ہے، بجائے اس کے کہ اس کی زبان پر اللہ کا شکر اور دعاء والتجاء ہو، بے ہودہ نغمے اور فحش کلمات ہوتے ہیں، بجائے اس کے کہ وہ کسی خلوت کدہ میں بیٹھتا اور تنہائی میں سوچتا کہ اس نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے؟ وہ اپنے شور وغل سے بازاروں اور سڑکوں کو آباد رکھتا ہے۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ اس بار عیسوی اور ہجری کیلنڈر میں نو ہی دنوں کا فرق ہے، یعنی دس جنوری کو یکم محرم الحرام ہے، ۲۰۰۸ء اور ۱۴۲۹ھ کا تقریباً ایک ساتھ آغاز ہوا ہے، اس بار ۲۰۰۸ء کی پہلی شب میں جو حیا سوز مناظر قوم کے سامنے آئے ہیں، اس نے بے حیائی کے پچھلے ریکارڈ کو توڑ دیا ہے، ملک کے مختلف شہروں میں اس موقع سے نہایت تکلیف دہ اور بے ہودہ واقعات سامنے آئے ہیں، ممبئی میں دو غیر ملکی خواتین کے ساتھ ایسا بے ہودہ رویہ اختیار کیا گیا کہ نہ

اخلاق اس کی اجازت دیتا ہے اور نہ ہندوستان کی روایات میں اس کی گنجائش ہے، ان خواتین کے لباس تک تار تار کردئے گئے، اسی طرح کا واقعہ کیرالا میں ایک سیاح خاتون کے ساتھ پیش آیا، اس کے علاوہ ملک کے مختلف شہروں میں ؛ بلکہ شہروں سے گزر کر قصبات میں بھی ایسے واقعات پیش آئے، جنھیں سن کر رونگٹا کھڑا ہوجاتا ہے اور افسوس کہ ایسی حرکتوں میں طلبہ پیش پیش ہیں۔

نئے سال کے نام پر اس طرح کی غیر اخلاقی حرکتیں اصل میں مغربی تہذیب کی دین ہے، ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت سے حکومت تک پہونچی تھی اور اس نے زر کے ساتھ زمین کو فتح کرنے کی کامیاب کوشش کی اور گلوبلائزیشن کے نام پر اب مغربی کمپنیاں تجارت کے راستے سے مشرقی ثقافت کو فتح کر رہی ہیں، وہ چاہتی ہیں کہ پوری دنیا میں ایسی تہذیب قائم ہو اور پروان چڑھے جس کی لغت میں حیا اور اخلاق کے الفاظ بالکل نہ ہوں ؛ تاکہ پوری دنیا میں مغربی ملبوسات فروخت ہوں، مغربی شرابوں سے آباد مئے خانے وجود میں آئیں، پُرتعیش تفریحات کا دور دورہ ہو، ہوٹلوں کا کلچر قائم ہو، اور اس طرح بالواسطہ مغربی مصنوعات مشرق کے چپہ چپہ میں چھا جائیں؛ اس لئے ایشیائی اور مشرقی ملکوں میں ایسی ایسی تقریبات متعارف کی جارہی ہیں کہ دس بیس سال پہلے جن کے نام سننے میں نہیں آتے تھے، جیسے یوم عاشقاں اور نیو ایر نائٹ وغیرہ، مغربی ملکوں میں چوں کہ اس طرح کی سرمستیاں روز کا معمول ہیں اور منچلے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہفتہ میں دو دن اسی لہو ولعب میں گزارتے ہیں، پھر ان کے یہاں بے روزگاری مشرقی ملکوں کی طرح نہیں ہے؛ اس لئے ایسی تفریحات ان کی پہنچ میں ہے؛ اس لئے ایسے مواقع پر ان کے یہاں آپے سے باہر ہونے کے واقعات کم پیش آتے ہیں، مشرقی اور ایشیائی ملکوں کی صورت حال اس سے مختلف ہے؛ اس لئے نوجوان یہاں بے قابو ہوکر رہ جاتے ہیں۔

ایسے واقعات کے تدارک کے لئے قانون اور تعلیم وتربیت دونوں مطلوب ہیں، قانون سے مراد یہ ہے کہ سالِ نو کی تقریبات منعقد کرنے، نیز اس موقع پر ڈانس اور دوسرے پروگرام رکھنے سے منع کیا جائے، اسٹار ہوٹلوں پر کڑی نگرانی کی جائے، آٹھ نو بجے شب سے ہی تفریحی علاقے لوگوں سے خالی کرالئے جائیں، شراب خانے خاص طور پر اس دن بند رکھے جائیں، خواتین کو بازاروں اور سڑکوں پر چلنے سے خصوصی طور پر روکا جائے، دوکانیں سرِ شام بند کردی

جائیں، اور حکومت سختی کے ساتھ اس پر عمل کرے نیز تفریحی علاقوں میں پولیس گشت کا اہتمام ہو تو ایسے واقعات کو روکا جاسکتا ہے۔

اس سے زیادہ ضروری نوجوانوں کی تربیت ہے، ہمارا تعلیمی نظام ایسا ہو گیا ہے کہ اس سے ڈاکٹر، انجینئر ، ماہرین معاشیات، سائنس داں، آئی اے ایس اور آئی پی ایس وغیرہ تو بکثرت پیدا ہو رہے ہیں اور وہ ملک کی معاشی اور صنعتی ترقی میں اہم رول ادا کر رہے ہیں؛ لیکن انسان پیدا نہیں ہو رہے ہیں، یہ زندہ مشینیں ہیں، نوٹ چھاپنے اور پیسے کمانے والی مشینیں، ان کے پاس ایسے دماغ ہیں جو کمائی کے نت نئے وسائل کو تلاش کریں اور راحت و آسائش کے محیر العقول ذرائع کو وجود میں لائیں؛ لیکن وہ دماغ نہیں ہے، جو انسان کی فلاح کے لئے سوچے، وہ دل نہیں ہے، جو انسانیت کے دکھ کو دیکھ کر تڑپ اٹھے، وہ فکر نہیں ہے جس میں انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کی قیمت سب سے زیادہ ہوتی ہے، اور وہ ہاتھ پاؤں نہیں ہیں جو انسانیت کی فلاح اور اس کے مسائل کو حل کرنے کے لئے متحرک ہوں، ایسے لوگوں کو دانشور کہنے کے بجائے ''پڑھا لکھا جاہل'' کہنا چاہئے، اور انسان سمجھنے کے بجائے ''معاشی حیوان'' سمجھنا چاہئے، مولانا حالی کے بقول:

فرشتوں سے بڑھ کر ہے انسان ہونا
مگر اس میں ہوتی ہے مشکل زیادہ

ہماری درس گاہوں میں اخلاق، انسانی بھلائی، سماج کی تعمیر، انسانی جان و مال اور عزت و آبرو کی اہمیت اور اس سلسلہ میں معاشرہ کی ذمہ داریوں کا کوئی سبق نہیں پڑھایا جاتا؛ اس لئے پڑھے لکھے نوجوانوں کی طرف سے بھی ایسے واقعات پیش آتے ہیں، جنہیں سن کر سر شرم سے جھک جاتا ہے، اب یہی دیکھئے کہ ریاست آندھرا پردیش کے انسٹی کرپشن بیورو نے اپنی سالانہ رپورٹ میں انکشاف کیا ہے کہ ریاست کے چودہ لاکھ سرکاری ملازمین میں صرف دس فیصد ہی لوگ ایسے ہیں، جو ایماندار اور دیانتدار کہے جاسکتے ہیں، اگر پورے ملک کے اعداد و شمار کو سامنے رکھا جائے تو یہ تناسب دس فیصد سے بھی کم ہو جائے گا، ظاہر ہے یہ ہمارے تعلیمی نظام کی کوتاہی ہے؛ اسی لئے ضرورت ''انسانوں'' کو پیدا کرنے کی ہے، جب تک حقیقی انسانیت پیدا نہیں ہوگی، کتنی ہی ظاہری ترقی ہو جائے معاشرہ کو ان سے حقیقی فائدہ نہیں پہونچے گا اور ایسے واقعات پیش آتے رہیں گے۔

مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ دینی نقطۂ نظر سے بھی ایسے مواقع پر اپنے لئے طریقۂ کار متعین کریں ، ایک مسلمان کے لئے سال نو کے استقبال کی کوئی صورت ہوسکتی ہے تو وہ ہے اپنا احتساب اپنی زندگی کا جائزہ اور اس کی روشنی میں مستقبل کا پروگرام ، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن ابن آدم کا قدم اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکے گا ، جب تک اس سے پانچ چیزوں کے بارے میں سوال نہ ہوجائے ، عمر کے بارے میں کہ اس نے یہ عمر کس کام میں خرچ کی ؟ اس کی جوانی کے بارے میں کہ اسے کس طرح گزارا ؟ مال کے بارے میں کہ اس نے کہاں سے حاصل کیا اور یہ بھی کہ اس نے کہاں خرچ کیا ؟ اور علم کے بارے میں کہ اس نے کس حد تک اس پر عمل کیا ؟ (مسند ابو یعلی عن ابن مسعودؓ ، حدیث نمبر : ۵۲۷۱) کچھ ترمیم واضافہ کے ساتھ حضرت ابو برزہ اسلمی ؓ (ترمذی شریف ، حدیث نمبر : ۲۴۱۷) وغیرہ سے بھی یہ روایت نقل کی گئی ہے ۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اسی حدیث کو سالِ نو کا ایجنڈا بنائیں ، جیسے ایک تاجر مارچ کے مہینے میں پورے سال کی تجارت کا حساب کرتا ہے ، اور اس کے نفع ونقصان کو جوڑتا ہے ، اسی طرح ایک مسلمان کے لئے صحیح طریقۂ کار یہ ہے کہ وہ ایک طرف اللہ کا شکر ادا کرے کہ خدا نے سال بھر اسے کتنی بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے ، دوسری طرف اپنی کوتاہیوں اور بداعمالیوں کا جائزہ لے اور اس پر استغفار کرے ، زندگی کے تمام شعبوں میں اپنے آپ کو دین کی کسوٹی پر پرکھے کہ کہاں کہاں وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کو توڑا ہے ؟ اور یہ عزم کرے کہ خدا نے اب جو مہلت اسے دی ہے ، اس کے ایک ایک لمحہ کو وہ شریعت کے احکام کے مطابق گزارے گا اس کی جوانی خدا کے دین کی سربلندی اور انسانیت کی خدمت میں خرچ ہوگی ، وہ مال جائز طریقے پر حاصل کرے گا ، اور جائز راستہ میں خرچ کرے گا ، وہ اپنے علم سے صرف پیسے نہیں کمائے گا ؛ بلکہ خدا کی رضا کو بھی حاصل کرے گا ، وہ اپنی زندگی اور عمر کو اللہ کی نعمت سمجھ کر اس طرح گزارے گا کہ خدا کے دربار میں جواب دہی آسان ہوسکے ، سالِ نو کی آمد اس لئے ہے کہ بدمستوں کو ہوش میں لائے ، غافلوں کو بیدار کرے ، سوتوں کو جگائے ، اگر خود احتسابی کے اس وقت کو رقص وسرود اور سرمستیوں میں گزار دیا جائے تو یہ ایسے ہی ہے ، جیسے بیمار بستر مرگ پر ہو اور اپنی بیماری کو پہچاننے کے بجائے صحت کا جشن منانے لگے ۔

۱۱/ جنوری ۲۰۰۸ء

نفل حج — غور وفکر کے چند پہلو

انسان کے لئے سعادت اوراعزاز کی بات ہے کہ خدا نے اپنی غلامی اور بندگی کے لئے اس کو پیدا کیا ہے: {وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالإِنْسَ إِلاَّ لِيَعْبُدُوْنِ} (الذاریات: ۵۶)، اگر انسان کسی کو چھ آٹھ گھنٹہ کے لئے ملازم اورمزدور کی حیثیت سے رکھتا ہے تو اِن اوقات کا وہ مالک ہوتا ہے، مزدور اپنے آجر کی اجازت کے بغیر اس وقت کہیں جا نہیں سکتا اور اپنا یا کسی اور شخص کا کوئی کام انجام نہیں دے سکتا، انسان چوبیس گھنٹہ کے لئے اللہ کی غلامی میں ہے؛ اس لئے اسے صبح کی پو پھٹنے سے لے کر اگلی صبح تک پورا وقت اللہ ہی کے حکم کے مطابق گذارنا ہے، وہ خود اپنے وقت کا مالک نہیں، یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ خدا کی مرضی پر اپنے آپ کو راضی رکھے، انسان کسی چیز کو بناتا ہے تو حسب خواہش اس کو استعمال کرتا ہے، انسان لکڑی سے کرسی بناتا ہے، کرسی یہ مطالبہ نہیں کرسکتی کہ مجھ پر فلاں شخص بیٹھ سکتا ہے اور فلاں شخص نہیں، انسان نے مٹی سے اینٹیں بنائی ہیں، اینٹ مسجد جیسی پاکیزہ جگہ کی تعمیر کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے اور اسی سے بیت الخلاء کی دیواریں بھی تعمیر ہوتی ہیں ، اگر اینٹ کی زبان ہوتی اور وہ بنانے والے شخص سے احتجاج کرتی کہ مجھے صرف مسجد کی تعمیر ہی کے لئے استعمال کیا جائے، بیت الخلاء کی تعمیر کے لئے استعمال نہیں کیا جائے تو یقینا انسان اس بات کو نا قابل توجہ سمجھتا، اسی طرح خدا نے انسان کو بنایا ہے؛ اس لئے خدا کو حق ہے کہ وہ جو کچھ چاہے انسان کے لئے حکم دے، جس چیز کو چاہے حلال کرے اور جس چیز کو چاہے حرام قرار دے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: {أَلاَ لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ} (الأعراف: ۵۴) یعنی اس جہان کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے کی ہے؛ اس لئے اس پر اللہ ہی کا حکم چلے گا۔

مشرکینِ مکہ سود کو جائز سمجھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ سود اور تجارت ایک ہی طرح کا معاملہ ہے ، سودخوار بھی مہلت کا معاوضہ وصول کرتا ہے، تاجر کا پیسہ بھی تجارت میں عرصہ تک منجمد رہتا ہے، اس

کے عوض کے طور پر وہ نفع حاصل کرتا ہے، گویا دونوں سرمایہ لگانے اور کچھ عرصہ اپنے سرمایہ سے محروم رہنے کا عوض حاصل کرتے ہیں، قرآن مجید میں ان کی اس کھوٹی فکر پر تنقید کی گئی، یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ تاجر نقصان کے خطرہ کو قبول کر کے نفع کے فطری قانون کے ساتھ چلتا ہے؛ کیوں کہ جہاں نفع کی توقع ہوتی ہے، وہاں نقصان کا اندیشہ بھی دامن گیر رہتا ہے؛ لیکن سودخوار نقصان کے خطرہ کو قبول نہیں کرتا ہے، وہ بہرصورت نفع کا طلب گار ہوتا ہے، جو ایک غیر فطری چیز ہے، تجارت اور سود میں فرق کی اور جہتیں بھی ہیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پہلوؤں کو بیان نہیں فرمایا؛ بلکہ مالکِ کائنات اور قادر مطلق کی حیثیت سے ارشاد فرمایا کہ تجارت اور سود برابر نہیں ہو سکتے؛ کیوں کہ میں نے تجارت کو جائز رکھا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے: {أَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا} (البقرۃ:۲۷۵)

یہ عبدیت اور بندگی کا بنیادی پہلو ہے کہ جیسے انسان اپنی مصنوعات کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے، خدا اپنے بندوں کو اسی طرح جو چاہے حکم دے سکتا ہے، انسان کے لئے اس پر شکوہ سنج ہونا قطعاً نامعقول بات ہے، گویا بندگی اور عبدیت انسان کی پوری زندگی کا احاطہ کئے ہوئی ہے؛ اس لئے ہر عمل اس کو خدا کے حکم اور اس کی خوشنودی کے مطابق ہی کرنا چاہئے، چاہے اس کا تعلق سماجی زندگی اور معاشی مسائل سے ہو یا زندگی کے دوسرے مسائل سے؛ لیکن شریعت میں کچھ اعمال ایسے ہیں جن کا دوسرے انسانوں یا کسی اور سے کوئی تعلق نہیں؛ بلکہ اُن سے براہ راست خدا اور بندہ کے تعلق کا اظہار ہوتا ہے، جیسے: نماز، روزہ، زکوۃ، حج، قربانی، نذر —— ایسے افعال کو ''عبادت'' کہا جاتا ہے، یہ اللہ کے علاوہ کسی اور کے لئے جائز نہیں، اسلام سے پہلے جو مذاہب تھے، ان میں ان عبادتوں کے لئے جگہیں مقرر تھیں، انہیں مقامات پر عبادت کی جا سکتی تھی، اب بھی دوسری قومیں اپنی مخصوص عبادت گاہوں میں جا کر ہی اپنے مذہب کے مطابق پوجا وغیرہ کرتی ہیں؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کی رحمت عامہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس امت کے لئے تمام روئے زمین پر عبادت کی اجازت دی گئی، مسلمان اپنے گھر میں بھی نماز پڑھ سکتا ہے، اپنے دفتر اور کارخانہ میں بھی نماز پڑھ سکتا ہے اور کسی کھلے میدان میں بھی اللہ کے سامنے اپنا سر جھکا سکتا ہے؛ لیکن اجتماعیت، مرکزیت اور ماحول کی سازگاری کی غرض سے عبادت کے لئے ایک مخصوص جگہ بھی رکھی گئی ہے، جہاں پر جماعت کے ساتھ فرض نمازیں ادا کی جاتی ہیں اور جس میں اعتکاف کیا جاتا ہے، اس جگہ کو

''مسجد'' کا نام دیا گیا ہے، یعنی خدا کے سامنے سر جھکانے کی جگہ؛ —— اس لئے مساجد کی اسلام میں خاص اہمیت ہے، یہ اہل ایمان کی آبادیوں کی پہچان ہے؛ اس لئے فطری طور پر ہر مسلمان کے دل میں اللہ کے گھر کی محبت وعظمت ہوتی ہے۔

پھر جیسے انسانوں کا سلسلہ نسب ہے، جس کی ابتداء پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام سے ہوتی ہے، اسی طرح مسجدوں کا بھی ایک سلسلۂ نسب ہے، جس کی ابتداء کعبۃ اللہ شریف سے ہوتی ہے؛ کیوں کہ وہی اللہ کی عبادت کے لئے بننے والا پہلا گھر ہے: {إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ بِبَكَّةَ مُبَارَكًا} (آل عمران: ۹٦) اللہ کے اس پہلے گھر کو پہلے انسان اور پہلے نبی سیدنا حضرت آدم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا؛ اس لئے فطری بات ہے کہ ہر مسلمان اپنے مالک کی اس چوکھٹ پر پہنچنے اور اس کے در و دیوار کا پھیرا لگانے کا آرزو مند ہوتا ہے، یہ ایمان کے بنیادی تقاضوں میں شامل ہے، اسی آرزوئے ملاقات کے پورا کرنے کو ''حج'' کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص سفر حج پر قادر ہونے کے باوجود حج نہ کرے، تو مجھے اس سے غرض نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا عیسائی:

> ''قال رسول اللہ ﷺ: من ملک زادا وراحلة تبلغه إلى بيت الله ولم يحج فلا عليه أن يموت يهوديا أو نصرانيا إلخ'' (سنن الترمذی، عن علی رضی اللہ عنہ کتاب الصوم، باب التغليظ فی ترک الحج، حدیث نمبر: ۸۱۲)

کعبہ چوں کہ مسلمانوں کا قبلہ ہے؛ اس لئے یہودیوں اور عیسائیوں کو حق سے انحراف اور ہدایت سے محرومی کی وجہ سے ہمیشہ ہی اس مقدس جگہ سے بیر رہا ہے؛ اسی پس منظر میں آپ ﷺ نے یہودیوں اور عیسائیوں سے مثال دی کہ ایسا شخص دراصل یہودیوں اور عیسائیوں کی فاسد فکر اور کعبۃ اللہ کے تئیں معاندانہ جذبہ پر قائم ہے؛ اس لئے حج اسلام کے پانچ اہم ترین ارکان میں سے ایک ہے؛ لہٰذا جب کسی شخص پر حج فرض ہو جائے تو اس کو جلد سے جلد حج کر لینا چاہئے، یہ تصور کہ مکان بنالیں گے، لڑکے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے، کاروبار بڑھ جائے گا، لڑکیوں کی شادی ہو جائے گی، ملازمتوں سے ریٹائرڈ ہو جائیں گے اور زندگی کے تمام مسائل حل کر لیں گے تو اس کے بعد حج کریں گے، نہایت ہی غلط تصور ہے، رسول اللہ ﷺ نے غربت وافلاس کے اندیشوں

کو دور کرنے اور وہم وگمان کے اسی کانٹے کو دل سے نکالنے کے لئے واضح فرمادیا کہ حج جیسے گناہ کو دور کرتا ہے، ویسے ہی فقر ومحتاجی کو بھی دور کرتا ہے:

"تابعوا بين الحج و العمرة فإنهما ينفيان الفقر و الذنوب كما ينفي الكير خبث الحديد إلخ" (سنن الترمذی، کتاب الصوم، باب ثواب الحج و العمرة، حدیث نمبر: ۸۱۰، سنن النسائی، حدیث نمبر: ۲۶۳۰، ۲۶۳۱)

تاکہ ایسے شیطانی وساوس کے سامنے ہتھیار ڈال کر انسان حج میں تاخیر نہ کرتا چلا جائے۔

حج فرض کے علاوہ "حج نفل" کی بھی اہمیت ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی نے قدرت کے باوجود پانچ سال میں حج نہیں کیا، وہ محروم ہے، (صحیح ابن حبان، کتاب الحج، باب فضل الحج و العمرة، حدیث نمبر: ۳۷۰۳) بعض روایتوں میں پانچ سال کے بجائے چار سال کا ذکر آیا ہے (المعجم الأوسط للطبرانی، حدیث نمبر: ۴۸۶، مصنف عبدالرزاق، حدیث نمبر: ۸۸۲۶)؛ اس لئے اگر انسان کو حج نفل کی استطاعت ہو تو اس کی بھی کوشش کرنی چاہئے؛ لیکن اس سلسلہ میں چند باتوں کا لحاظ ضروری ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ سعودی حکومت کی طرف سے بعض صورتوں میں پانچ سال کے اندر دوبارہ حج کے لئے جانے کی ممانعت کی گئی ہے، اسی طرح حکومت ہند نے بھی حج کمیٹی کے واسطہ سے جانے والوں پر پابندی رکھی ہے کہ وہ پانچ سال کے اندر دوبارہ حج کے لئے نہیں جائیں، ان پابندیوں کا مقصد حج سے روکنا نہیں ہے؛ بلکہ حجاج کے ازدحام کو کم کرنا ہے اور جن لوگوں نے اب تک حج نہیں کیا ہے، ان کو سہولت فراہم کرنا ہے، یہ مصلحت شریعت کے خلاف نہیں ہے، جو لوگ مکہ میں رہنے والے ہیں، ان کو زمانۂ حج میں عمرہ کرنے سے منع کیا گیا؛ اسی لئے وہ حج تمتع یا قران نہیں کرسکتے، اس ممانعت کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ جو لوگ باہر سے حج کے لئے آئے ہیں، ان کو سہولت ہوجائے اور وہ ازدحام کی وجہ سے زیادہ دشواری سے دوچار نہ ہوں، پانچ سال میں حج نفل کی ترغیب کے متعلق جو حدیث آئی ہے، غالباً اسی کو پیش نظر رکھ کر سعودی حکومت نے یہ مدت مقرر کی ہے؛ اس لئے حجاج کا فریضہ ہے کہ وہ اس سلسلہ میں قانون کے مطابق عمل کریں، دھوکہ دے کر

یا جھوٹا حلف نامہ داخل کر کے نفل حج کرنا یقینا کوئی مناسب عمل نہیں ہے اور اس میں ان دوسرے حاجیوں کے ساتھ حق تلفی بھی ہے، جن کا نام ایسی درخواستوں کی وجہ سے قرعہ اندازی میں نہیں آپاتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ پرائیویٹ ٹور کے ذریعہ جانے والے حجاج کے سلسلہ میں سعودی سفارت خانہ نے کچھ ٹراویلس کوان کے ریکارڈ کے بنیاد پر ایجنٹ مقرر کر دیا ہے اور انہیں حاجیوں کا ایک کوٹہ دے دیا ہے، جس کا مقصد انتظام و انصرام کی سہولت ہے، مگر بدقسمتی سے بعض ٹراویلس اس اجازت نامہ سے فائدہ اٹھا کر مفت میں حاصل شدہ حج ویزے فروخت کرنے لگے ہیں اور لوگ مجبوراً بڑی رقمیں دے کر ویزے لگواتے اور حج کا سفر کرتے ہیں، اسی طرح ویزے کا فروخت کرنا رشوت لینا اور باطل طریقہ پر دوسروں کے پیسے کھانا ہے اور پیسے دے کر ویزے لگوانا رشوت دینا ہے، رسول اللہ ﷺ نے رشوت لینے والے اور دینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے (سنن أبو داؤد، کتاب الأقضیۃ، باب فی کراھیۃ الرشوۃ، حدیث نمبر: ۳۵۸۰)؛ اس لئے اگر کسی شخص پر حج فرض باقی ہو اور اس کے لئے ویزا خریدے بغیر چارہ نہ ہو تب تو وہ ویزا خرید سکتا ہے؛ کیوں کہ فرض کی ادائیگی ایک ضرورت ہے اور ضرورت کے موقع پر بہ کراہت خاطر رشوت دینے کی اجازت ہے؛ لیکن حج نفل کا درجہ ظاہر ہے کہ ضرورت کا نہیں ہے، یہ مستحب کے درجہ میں ہے اور مستحب کو پانے کے لئے حرام کا ارتکاب درست نہیں ہوسکتا، اس سے نہ صرف آدمی رشوت دینے کا مرتکب ہوتا ہے، بلکہ وہ بالواسطہ رشوت لینے والے کی حوصلہ افزائی کا بھی مرتکب ہوتا ہے؛ اس لئے اس سے بچنا چاہئے اور ایسے لوگوں کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے۔

تیسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ فقہاء کے درمیان اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ حج نفل افضل ہے یا صدقہ افضل ہے؟ —— بعض حضرات نے حج نفل کو افضل قرار دیا ہے؛ کیوں کہ حج سے انسان کے ایمان میں جو تازگی پیدا ہوتی ہے، وہ صدقہ سے حاصل نہیں ہوسکتی، دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ صدقہ افضل ہے؛ کیوں کہ صدقہ سے انسانی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور انسان محتاج ہے؛ اسی لئے انسان کے حقوق کی خصوصی اہمیت ہے؛ لیکن جس رائے کو ترجیح دی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ حالات پر موقوف ہے، اگر کوئی شخص اپنا حج فرض ادا کر چکا ہو اور اب کسی انسان کی غیر معمولی ضرورت اس کے سامنے ہو، جیسے: اس کے اعزہ یا پڑوسیوں میں کوئی مریض ہے، جو اپنا علاج

کرانے سے قاصر ہے، یتیم بھتیجی ہے جو شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہے؛ لیکن تنگدستی کی وجہ سے اس کی شادی نہیں ہو پا رہی ہے، بیوہ بہن یا بیمار بہنوئی ہے جو اپنی لڑکی کی شادی نہیں کر پا رہا ہے، کوئی نوجوان ہے کہ تعلیمی فیس نہ ہونے کی وجہ سے اس کے تعلیم سے محروم ہو جانے کا اندیشہ ہے، ایسے مواقع پر صدقہ کرنا نفل حج کے مقابلہ میں افضل ہے اور عام حالات میں حج نفل کی فضیلت زیادہ ہے؛ لہٰذا حج نفل کرتے ہوئے اس پہلو کو بھی پیش نظر ہونا چاہئے؛ کیوں کہ انسان اپنے قرابت داروں اور پڑوسیوں کے بارے میں اللہ کے سامنے جوابدہ ہے اور حج کی تعداد سے زیادہ حج کی کیفیات کی اہمیت ہے، بعض ایسے بھائی بھی ہیں، جنھوں نے ایک درجن سے زیادہ حج کر لیا ہے اور ماشاء اللہ انہیں بار بار عمرہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے؛ لیکن اس کے باوجود لوگ ان کی زندگی میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کرتے، نہ وضع قطع میں، نہ شب و روز کے معمولات میں، نہ حرام سے بچنے میں، اور ایسی شخصیتیں بھی موجود ہیں، جنھوں نے ایک ہی بار حج کیا؛ لیکن یہی حج ان کی زندگی میں صالح تبدیلی اور پُرسعادت انقلاب کا ذریعہ بن گیا۔

آج کل ایک افسوس ناک سلسلہ حج کی تشہیر کا بھی چل پڑا ہے، حج و عمرہ کو جاتے ہوئے اور واپس آنے کے بعد اخبارات میں اشتہارات شائع کئے جاتے ہیں اور خبریں دی جاتی ہیں، یہ عبادت کی روح کے خلاف ہے، عبادت میں حتی المقدور اخفاء اور پوشیدگی مطلوب ہے، اور اعلان و تشہیر اسی قدر ناپسندیدہ ہے، حج فرض ہو یا نفل، یا عمرہ ہو، اس کی بالارادہ تشہیر سے بچنا چاہئے، دنیا کے اخبار میں آپ کا نام نہ چھپے، اس کا غم نہ کھائے، خدا کے رجسٹر میں آپ کا نام آجائے، بس اس کی کوشش کرنا ہے اور یہی مطلوب ہے کہ **حسبنا اللّٰہ و نعم الوکیل**۔

بحمد اللہ عازمین حج کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، انڈونیشیا کے بعد اب دنیا بھر میں سب سے زیادہ حجاج ہندوستان ہی سے جاتے ہیں، یہ ایک خوش آئند بات ہے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم حج کے آداب و احکام سے واقف ہوں، حج محض ایک تفریح نہ بن جائے، حج ہماری زندگی کے لئے انقلاب انگیز عمل ثابت ہو اور ہماری پوری زندگی کو تقویٰ اور للّٰہیت کے نور سے منور کر دے، حاجیوں میں عبادت اور بندگی کی روح پیدا ہو، حج جیسی پاکیزہ عبادت گناہوں سے آلودہ نہ ہونے پائے؛ کیوں کہ عبادات میں صورت نہیں ''کیفیت'' مطلوب ہوتی ہے اور ''شکل''

نہیں ''حقیقت'' اللہ کی بارگاہ میں قبولیت حاصل کرتی ہے، بقول علامہ اقبال ؎

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

۲۴/اکتوبر ۲۰۰۸ء

جزیہ — اسلامی نقطۂ نظر

ابھی کچھ عرصہ پہلے پاکستان کے صوبۂ سرحد میں مقیم سکھوں پر جزیہ عائد کرنے کی خبر ذرائع ابلاغ کے ذریعہ لوگوں تک پہونچی، یہ کہنا دشوار ہے کہ یہ کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے؟ کیوں کہ ہمارے ذرائع ابلاغ کے سامنے اکثر سچائی کو شرمسار ہونا پڑتا ہے اور جھوٹ اور دروغ گوئی کو فتح حاصل ہوتی ہے؛ لیکن بہر حال اس خبر نے اسلام کے بارے میں ایک ایسی غلط فہمی اور پروپیگنڈہ کو جنم دیا ہے، جس کا مغربی مصنفین کئی صدیوں سے ذکر کرتے آئے ہیں اور ان کے نزدیک یہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ مسلمانوں کی طرف سے ہونے والا کھلا ہوا ظلم ہے، یہاں تک کہ بعض مسلمان بھی اس سے غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

''جزیہ'' فارسی زبان کا لفظ ہے، جو اصل میں ''گزیہ'' تھا (دیکھئے: مفاتیح العلوم: ص: ۳۹، روح المعانی: ۱۰/ ۷۸) اس کا رواج ایران میں تو تھا ہی! کہ بادشاہ کو اس نام سے رعایا ٹیکس ادا کیا کرتی تھی، بائبل میں بھی غیر اسرائیلیوں سے خصوصی ٹیکس وصول کرنے کا ذکر موجود ہے، تاہم اسلام سے پہلے مذہبی اقلیتوں کے لئے حقوق کا باضابطہ کوئی قانون موجود نہیں تھا، یہ بادشاہ کے مزاج پر موقوف ہوتا تھا، اگر وہ شریف اور منصف مزاج ہوتا تو اس کا سلوک بہتر ہوتا، اور اگر اس کا مزاج ظلم و جور اور زیادتی کا ہوتا تو تمام رعایہ اور اقلیتیں خاص کر اس کے جور و جفا کا ہدف بنتی تھیں، شریعت اسلامی نے باضابطہ طور پر مذہبی اقلیت کے حقوق مقرر کئے اور اس سلسلہ میں حکومت کی ذمہ داریوں کی نشان دہی کی۔

غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ تین طرح کے معاملات کی گنجائش باقی رکھی گئی: ایک یہ کہ ان پر کوئی ٹیکس عائد نہ ہو؛ چنانچہ فقہاء نے ایسی صلح کی اجازت دی ہے، جس میں غیر مسلموں سے کوئی پیسے وصول نہ کئے جائیں، (دیکھئے: السیر الکبیر: ۴/ ۱۶) اس کی نظیر وہ صلح ہے، جو مسلمانوں کی

یہودیوں کے ساتھ مدنی زندگی کی ابتداء میں ہوئی تھی؛ بلکہ بعض مشرکین بھی اس میں شامل تھے، جس کے مطابق تمام مذاہب کے ماننے والوں کو پُرامن طریقہ پر ایک ساتھ رہنے کی تلقین کی گئی تھی، کسی پر کوئی خصوصی ٹیکس عائد نہیں کیا گیا تھا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی خاص رقم طئے ہوجائے کہ وہ اقلیت حکومت کو بطور ٹیکس ادا کیا کرے گی، اس رقم کی مقدار فریقین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے نجران کے عیسائیوں سے صلح فرمائی تھی:

"جزية توضع بالتراضي وهو الصلح، وذلك يتقدر بقدر ما وضع عليه الصلح كما صالح رسول الله أهل نجران"

(بدائع الصنائع: ۶/۸، نیز دیکھئے: المغنی: ۱۳/۲۰۹)

تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی علاقہ جنگ کے ذریعہ مسلمانوں کے زیر اقتدار آیا ہو اور جزیہ کے سلسلہ میں کسی خاص مقدار پر باہمی معاہدہ نہیں ہوا، اس صورت میں لوگوں کی مالی حیثیت کے لحاظ سے ایک خصوصی ٹیکس غیر مسلموں پر عائد ہوتا ہے:

"وجزية يضعها الإمام من غير رضاهم، وذلك على ثلاثة مراتب، إلخ" (بدائع الصنائع: ۶/۸، نیز دیکھئے: المغنی: ۱۳/۲۰۹)

-----اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ اگر غیر مسلموں سے پہلے سے جزیہ ٹیکس لینے کا معاہدہ نہ ہو، تو ان سے ٹیکس کا مطالبہ کرنا درست نہیں، دوسرے اس ٹیکس کی تعیین میں دوسرے فریق کی رضامندی اور رائے کو بھی دخل ہوتا ہے؛ البتہ بعض حالات میں خاص کر جب کوئی علاقہ بذریعہ جنگ حاصل کیا جائے تو مسلمان حکومت یک طرفہ ٹیکس عائد کرسکتی ہے؛ لیکن اس کی مقدار بہت کم ہوتی ہے

۔

اس مقدار کی تفصیل یہ ہے کہ جو مالدار اور مرفہ الحال لوگ ہیں، ان پر ۴۸ درہم سالانہ، جو متوسط آمدنی کے ہوں، ان پر ۲۴ درہم سالانہ اور جو غریب یا مزدور ہوں ان پر ۱۲ درہم سالانہ جزیہ لگے گا، (بدائع الصنائع: ۶/۸۰)---اس طرح مالدار شخص پر سالانہ ۱۲ تولہ یعنی تقریباً ۱۴۴ گرام چاندی، متوسط آمدنی کے لوگوں پر ۶ تولہ یعنی ۷۲ گرام چاندی اور غریب شخص پر ۳ تولہ یعنی ۳۶

گرام چاندی سالانہ ٹیکس کے طور پر واجب قرار پاتی ہے، لہٰذا اگر دو سو روپے تولہ چاندی مانی جائے تو متمول افراد پر سالانہ دو ہزار چار سو، متوسط آمدنی کے لوگوں پر سالانہ بارہ سو اور کم آمدنی والوں پر سالانہ چھ سو روپے جزیہ ٹیکس ہوتا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جزیہ کی مقدار کتنی کم رکھی گئی ہے؟

پھر جزیہ کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ یہ عاقل و بالغ مردوں پر واجب ہوگا، بچوں، عورتوں اور فاتر العقل لوگوں پر واجب نہیں ہوگا: ''فلا تجب علی الصبیان و النساء و المجانین إلخ'' (بدائع الصنائع: ۶ / ۸۰) نیز اگر کسی پر جزیہ باقی رہ گیا تھا اور اس کی موت واقع ہوگئی تو اب جزیہ معاف ہو جائے گا، اور اس کے ترکہ سے یا ورثہ سے جزیہ وصول نہیں کیا جائے گا، (بدائع الصنائع: ۶ / ۸۱، نیز دیکھئے: فتح القدیر: ۶ / ۵۳)؛ بلکہ اگر گزشتہ سالوں کا جزیہ باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی وصول نہیں کیا جائے گا، اب صرف مستقبل کا جزیہ وصول کیا جائے گا۔ (بدائع الصنائع: ۶ / ۸۲)۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جزیہ کی مقدار کتنی قلیل ہے اور اس کے نفاذ میں کتنی زیادہ سہولت ملحوظ رکھی گئی ہے؟ --- اب اگر ان تفصیلات کی روشنی میں طالبان کی طرف منسوب عمل کا جائزہ لیا جائے تو اول تو وہاں آباد سکھوں پر کوئی جزیہ واجب ہی نہیں ہوتا؛ کیوں کہ ہند و پاک کی تقسیم کے وقت یہ معاہدہ ہو چکا تھا اور تقسیم کے بعد بھی نہرو لیاقت معاہدہ کی صورت میں اس کو مزید مؤکد کیا گیا تھا کہ دونوں ملکوں کی اقلیتیں اپنے مذہبی حقوق کے ساتھ باقی رہیں گی، یہ اس بات کا عہد ہے کہ دونوں ملکوں میں اقلیتوں کو کوئی خصوصی ٹیکس ادا کرنا نہیں ہے؛ اسی لے پاکستان میں آباد ہندوؤں یا سکھوں سے رقم کا مطالبہ کرنا شرعاً درست نہیں اور یہ مطالبہ ظلم کے دائرہ میں آتا ہے، دوسرے: پوری کمیونٹی پر بحیثیت مجموعی جزیہ کے نام سے کوئی رقم باندھ دینا قطعاً درست نہیں، اگر کسی گروہ پر جزیہ عائد کرنا شرعی اصولوں کے مطابق درست ہو تب بھی یہ ایک انفرادی ٹیکس ہے اور جس شخص پر واجب ہو وہ ذاتی طور پر اس کے لئے جواب دہ ہے، یہ اجتماعی حیثیت میں واجب نہیں ہے۔

تیسرے: ذرائع ابلاغ نے جو کثیر و خطیر رقم ذکر کی ہے، یہ بھی سراسر ظلم ہے، شریعت میں جزیہ کی رقم زکاۃ ہی کی طرح؛ بلکہ زکاۃ سے بھی زیادہ قلیل رکھی گئی ہے، --- جیسا کہ ذکر کیا گیا --- تا کہ یہ دینے والوں کے لئے دشواری کا باعث نہ بنے؛ کیوں کہ یہ دین لوگوں پر بوجھ ڈالنے کے لئے نہیں آیا ہے، بوجھ ہلکا کرنے کے لئے آیا ہے۔

چوتھی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ جزیہ کی حیثیت غنڈہ ٹیکس کی نہیں ہے کہ کچھ لوگ اپنے طور پر کھڑے ہو جائیں اور لوگوں سے زور زبردستی کے ساتھ من چاہی رقم وصول کرنے لگیں، یہ ایک قانونی ٹیکس ہے، اور حکومت ہی اس کے وصول کرنے کی مجاز ہے، اور ظاہر ہے کہ طالبان منتخب حکومت کی نمائندگی نہیں کرتے، یہ تو زور زبردستی کا عمل ہے اور بس؛ اس لئے اگر واقعی سکھوں سے جزیہ کی رقم اسی قدر طلب کی گئی ہے، جو اخبارات و رسائل میں آیا ہے تو یہ سراسر ظلم و زیادتی ہے اور شریعت اسلامی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

ایک سوال ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر غیر مسلم رعایا پر جزیہ ٹیکس کیوں رکھا گیا ہے؟ --- اس سلسلہ میں اگر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ اس میں غیر مسلموں ہی کی رعایت ہے، اسلامی حکومت میں آمدنی کا مستقل اور اہم ذریعہ زکاۃ و عشر ہے، عشر زمینی پیداوار پر واجب ہوتا ہے اور یہ بھی زکاۃ ہی کی ایک قسم ہے، اور زکاۃ دوسرے مالوں میں واجب ہوتی ہے، یہ دونوں محصولات شرعی ٹیکس بھی ہیں اور عبادت بھی، اگر غیر مسلموں پر بھی زکاۃ اور عشر واجب قرار دے دیا جاتا تو یہ مذہبی آزادی کے مغایر ہوتا اور اس طرح گویا انہیں ایک اسلامی عبادت پر مجبور کرنا پایا جاتا؛ حالاں کہ اسلام چاہتا ہے کہ جن لوگوں نے اسلام قبول نہیں کیا ہے، وہ بھی اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد رہیں؛ اس لئے غیر مسلموں کی زرعی پیداوار میں عشر کے بجائے خراج اور دوسرے وسائل معاش کو ملحوظ رکھتے ہوئے زکاۃ کے بجائے جزیہ واجب قرار دیا گیا تو درحقیقت اس میں غیر مسلموں کی رعایت ہے نہ کہ ان پر زیادتی۔

پھر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ کوئی بھی حکومت وسائل آمدنی کے بغیر نظام مملکت کو قائم نہیں رکھ سکتی، خاص کر ملک کے انتظام اور دفاع کے لئے کثیر رقم مطلوب ہوتی ہے، جس کا شہریوں سے لیا جانا ناگزیر ہے؛ اسی لئے اسلامی ملک میں زکاۃ کے بیت المال میں داخل کرنے کو واجب قرار دیا گیا ہے، غیر مسلموں کے لئے جزیہ ٹیکس اس کا متبادل ہے، جس کے بدلے حکومت ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کرتی ہے؛ چنانچہ ایسے واقعات بھی اسلام کے ابتدائی عہد میں پیش آئے ہیں کہ جب کسی علاقہ میں مسلمانوں کی فوج پسپا ہونے لگی تو غیر مسلموں سے لی ہوئی رقمیں ان کو واپس کر دی گئیں؛ کیوں کہ جس مقصد کے تحت ان سے ٹیکس لیا گیا تھا وہ پورا نہیں کیا جا سکا اور میرا خیال ہے کہ ملک کے کسی شہری کی حفاظت کے لئے جزیہ کے نام سے جتنی معمولی رقم لی جاتی تھی،

اگر دنیا کی حکومتیں اتنی رقم لے کر تحفظ کی ضمانت لیں اور اس کا انتظام کر دیں تو لوگ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

قرآن مجید میں جزیہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: {۔۔۔ **یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون** }(التوبہ:۲۹)''یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ ادا کریں درآں حالاں کہ وہ چھوٹے ہیں'' ---اس سے بعض حضرات کو یہ خیال ہوا کہ جزیہ وصول کرنے سے غیر مسلم باشندوں کی تذلیل مقصود ہے؛لیکن یہ غلط ہے، نہ قرآن میں ایسی کوئی بات آئی ہے نہ حدیث میں، اور نہ رسول اللہ ﷺ کے طرز عمل سے ایسی کوئی بات معلوم ہوتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اپنے آپ کو''چھوٹا محسوس کرنے'' کی تعبیر سے مراد دوسرے کے اقتدار کو تسلیم کرنا اور اپنے آپ کے رعایا ہونے کو قبول کرنا ہے، منشاء یہ ہے کہ جب کوئی شخص حکومت کو ٹیکس ادا کرتا ہے، تو یہ گویا اس بات کو تسلیم کرنا ہے کہ وہ اس حکومت کے تابع ہے ،اور اس کے قانون کا پابند ہے، اس کا مقصد تحقیر وتذلیل نہیں، یہی وجہ ہے کہ جب قبیلہ بنوتغلب کے لوگوں نے حضرت عمرؓ کے عہد میں جزیہ کے نام سے ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم دوگنی شرح کے ساتھ زکاۃ ادا کریں گے تو حضرت عمرؓ نے اس کو قبول فرمالیا۔

غرض کہ جزیہ حکومت کی طرف سے عائد کیا جانے والا ایک ٹیکس ہے، جس کا مقصد ملک کی انتظامی اور دفاعی ضرورتوں کو پوری کرنا ہے، یہ غیر مسلموں کے حق میں زکاۃ کا متبادل ہے؛ کیوں کہ اگر ان سے زکاۃ وصول کی جاتی تو یہ انہیں ایک اسلامی عمل پر مجبور کرنے کے مترادف ہوتا، جو مذہبی آزادی کے مغائر تھا، اس کا مقصد تحقیر وتذلیل نہیں ہے، اور اس کی مقدار نہایت قلیل اور آخری حد تک قابل برداشت رکھی گئی ہے، نیز اگر اِس وقت طالبان نے واقعی سکھوں پر جزیہ عائد کیا ہو، تو یہ یقینا شرعی تعلیمات کے خلاف عمل ہے، اور بالواسطہ اسلام کو بدنام کرنے کی بدترین سازش ہے!

۱۵/ مئی ۲۰۰۹ء

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

سود کی لعنت اور اس کا علاج

ابھی چند روز پہلے حیدرآباد میں ایک ایسا دلدوز واقعہ پیش آیا، جس نے ان تمام لوگوں کو لرزا کر رکھ دیا ہوگا، جن کے دلوں میں انسانیت کی معمولی سی چنگاری بھی رہی ہو، ایک غریب مسلمان شخص نے ایک ظالم صفت مسلمان شمار کئے جانے والے شخص سے اپنی شدید مجبوری اور ضرورت کے تحت سود پر قرض حاصل کیا، سود بھی اتنا کہ روپیہ پر چالیس پیسے اور یومیہ ادائیگی کی قسطیں طئے پائیں، وہ غریب قرض ادا کر رہا تھا؛ لیکن اپنی پریشانی اور تنگ دستی کی وجہ سے چند دن قرض ادا نہیں کر پایا، یہاں تک کہ سود کی وجہ سے اصل رقم سے کئی گنا قرض کی رقم ہوگئی؛ کیوں کہ بعض سود خوار ایک دن کی تاخیر پر مطلوبہ رقم کو دوگنا کر دیتے ہیں، سود خوار کا بار بار اس کے گھر پہونچنا اور اس کو بے آبرو کرنا تمام اخلاقی حدوں کو پار کرتے ہوئے یہاں تک پہونچ گیا کہ غالباً اس غریب کی لڑکی اغوا کر لی گئی، پھر اس کے ساتھ کیا زیادتی کی گئی؟ یہ تو اللہ کو معلوم؛ لیکن اسے چار مینار کی بلندی سے نیچے دھکیل دیا گیا اور آخر وہ زخموں سے جانبر نہیں ہوسکی، کچھ لوگوں نے بجا طور پر مطالبہ کیا ہے کہ اس شخص کو پھانسی پر لٹکا دینا چاہئے؛ کیوں کہ جب تک ایسے مجرموں کو کیفر کردار تک نہ پہونچایا جائے اور عبرت ناک سزا نہیں دی جائے، ایسے جرائم کی روک تھام نہیں ہوسکتی، مگر پھانسی کے پھندے پر چڑھانا ظاہر ہے کہ حکومت اور عدالت کے دائرۂ اختیار میں ہے اور لوگوں نے قانون سے بچنے کے اتنے چور دروازے بنا لئے ہیں کہ اکثر اوقات سیاسی اثر ورسوخ کے حامل اور دولت وثروت سے سرفراز مجرموں پر کوئی کارروائی نہیں ہو پاتی اور ان کی طاقت کے آگے انصاف کو شکست اٹھانی پڑتی ہے؛ البتہ سماج کو چاہئے کہ ایسے لوگوں کا بائیکاٹ کرے اور اسے محسوس کرائے کہ اس کی ذلیل اور نازیبا حرکت ناقابل قبول ہے اور پورا سماج اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، یہ سزا سماج خود دے سکتا ہے اور یہ پھانسی سے کچھ کم درجہ کی سزا نہیں ہے۔

اسلام نے اسی لئے سود کو نہایت مذموم، حد درجہ ناپسندیدہ گناہ اور ظالمانہ فعل قرار دیا ہے، قرآن مجید میں چار چار آیتوں میں سود کی مذمت اور ممانعت ہے، ارشاد فرمایا گیا کہ سود خوار قیامت کے دن اس طرح اٹھیں گے کہ گویا وہ آسیب زدہ ہیں، (البقرۃ:۲۷۵) یہ بھی فرمایا گیا کہ اگر سود چھوڑنے کو تیار نہ ہو تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ، (البقرۃ:۲۷۸) یہودی سود خواری میں پیش پیش تھے، ان کی اس بری حرکت کا خاص طور پر ذکر فرمایا گیا، (النساء:۶۰) یہ بھی ارشاد ہوا کہ سود کا لین دین مال میں اضافہ کے لئے کرتے ہو؛ لیکن اللہ کے نزدیک اس سے مال میں حقیقی اضافہ نہیں ہوگا اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے جذبہ سے جو زکوۃ ادا کرتے ہیں، اس میں اللہ کی طرف سے برکت ہوگی اور کئی چند اضافہ ہوگا، (الروم:۳۹)۔

رسول اللہ ﷺ نے سود کی اس درجہ مذمت فرمائی ہے کہ کم گناہ ہوں گے جن کی اس درجہ مذمت کی گئی ہوگی، اور اس کا کم تر درجہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرے، (مستدرک حاکم: ۲/۳۷، علی شرط الشیخین) حضرت عبداللہ بن حنظلہ ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سود کے ایک درہم کو چھتیس زنا سے بڑھ کر قرار دیا ہے، (الترغیب والترھیب: ۳/۷) عوف بن مالک ؓ راوی ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان گناہوں سے خوب بچو، جو بخشے نہیں جائیں گے، پھر یہ بھی ارشاد فرمایا کہ سود کھانے والا قیامت کے دن مخبوط الحواس مجنون کی صورت میں اٹھایا جائے گا ، (مجمع الزوائد: ۴/۱۱۰)۔

ایک موقع پر آپ ﷺ نے سات مہلک چیزوں کا ذکر کیا، اور ان امور کو گناتے ہوئے پانچویں نمبر پر سود کھانے کا ذکر فرمایا، (بخاری، حدیث نمبر: ۲۷۶۶) اسلام کی نگاہ میں سود کی شناعت کا یہ حال ہے کہ آپ ﷺ نے نہ صرف سود لینے کو بلکہ سودی کاروبار میں ہر طرح کے تعاون کو بھی باعثِ لعنت قرار دیا ، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ’’اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو سود لینے والے، سود دینے والے، سودی معاملہ میں گواہ بننے والے اور سودی کاروبار کو لکھنے والوں پر‘‘
>
> (دیکھئے: الترغیب والترھیب: ۳/۵)

اور بعض روایتوں میں ہے کہ وہ سب برابر ہیں، (مسلم عن جابر ؓ، حدیث نمبر: ۱۵۹۸) حضرت

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی مروی ہے کہ جس قوم میں زنا اور سود عام ہوجائے اس نے اپنے آپ کو عذابِ الٰہی کا مستحق بنالیا:

"ما ظهر في قوم الزنا والربوا إلا أحلوا بأنفسهم عذاب الله"

(مستدرک حاکم : ٢/٣٧، الترغیب والترهیب : ٣/٨)

اور اس دَور میں سودخوری کی جو کثرت ہے وہ اس پیشین گوئی کی عملی تصدیق ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے قریب سود، زنا اور شراب کی کثرت ہوجائے گی۔

(الترغیب والترهیب: ٣/٩)

اسلام کی نظر میں سود کی جو شناعت ہے، اس کے تحت آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع سے مجمع عام میں اس کی حرمت کا اعلان فرمایا، آپ ﷺ نے فرمایا: زمانۂ جاہلیت میں جو سود کا رواج تھا، اسے میں اپنے قدموں کے نیچے دفن کرجاتا ہوں اور سب سے پہلے اپنے چچا عباس ابن مطلب رضی اللہ عنہ کے سود کو کالعدم قرار دیتا ہوں، (مسلم، حدیث نمبر: ١٢١٨، عن جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ) سود کے سلسلہ میں شریعتِ اسلامی میں جو سخت رویہ اختیار کیا گیا ہے، اس پس منظر میں سلفِ صالحین نے ہمیشہ اس میں احتیاطی پہلو کو اختیار کیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ تلقین فرمایا کرتے تھے کہ سود سے بھی بچو اور شبہ سود سے بھی، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اگر اسلامی حکومت میں کوئی شخص سودی کاروبار میں ملوث ہو تو امام المسلمین کی ذمہ داری ہے کہ اس سے تائب ہونے کا تقاضہ کرے اور اگر وہ تائب نہیں ہو تو اس کی گردن اڑادے:

"حق على إمام المسلمين أن يستتيبه فإن رجع وإلا ضرب عنقه"

(شرح الترغیب والترهیب : ٣/١٥)

سود کی حقیقت کیا ہے؟ اس کو خود رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمادیا ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: دینار کا دینار سے اس طرح تبادلہ ہونا چاہئے کہ کسی طرف سے کمی بیشی نہیں ہو، درہم کا درہم سے تبادلہ اس طرح ہونا چاہئے کہ کمی بیشی نہ ہو: **"الدينار بالدينار لا فضل بينهما الخ"** (مسلم، حدیث نمبر: ١٥٨٨) کیوں کہ اس تبادلہ میں کمی بیشی ہو تو سود ہے، دینار سونے کا سکہ تھا اور درہم چاندی کا، موجودہ دور میں کاغذی نوٹ سونے سے مربوط ہیں؛ اس لئے جو حکم

دینار کے دینار اور درہم کے درہم سے تبادلہ کا ہے، موجودہ دور میں روپیہ یا کسی ملک کی کرنسی کا اسی ملک کی کرنسی سے تبادلہ ہو، اس کا بھی یہی حکم ہوگا، اگر کسی شخص کو روپے دئے جائیں اور اس سے زیادہ روپے وصول کئے جائیں یا کسی مالی ادارہ میں روپیہ جمع کیا جائے اور جمع کردہ رقم سے زیادہ رقم وصول کی جائے تو یہ بھی یقینا سود ہی کی ایک صورت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شریعت کا خطاب پوری دنیا کے مسلمانوں سے ہے؛ اس لئے جو بھی حلال وحرام کے احکام ہیں، اگر قوی دلیل کے ذریعہ ان میں استثناء ثابت نہ ہو تو وہ حکم پوری دنیا کے مسلمانوں سے متعلق ہوگا، خواہ وہ کسی مسلمان ملک میں رہتا ہو، یا ایسے ملک میں جس میں زمام اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں ہو؛ چنانچہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور اکثر فقہاء ومحدثین کی رائے یہی ہے کہ سود جیسے دار الاسلام میں حرام ہے، اسی طرح دار الکفر میں بھی، (المدونۃ الکبری: ۳/۲۷۹، شرح المہذب: ۱/۳۹۱، المغنی: ۴/۴۷)؛ البتہ اما ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دار الحرب میں حربی کو قرض دے کر زائد رقم لینا جائز ہے۔

مگر یہ بات قابل غور ہے کہ کیا ہندوستان دار الحرب ہے؟ امام ابوحنیفہؒ نے کسی ملک کے دار الحرب بننے کے لئے تین شرطیں لگائی ہیں: اول یہ ہے کہ وہاں احکامِ کفر جاری ہوں، دوسرے: اس علاقہ کا اتصال دار الکفر سے ہو، کسی اسلامی ملک سے نہ ہو، تیسرے: مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں مسلمانوں کو جو امان یعنی شہریت حاصل تھی، وہ سابقہ استحقاق کی بنیاد پر باقی نہیں رہے، (بدائع الصنائع: ۶/۱۱۲) اب غور کیجئے تو ہندوستان کا اتصال پاکستان، بنگلہ دیش اور بحری اعتبار سے مالدیپ جیسے ملکوں سے ہے، جو مسلمان ممالک ہیں، دوسرے: اس ملک میں مسلمانوں کو مسلم عہدِ حکومت سے جو شہریت حاصل تھی، تسلسل کے ساتھ وہی شہریت باقی ہے، اور انگریزوں کے آنے یا انڈین یونین بننے کی وجہ سے ازسرنو ان کو شہریت حاصل نہیں کرنی پڑی، تو دوسری اور تیسری شرط تو یقینی طور پر موجود نہیں ہے، اور جہاں تک احکامِ کفر جاری ہونے کی بات ہے، تو یہاں جو احکام جاری ہوتے ہیں، وہ تمام گروہوں کی نمائندگی کرتے ہیں، خود ہندوستان میں مسلمانوں کے حق میں نکاح وطلاق، میراث اور دوسرے عائلی مسائل میں شریعتِ اسلامی پر عمل کیا جاتا ہے؛ حالاں کہ ہندو اکثریت پر ہندو عائلی قانون نافذ نہیں ہے؛ اس لئے یہ بات بھی محل غور ہے کہ کیا ہندوستان میں اہل کفر کا قانون بمقابلہ

مسلمانوں کے غالب ہے؟

علامہ شامیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کسی علاقہ میں مسلمانوں کے قوانین بھی چلتے ہوں اور اہل شرک کے قوانین بھی تو اسے دارالحرب نہیں سمجھا جائے گا:

''لو أجریت أحکام المسلمین و أحکام أهل الشرک لا تکون دار حرب'' (رد المحتار : ۲۸۸/۶)

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان دارالحرب نہیں ہے؛ کیوں کہ یہاں مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے احکام جاری ہیں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ دارالحرب میں سود لینے کی اجازت اس ملک میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے نہیں ہے؛ بلکہ ان مسلمانوں کے لئے ہے جو کسی مسلمان ملک کے باشندے ہوں اور ویزا لے کر وقتی طور پر دارالحرب میں آئے ہوئے ہوں، مختلف فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے اور علامہ شہاب الدین چلپیؒ نے بہت وضاحت سے اس کو اس طرح بیان کیا ہے:

''جو مسلمان دارالحرب میں امان (ویزا) لے کر داخل ہو، دو درہم کے بدلے ایک درہم فروخت کرے یا شراب یا خنزیر یا مردار فروخت کرے یا ان کے ساتھ جوا کھیلے اور مال لے لے، تو حلال ہے''

(حاشیه شهاب الدین چلپی علی تبیین الحقائق : ۹۷/۴)

گویا اگر ہندوستان کو دار الحرب مان بھی لیا جائے تو یہ اجازت ہندوستان کے مسلمان باشندوں کے لئے نہیں ہے۔

یہ تو ایک پہلو ہے، دوسرا پہلو خود سودی قرض حاصل کرنے والوں سے متعلق ہے — جیسا کہ ذکر کیا گیا — جیسے سود کا لینا حرام ہے، اسی طرح سودی قرض حاصل کرنا اور اس پر سود ادا کرنا بھی حرام ہے، رسول اللہ ﷺ نے دونوں پر لعنت فرمائی ہے، اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ سود لینے اور دینے والا دونوں برابر ہے: ''۔۔۔ **الآخذ و المعطی فیه سواء**'' (**صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب الصرف و بیع الذهب بالورق نقدا**، حدیث نمبر: ۱۵۸۴)؛ کیوں کہ اگر سود لینے والے افراد کسی سماج میں نہ ہوں، تو سود خواروں کا کاروبار خود بخود بند ہو جائے گا؛ اس

لئے مسلمانوں میں یہ شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ آخری حد تک اپنے آپ کو سود سے بچائیں، شادی کی فضولیات کے لئے، عید کے کپڑوں کے لئے، دعوتوں اور سماجی تقریبات کے لئے اور اس طرح کی دوسری چیزوں کے لئے سود پر قرض حاصل کرنا قطعاً حرام ہے؛ اس لئے اپنے آپ کو فضول خرچی سے بچائیں، اس وقت ہمارے سماج میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی جو کوشش ہو رہی ہے، اس سے ہمیں اپنے آپ کو دور رکھنا ہے، پریشانیوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کریں اور محبت اور جفاکشی کے ذریعہ اپنی ضرورت پوری کریں؛ لیکن سودخواروں کے دروازوں پر نہ پہونچیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کی دنیا میں کسبِ معاش کے مواقع بہت بڑھ گئے ہیں، ہر شعبۂ زندگی میں افرادی وسائل کی ضرورت ہے اور بہت سے ایسے فنی کام ہیں، جن کو سیکھنے کے لئے تعلیم کی بھی ضرورت نہیں، اسی طرح بہت سے ایسے کام ہیں، جن کو غیر تعلیم یافتہ خواتین بھی معمولی تربیت کے ذریعہ انجام دے سکتی ہیں، اگر لوگوں میں محنت اور جفاکشی کا مزاج پیدا ہو جائے، ہر طرح کے جائز کام انجام دینے کے لئے لوگ تیار ہوں، آمدنی کی ایک خاص مقدار اور زندگی کے لئے ایک خاص معیار پہلے سے اپنے ذہن میں نہیں رکھیں اور اپنے پیشہ کے ساتھ پوری وفاداری برتیں اور دیانت، امانت اور وعدہ کی پابندی کے ساتھ خدمت انجام دیں تو کسی کے بے روزگار رہنے کی نوبت نہیں آئے گی؛ اس لئے ضرورت ہے کہ ہم معاشرہ میں محنت، جفاکشی، صبر وقناعت، آمد وخرچ میں تنظیم کا مزاج پیدا کریں اور رفاہی تنظیمیں سلم آبادیوں میں ایسے ووکیشنل کورسز کا انتظام کریں، جن کے ذریعہ ناخواندہ یا کم تعلیم یافتہ مرد وخواتین باعزت روزگار حاصل کر سکیں۔

سودخوار فائنانسروں کی طرف سے جو زیادتیاں ہوتی ہیں، ان کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ ہمارے سماج میں غیر سودی قرض دینے والے ادارے مفقود ہیں اور متمول افراد بھی اپنے بھائی کو قرض دینا نہیں چاہتے، اس صورت حال کو بدلنا ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رزق کی تقسیم میں اپنے بندوں کے درمیان فرق کیا ہے، اور یکسانیت نہیں برتی ہے، یہی نابرابری ہے جس سے کائنات کا نظام جاری وساری ہے، اگر یہ نابرابری نہ ہوتی تو نہ کوئی شخص دوسرے کے یہاں ملازمت کا محتاج ہوتا، اور نہ کسی سرمایہ دار کو کوئی مزدور اور کارکن ہاتھ آتا، یہی احتیاج اور ضرورت

بعض اوقات انسان کو قرض کے لین دین پر مجبور کرتی ہے، اگر جائز طریقہ پر اہلِ ثروت اپنے غریب بھائیوں کو قرض دیدیں تو خود بخود سود کا راستہ بند ہو جائے، افسوس کہ ایک تو مسلمانوں میں یہ برادرانہ اسپرٹ باقی نہیں رہی کہ وہ اپنے زائد از ضرورت مال میں دوسرے غریب بھائیوں کا حق محسوس کریں اور ان کو غیر سودی قرضے فراہم کریں، اور نہ لوگ قرض کے احکام ومسائل اور فضائل و اجر ہی سے واقف ہیں۔

قرض کے لین دین کا ثبوت قرآن سے بھی ہے، حدیث سے بھی، اور اس پر اجماع واتفاق ہے اور مصلحت کا تقاضا بھی ہے، قرآن نے اللہ کے راستہ میں انفاق کو ''قرض حسن'' قرار دیا ہے، (البقرۃ: ۲۴۵) اس میں قرض کے جائز بلکہ مستحب اور مطلوب ہونے کی طرف واضح اشارہ ہے، ایک جگہ ''دَین'' کے ساتھ مدت لکھنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، (البقرۃ: ۲۲۸) دَین کا لفظ عام ہے اور قرض بھی اس کے دائرہ میں آتا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود ﷛ ارشادِ نبوی نقل کرتے ہیں کہ کسی مسلمان کو دو بار قرض دینا ایک بار صدقہ کرنے کے برابر ہے، (سنن بیہقی: ۵ / ۳۵۳، ابن ماجہ: ۲ / ۶۰ مع تحقیق: الاعظمی، وفیہ سلیمان وہو متروک) اور بھی متعدد روایتیں ہیں جن میں قرض دینے کی فضیلت وارد ہے؛ اسی لیے اس کے جائز ہونے پر امت کا اجماع ہے، (المغنی: ۴ / ۲۰۷) پھر قرض ایک ایسی مصلحت ہے کہ بہت سے مواقع پر اس سے مفر نہیں ہوتا، اس لیے اگر اس کی گنجائش نہ رکھی جائے تو تنگی اور دشواری کا باعث ہوگا، اور نا قابلِ برداشت حرج وتنگی کو دور کرنا شریعت کا ایک اہم ترین مقصد ہے، ارشادِ ربانی ہے: {مَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیَجْعَلَ عَلَیْکُمْ مِنْ حَرَجٍ} (المائدہ: ۶) نیز فرمایا گیا کہ اللہ تم پر آسانی چاہتے ہیں نہ کہ دشواری: {یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَ لاَ یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ} (البقرۃ: ۱۸۵)۔

قرض لینا گو مباح ہے؛ لیکن قرض دینا مستحب ہے؛ کیوں کہ یہ نیکی اور بھلائی میں تعاون ہے، (الشرح الصغیر: ۳ / ۲۹۲) حضرت عبداللہ بن مسعود ﷛ سے قرض دینے کی فضیلت اوپر مذکور ہو چکی ہے، حضرت انس ﷛ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''میں نے جنت کے دروازہ پر شب اسراء میں لکھا ہوا دیکھا کہ صدقہ کا ثواب دس گنا ہے اور قرض کا اٹھارہ گنا، میں نے حضرت جبریل ﷤

سے استفسار کیا کہ قرض صدقہ سے افضل کیوں ہے؟ حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا کہ وسائل رہنے کے باوجود دست سوال دراز کرتا ہے (اور اس پر صدقہ کیا جاتا ہے)، اور قرض کا خواستگار ضرورت ہی پر طلب گار قرض ہوتا ہے'' (ابن ماجہ: ۲/۵۶، حدیث نمبر: ۲۴۳۳۱
(

نیز حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

''یہ بات کہ میں دو دینار قرض دوں پھر وہ واپس آ جائیں اور میں ان کو کسی اور کو قرض دے دوں، مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں ان کو صدقہ کر دوں'' (المغنی: ۴/۲۰۷
(

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں آپ سے منقول ہے کہ کسی چیز کو قرض دینا اس کے صدقہ کرنے سے بہتر ہے، ''قرض الشئ خیر من صدقتہ'' (سنن بیہقی: ۵/۳۵۴)

ان روایات سے نہ صرف قرض کی فضیلت اور اس کا استحباب ظاہر ہوتا ہے؛ بلکہ مواقع و احوال کے لحاظ سے قرض کا بعض اوقات صدقہ سے بھی زیادہ باعثِ ثواب ہونا معلوم ہوتا ہے، اگر محتاج کی حاجت مندی کا یقین کر کے اسے دیا جائے تو ظاہر ہے کہ صدقہ افضل ہے؛ لیکن اگر یقینی طور پر اس کا علم نہیں تو قرض کی فضیلت زیادہ ہے؛ اس لیے کہ جو لوگ خوددار طبیعت کے مالک ہوں، وہ مجبوراً ہی قرض کے طالب ہوتے ہیں، قرض کے مستحب ہونے کا حکم ظاہر ہے اس وقت ہے جب قرض دہندہ کے علم یا اندازہ کے مطابق قرض کسی جائز ضرورت کے لیے لیا جا رہا ہو، اگر کسی مکروہ یا حرام و معصیت کے ارتکاب کے لیے قرض لے تو دانستہ اس مقصد کے لیے قرض دینا درست نہیں، مکروہ میں تعاون بھی مکروہ اور حرام کا تعاون بھی حرام ہے؛ کیوں کہ جو حکم مقصد کا ہوتا ہے، وہی حکم ''ذریعہ'' کا بھی ہوتا ہے۔

قرض لینا مباح ہے، (المغنی: ۴/۲۰۷) خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرض لینا ثابت ہے؛ البتہ یہ ضروری ہے کہ جائز مقصد کے لیے قرض لیا جائے، ابن ماجہ میں روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ قرض لینے

والے کے ساتھ ہوتا ہے، جب تک وہ ادا نہ کرلے، سوائے اس کے کہ کسی ایسے مقصد کے لیے دین حاصل کرے، جو اللہ کو ناپسند ہو (ابن ماجہ: ۲/۵۶، حدیث نمبر: ۲۴۳۳) یا اس ارادہ سے قرض کرلے کہ ادا نہیں کرنا ہے، یہ بھی گناہ کی بات ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے یہاں چور شمار کیا جائے گا، (حوالۂ سابق، حدیث نمبر: ۲۴۳۴) ایک اور روایت میں ہے کہ محض دوسروں کا پیسہ ڈوبانے کے لیے قرض کرلے تو اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کردیں گے، (حوالہ سابق، حدیث نمبر: ۲۴۳۶) حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا راوی ہیں کہ جو شخص اس ارادہ سے دَین لے کہ اسے ادا کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کا دین ادا کرادیں گے، (حوالہ سابق، حدیث نمبر: ۲۴۳۲) ---غرض شدید ضرورت کے بغیر اور غیر شرعی ضرورت کے لیے، نیز عدم ادائیگی کی نیت سے قرض لینا گناہ ہے، جائز مقصد کے لیے، ضرورت کی وجہ سے اور حسبِ وعدہ ادا کرنے کی نیت سے قرض لینا مباح اور جائز ہے۔

اگر مقروض تنگدستی میں مبتلا ہو، تو اس کو مزید مہلت دینی چاہیے اور ممکن ہو تو کچھ معاف بھی کردینا چاہیے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''جو اللہ کے سایہ میں رہنا چاہتا ہے، اسے چاہیے کہ تنگدست شخص کو مہلت دے، یا اس کا کچھ حصہ معاف کردے'' (حوالہ سابق، حدیث نمبر: ۲۴۴۴
>)

پھر آپ ﷺ نے یہ بھی ہدایت فرمائی کہ قرض کی ادائیگی کا مطالبہ مناسب طریقے پر کرنا چاہیے (حوالہ سابق، باب حسن المطالبة)
۔

جہاں ایک طرف آپ ﷺ نے قرض دہندہ کو حسنِ سلوک کی ہدایت دی ہے، وہیں مقروض کو بھی تلقین فرمائی کہ وہ قرض خواہ کے ساتھ زیادتی نہ کرے اور بہتر معاملہ رکھے، باوجود استطاعت کے قرض کی ادائیگی میں کوتاہی اور ٹال مٹول کو آپ ﷺ نے بہت ناپسند فرمایا ہے، اور فرمایا کہ یہ چیز اس کی بے عزتی اور سزا کا جواز پیدا کردیتی ہے، ''لي الواجد يحل عرضه و عقوبته'' (ابن ماجہ: ۲/۶۰، حدیث نمبر: ۲۴۵۲) یہاں تک کہ آپ ﷺ نے متوفی کے مال میں سے پہلے اس کا دَین ادا کرنے کا حکم فرمایا، (ابن ماجہ: ۲/۶۰، حدیث نمبر: ۲۴۵۸) یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو دَین کی ادائیگی میں بہتر ہے، (ابن ماجہ: ۲/۶۰، حدیث نمبر: ۲۴۴۸) ایک حدیث میں وارد ہے کہ مومن کی

روح اس کے دَین کے ساتھ معلق رہتی ہے؛ تا آں کہ اس کی طرف سے ادا کر دیا جائے، (ابن ماجہ: ۲/ ۶۰، حدیث نمبر: ۲۴۳۷)، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ جس کا انتقال ہو اس پر ایک دینار یا درہم بھی باقی ہو تو اسے اس کی نیکیوں میں سے وصول کیا جائے گا۔ (ابن ماجہ: ۲/ ۶۰، حدیث نمبر: ۲۴۳۹)

قرض دہندہ کو قرض پر نفع حاصل کرنا اور شرط لگانا کہ مقروض اسے اضافہ کے ساتھ واپس کرے، حرام ہے اور سود میں داخل ہے؛ کیوں کہ آپ انے قرض پر نفع حاصل کرنے سے منع فرمایا اور بعض روایتوں میں اسے سود قرار دیا گیا: ''**کل قرض جر منفعة فهو ربا**'' (دیکھئے: **تلخیص الحبیر**: ۳/ ۳۴) اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے، مقدار میں اضافہ تو حرام ہے ہی، کیفیت میں عمدگی کی شرط لگانا بھی جائز نہیں، مثلاً معمولی چیز دی اور شرط لگائی کہ اس کے بدلے بہتر چیز واپس کرے، یہ بھی درست نہیں (ہندیہ: ۳/ ۲۰۲)، اگر قرض دہندہ نے شرط تو نہ لگائی؛ لیکن مقروض نے بہ طور خود عمدہ چیز واپس کی یا زیادہ مقدار کے ساتھ واپس کی تو ایسا کرنا جائز ہے، آج کل بعض ادارے قرض جاری کرتے ہیں اور قرض کے تناسب سے مقروض سے ماہانہ فیس رکنیت وصول کرتے ہیں، یہ صورت بھی جائز نہیں اور یہ بھی سود کے دائرہ میں آتا ہے، ایسے قرض کو غیر سودی قرض کہنا محض دھوکہ ہے۔

فقہاء نے نہ صرف یہ کہ قرض پر اضافہ کو ناجائز قرار دیا اور اس کو نفع اٹھانے کا ذریعہ بنانے سے منع فرمایا ہے؛ بلکہ بالواسطہ طریقہ پر قرض سے نفع حاصل کرنے کا راستہ بھی بند کر دیا، مثلاً مقروض قرض دہندہ سے کوئی معمولی چیز گراں قیمت میں خریدے، یہ بھی مکروہ ہے، (**الدر المختار علی هامش الرد**: ۴/ ۱۹۵) اسی طرح یہ صورت بھی مکروہ ہے کہ مثلاً کوئی شخص قرض لینے کے لیے آئے تو قرض دہندہ ساٹھ روپیہ تو اسے قرض کے دیدے اور بیس روپیہ کی چیز اسے چالیس روپیہ میں فروخت کر دے؛ تاکہ مقروض کے یہاں اس کے سو روپے ہو جائیں؛ حالانکہ مقروض کو اس سے اسّی روپیہ ہی حاصل ہوگا ۔ (**ردالمحتار**: ۴/ ۱۹۵)

سود خوار کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور سود کے چور دروازوں کو بند کرنے کی غرض سے آپ ﷺ نے مقروض کی طرف سے تحائف کے قبول کرنے میں بھی احتیاط برتنے کا حکم دیا ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کا ارشاد مروی ہے کہ

’’جب کوئی قرض دے اور مقروض کوئی تحفہ دے یا اپنی سواری پر بیٹھائے تو
اسے قبول نہ کرنا چاہیے، سوائے اس کے کہ پہلے سے ان کے درمیان باہم
تحائف کا لین دین رہا ہو‘‘ (ابن ماجہ: ۲/ ۸۱۳)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ جہاد کی غرض سے عراق کی طرف سے جار ہے تھے تو زر بن حبیش نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ ایسی جگہ جار ہے ہیں، جہاں سود کا عام رواج ہے؛ اس لیے آپ کسی کو قرض دیں اور آپ کو قرض کے ساتھ کچھ تحفہ بھی دے تو اس کا تحفہ قبول نہ کریں۔

اسی بناء پر فقہاء نے بھی مقروض کے ہدایا و تحائف اور دعوتوں میں احتیاط کا حکم دیا ہے، حنفیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جو لوگ پہلے سے دعوت نہ دیتے رہے ہوں یا ہدایا و تحائف کا معمول نہ رہا ہو تو ایسی دعوت و تحفوں کا قبول کرنا جائز نہیں، ہاں، معاملہ قرض سے پہلے سے اس طرح کا معمول رہا ہو تو اب جائز ہے، (ہندیہ: ۳/ ۲۰۳) قریب قریب

موجودہ حالات میں پس ماندہ مسلمانوں کو اونچا اٹھانے ، سودی قرض کی لعنت سے انہیں بچانے اور روزگار کے اعتبار سے خود مکتفی بنانے کے لئے ضروری ہے کہ غیر سودی قرض فراہم کرنے والی انجمنیں قائم ہوں، یہ ہر محلہ اور گاؤں کی سطح پر ہوں اور چھوٹے قرضے کمزور طبقہ کو فراہم کریں اور چھوٹی چھوٹی قسطوں میں اسے وصول کریں، یہ اپنے انتظامی اخراجات کے لئے ان ہی مقروضوں سے سروس چارج لے سکتی ہیں، نیز مسلمان سرمایہ دار اپنے محفوظ اور فاضل سرمایہ کا ایک حصہ ایک مقررہ مدت کے لئے ایسے اداروں کو حوالہ کردیں، جائز مقاصد اور ضروری کاموں ہی کے لئے قرضے جاری کئے جائیں، جب تک ہم اس طرح کے ادارے قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوں گے، سماج سے ایسے مظالم کا سد باب نہ ہو سکے گا، مسلمان مذہبی تنظیموں اور اداروں کو ترجیحی طور پر اس کام کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے، اس کے بغیر محض اخباری بیانات، تقریروں اور فتوں سے ظالم سود خواروں کی ستم انگیزیوں کا سد باب نہیں ہو سکے گا۔

۱۹، ۲۶/ جون ۲۰۰۹ء

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

آج بھی ہو جو براہیم سا ایمان پیدا۔۔۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی فطرت کچھ اس طرح رکھی ہے کہ یہاں اکثر اوقات چیزیں فناء کے راستہ کے گزر کر بقاودوام کی منزل تک پہنچتی ہیں، اور اپنے آپ کو مٹا کر زندگی کے ایک نئے پیکر سے سرفراز ہوتی ہیں، سورج ڈوبتا ہے؛ لیکن اس ڈوبنے میں صبح نو کی آمد چھپی رہتی ہے، چاند اپنا منہ چھپاتا ہے؛ لیکن اس لئے کہ کچھ گھنٹوں کے وقفہ کے بعد نئی آب وتاب کے ساتھ افق پر طلوع ہو اور پھر بدر کامل بن کر لوگوں سے خراج تحسین وصول کرے، کسان جس بیج کو زمین میں ڈالتا ہے، وہ بہ ظاہر اپنے وجود کو کھودیتی ہے؛ لیکن اسی سے لہلہاتے ہوئے پودے وجود میں آتے ہیں، باغبان بہ ظاہر گٹھلیوں کو زمین کی اتھاہ تاریکیوں میں دفن کرتا ہے؛ لیکن یہی عمل آسمان کو چھوتے ہوئے درختوں کے لئے بنیاد بنتے ہیں، جن کے خوش ذائقہ پھلوں اور خوش رنگ پھولوں سے انسان اپنے کام ودہن اور نگاہ شوق کی تسکین کرتا ہے۔

یہی نظام اللہ تعالیٰ نے عالم انسانیت کا بھی رکھا ہے، جو شخص اپنے آپ کو جتنا مٹاتا ہے وہ اسی قدر سربلندی سے نوازا جاتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ”**من تواضع لله رفعه الله فهو في نفسه صغير وفي أعين الناس عظيم۔۔۔**“ (شعب الإيمان للبيهقي، فصل في التواضع وترك الزهو والصلف والخليلاء والفخر والمدح، حدیث نمبر: ۸۱۴۰)
>
> ”جو شخص اللہ کے لئے جھکتا ہے اور پستی کو قبول کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو سربلند فرماتا ہے، وہ خود اپنی نظر میں حقیر ہوتا ہے اور لوگوں کی نظر میں عظیم“

انسانیت میں سب سے بڑھ کر خدا ترسی اور خدا کی خوشنودی کے لئے اپنے آپ کو قربان

کر دینے والا گروہ انبیاء علیہم السلام کا ہے، اللہ کے پیغمبر علم، ذہانت، شخصی وجاہت، جسمانی حسن وجمال، اخلاقی کمالات، خاندانی عزت وشرف ہر جہت سے سب سے زیادہ مکمل ہوا کرتے تھے؛ لیکن اللہ کے راستہ میں ہر طرح کی آزمائش اور ابتلاء سے بھی انہیں کو گزرنا پڑتا تھا، وہ نہ صرف لوگوں کی بے احترامی کا زخم سہتے تھے؛ بلکہ ان کی زبان درازی اور سب وشتم کو بھی برداشت کرتے تھے؛ یہاں تک کہ جسمانی ایذاء رسانی سے بھی دوچار ہوتے تھے؛ لیکن یہ ساری چیزیں مل کر بھی ان کے پائے استقامت میں کوئی تزلزل پیدا نہیں کرتی تھی، مخالفتوں اور زیادتیوں کے اس طوفان میں انہیں اللہ تعالیٰ مینار کا منارہ بنادیتا تھا، اور ایسی سربلندی سے نوازتا تھا کہ نہ صرف اس عہد کے لوگ ان کے سامنے سر تسلیم خم کرتے تھے؛ بلکہ رہتی دنیا تک کے لئے ان کا نام نقش جاوداں ہوجاتا تھا۔

جن پیغمبروں کو بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا اور قرآن ان کی داستان حیات کو قیامت تک آنے والی انسانیت کے لئے مشعل راہ بنا محفوظ کر دیا، ان میں ایک حضرت ابراہیم ل کی ذات والا صفات ہے، وہ عراق کے ایک معزز قبیلہ کے فرزند تھے، جو اپنی ذاتی صلاحیت کے اعتبار سے بھی نمایاں حیثیت کے حامل تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے توحید اور شرک پر جو مباحثے فرمائے اس سے ان کی غیر معمولی ذکاوت، استدلالی قوت، فہم رسا، اور قوت تفہیم ظاہر ہوتی ہے، پھر ان کی گفتگو میں جو نرمی، ملائمت، ناصحانہ اسلوب، اور داعیانہ تڑپ پائی جاتی ہے، اس سے ان کی بلند اخلاقی اور نرم خوئی، نیز انسانی ہمدردی کا بے پناہ جذبہ ظاہر ہوتا ہے، ان تمام خوبیوں کے باوجود جب وہ حق کی دعوت لے کر اٹھے تو ایسا نہیں ہوا کہ ان کا استقبال کیا گیا ہو، ان کے لئے پھولوں کی سیج بچھائی گئی ہو اور قوم نے ان کا شکریہ ادا کیا ہو کہ وہ انہیں گمراہی کے گھٹاٹوپ اندھیروں سے ہدایت کی روشنی کی طرف لے جارہے ہیں؛ بلکہ انہیں ایسی آزمائشوں سے گزرنا پڑا کہ انسانی تاریخ میں کم اس کی مثال ملے گی اور انہوں نے اتنی قربانیاں پیش کیں کہ اس سے بڑھ کر خدا کے راستہ میں جاں نثاری اور فداکاری کا تصور نہیں کیا جاسکتا، انہیں آتش؛ بلکہ آتش فشاں میں ڈالا گیا، یہ ایسی آگ تھی جو پتھر کو بھی خاکستر بنانے کے لئے کافی تھی، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مرضئ ربانی کے سامنے تسلیم ورضا کا حال یہ تھا کہ انہوں نے اُف بھی نہیں کیا اور خدا سے بھی اس آزمائش سے نجات

کے لئے فریاد نہیں کی، یہاں تک کہ خدائے رحیم کو خود اپنے اس بندۂ کامل پر رحم آیا اور آگ ان کے لئے پھول بن گئی، پھر انہیں اپنے دین اور ایمان کو بچانے اور اسے پھیلانے کے لئے وطن کی مانوس ومحبوب سرزمین کو داغ فراق دینا اور ایک نامعلوم منزل – فلسطین – کی طرف روانہ ہو جانا پڑا، یہ صرف ان فضاؤں کی قربانی نہیں تھی، جن میں انہوں نے بچپن سے جوانی تک پوری زندگی گزاری تھی؛ بلکہ یہ تمام اعزہ اور اہل تعلق سے بھی ہمیشہ کے لئے منہ موڑ لینے کا اعلان تھا۔

پھر ایک مرحلہ آیا جب خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ ابراہیم اپنی نئی نویلی دلہن —— شہزادی مصر ہاجرہ —— کو فلسطین اور شام کے سبزہ زار سے نکال کر اپنے شیرخوار بچے کے ساتھ مکہ کے بے آب گیاہ صحرا میں چھوڑ آئیں، نوجوان بیوی اور دودھ پیتے بچے کو ایسی جگہ چھوڑ آنا جہاں پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہیں تھا، اور جہاں آدم زاد کا جینا تو کجا پرندوں کا پر مارنا بھی مشکل تھا، اپنی جان کی قربانی سے بھی بڑھ کر تھا؛ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے سامنے بھی سرِ تسلیم خم کر دیا، مگر قربانی کے مرحلے ابھی تمام نہیں ہوئے اور آزمائش کی دنیا ابھی ختم نہیں ہوئی؛ بلکہ وہ جوان بیٹا جو اولاد سے ناامیدی کے بعد پیدا ہوا، حکم ہوا کہ اسے خود اپنے ہاتھوں اپنے رب کی خوشنودی کے لئے تہ تیغ کر دو، یہ حکم خواب کے ذریعہ ہوا تھا، اور خواب میں تاویل کی گنجائش ہوتی ہے؛ لیکن بندۂ کامل حیلۂ وحجت پر کیوں کر قناعت کر سکتا تھا؛ اس لئے آپ نے اپنے بیٹے کی قربانی کا ارادہ کر لیا، اور بیٹے —— حضرت اسماعیل علیہ السلام —— بھی آخر جذبۂ ابراہیمی کے وارث تھے، انہیں کیسے عذر ہو سکتا تھا، انہوں نے بھی سرِ تسلیم خم کر دیا اور باپ نے اپنے جگر گوشہ اور نورِ چشم کو رضائے ربانی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا، البتہ خدا کو انسان کی قربانی مطلوب نہیں تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خود سپردگی کا امتحان مقصود تھا؛ اس لئے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بجائے پردۂ غیب سے آنے والے مینڈھے کی قربانی عمل میں آئی۔

غرض کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات طیبہ کا قرآن کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے تو اس کا خلاصہ صرف دو باتیں ہوں گی: دعوت حق اور اس راہ میں قربانی وفداکاری، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کی رضا اور خوشنودی کے لئے اپنے آپ کو مٹانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، اپنے آپ کو مٹایا، اپنے تعلقات کو مٹایا، بیوی اور شیرخوار بیٹے کی محبت کو مٹایا اور جوان بیٹے کو مٹایا؛ لیکن

قربانی اور اپنے آپ کو مٹانے نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو زندہ جاوید بنا دیا، قرآن مجید نے متعدد مواقع پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، چنانچہ فرمایا گیا کہ ہم نے اسے دنیا میں بھی منتخب کرلیا اور وہ آخرت میں بھی صالحین میں شمار ہوں گے:

{وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِيْنَ}

(البقرۃ : ۱۳۰)

یہی بات ایک دوسرے موقع پر بھی فرمائی گئی:

{وَ آتَيْنَاهُ فِي الْدُّنْيَا حَسَنَةً وَإِنَّهُ فِي الآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِيْنَ}

(النحل : ۱۲۲، نیز دیکھئے: العنکبوت : ۲۷)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات کو بقاء و دوام سے نوازا گیا: {وَ جَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقِبِهِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ} (الزخرف : ۲۸) امت محمدیہ جو قیامت تک کے لئے ہدایت یافتہ گروہ ہے، ان سے کہا گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی بھی تمہارے لئے آئیڈیل اور نمونہ ہے: {قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيْمَ} (الممتحنۃ : ۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعاء کی تھی کہ بعد میں آنے والوں میں میرا ذکر خیر باقی ہے: {وَاجْعَل لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِيْ الْآخِرِيْنَ} (الشوریٰ : ۸۴) یہ دعاء اس شان سے قبول ہوئی کہ آج دنیا میں تین بڑے مذاہب : اسلام، عیسائیت اور یہودیت کے ماننے والے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں اور اسی نسبت کو اپنے لئے تمغۂ افتخار سمجھتے ہیں، یہ بلندی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان بے پناہ قربانیوں کے ذریعہ حاصل ہوئی، جن کا ابھی ذکر کیا گیا۔

گروہ انبیاء علیہم السلام میں سب سے زیادہ آزمائشوں سے جو شخصیت گزری، وہ پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو جس قدر اللہ کے قریب ہوتا ہے، وہ اسی قدر آزمائشوں سے گزرتا ہے؛ اس لئے سب سے زیادہ آزمائش اللہ کے پیغمبروں پر آتی ہے، اور پیغمبروں میں سب سے زیادہ آزمائش مجھ پر آئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری سیرت مبارکہ اس پر گواہ ہے، اس سلسلہ میں وہ واقعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے، جس کے پس منظر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قربانی کا حکم دیا گیا ہے، ہوا یوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی وفات

ہوگئی، اس موقع پر عاص بن وائل نے کہا کہ محمد (ﷺ) تو ابتر ہوگئے ''ابتر'' سے مراد ہے بے نام ونشان ہوجانے والا شخص، عرب ایسے لوگوں کو ابتر کہتے تھے، جن کی صرف بیٹیاں ہوں؛ کیوں کہ انہیں پر ان کا خاندانی سلسلہ ختم ہوجاتا تھا، یہ مکی زندگی کا واقعہ ہے، بعض روایتوں میں آیا ہے کہ مدنی زندگی میں جب حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہونے والے آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی، تب ابوجہل نے کہنا شروع کیا کہ محمد (ﷺ) کا دین تو انہیں پر ختم ہوجائے گا، ان کے بعد ان کے دین کو قائم رکھنے والا کوئی نہیں ہوگا؛ اس لئے کہ وہ تو اولاد نرینہ سے محروم ہو چکے ہیں، (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۲۰ / ۲۲۲-۲۲۳) اس موقع سے آپ ﷺ پر سورۂ کوثر نازل ہوئی۔

اس سورہ میں پہلے تو رسول اللہ ﷺ کی دلداری کی گئی کہ ہم نے آپ کو حوض کوثر سے نوازا ہے، جس سے نہ صرف آپ ﷺ کی امت کو راحت نصیب ہوگی؛ بلکہ وہ میدان حشر میں آپ ﷺ کا امتیاز ہوگیا؛ لہٰذا آپ اپنے پروردگار کے لئے نماز پڑھئے اور قربانی کیجئے، اور دشمنوں کی باتوں سے متاثر نہ ہوئیے، اللہ انہیں کو بے نام ونشان کردیں گے، مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں دشمن سے مراد خاص طور پر ابوجہل، عاص بن وائل اور عقبہ بن ابومعیط وغیرہ ہیں، جو دل آزاری کی یہ بات کہنے میں پیش پیش تھے، خدا کی شان دیکھئے کہ اس نے دنیا میں رسول اللہ ﷺ کو ایسی سرفرازی اور سربلندی عطا فرمائی کہ شب وروز کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا ہے کہ جب کسی خطۂ زمین میں حضور ﷺ پر صلاۃ وسلام کی ندائے جاں فزا کانوں میں رس نہ گھولتی ہو، آپ ﷺ کی حیات طیبہ پر جتنا کچھ لکھا گیا ہے، جتنا کچھ کہا گیا ہے اور جس قدر شعراء نے اپنے تخیلات میں بلند پروازی کی ہے، دنیا کی کسی مذہبی یا غیر مذہبی شخصیت پر اس کا ہزارواں حصہ بھی نہ کہا گیا اور نہ لکھا گیا، اپنوں کے علاوہ بے گانوں اور دوستوں کے علاوہ دشمنوں کو بھی آپ ﷺ کی ذات عالی صفات کے حضور خراج تحسین پیش کرنا پڑا، یہ ''رفعنا لک ذکرک'' کی بہترین مثال؛ بلکہ نوبت محمدی (ﷺ) کا اعجاز ہے، اس کے برخلاف آپ ﷺ کے دشمنوں کا نام ونشان اس طرح مٹا کہ اگر آپ ﷺ کے حوالہ سے ان کا ذکر نہ آئے، تو تاریخ کے صفحات سے بھی ان کے نام مٹ جائیں، آج دنیا میں کروڑوں انسان ہیں جو محمد (ﷺ) کو اپنے نام کا جز بنا کر اپنے لئے سعادت و برکت حاصل کرتے ہیں اور ان میں خوشی کا

احساس ہوتا ہے؛ لیکن کوئی شخص اپنا یا اپنے بچوں کا نام ابوجہل، یا ابولہب، یا عاص اور عتبہ رکھنا نہیں چاہتا۔

قرآن مجید نے اس سرفرازی و سربلندی اور دشمنوں اور بدخواہوں کی ناکامی و نامرادی کو دو باتوں سے جوڑا ہے: ایک خدا کے سامنے سر تسلیم جھکانا، جس کا مثالی طریقہ نماز ہے، دوسرے: خدا کے راستے میں قربانی، جس کا علامتی عمل بقرعید اور حج کی قربانی ہے، مسلمانوں کے لئے ان کے نبی محمد رسول اللہ ﷺ اور ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ یہ ہے کہ وہ آزمائشوں اور ابتلاؤں سے گھبرائیں نہیں، امتحان ان کے پایۂ استقامت کو پھسلا نہ دے، حالات کچھ بھی ہوں اگر ان کی پیشانیاں خدا کے سامنے خم رہیں اور خدا کی خوشنودی کے لئے قربانی و فدا کاری کا اتھاہ جذبہ اس کے سینوں میں موجزن ہو، تو پھر سربلندی، کامیابی اور سرفرازی آخرت ہی میں نہیں، دنیا میں بھی اس کے قدم چومے گی:

آج بھی ہو جو براہیم کا ایمان پیدا
آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

۲۷/نومبر ۲۰۰۹ء

❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁❁

ایک بحران، معاشی بحران سے بھی بڑھ کر!

اس وقت دنیا ایک زبردست بحران سے گزر رہی ہے، جس کا چرچا ہر ملک اور ہر بڑے شہر میں ہے، اور جس کے اثرات شہر سے لے کر دیہات تک، اور اہل ثروت کے قصور ومحلات سے لے کر غریبوں کی جھونپڑیوں تک ہر جگہ محسوس کئے جارہے ہیں، ترقی پذیر ممالک تو کیا ترقی یافتہ ممالک بھی قرض کے بوجھ سے دبے جارہے ہیں، اس بحران پر سیمینار اور سمپوزیم ہورہے ہیں، عالمی کانفرنسیں منعقد ہورہی ہیں، ترقی یافتہ اور صنعتی ممالک کی گفت وشنید ہورہی ہے، اسکالرس تجزیے کررہے ہیں، مضامین شائع ہورہے ہیں، اور ایک سے ایک کتابیں منظر عام پر آرہی ہیں، ہر ملک اس بحران سے بچاؤ کی تدبیر میں مشغول ہے اور اس کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔

لیکن ایک اور بحران ہے، یہ بحران اس معاشی بحران سے بھی کہیں زیادہ تباہ کن اور نقصان دہ ہے، یہ بحران ایسا ہے کہ جس سے متاثر ہونے کے بعد انسان اپنے جسمانی قالب اور رنگ وروپ کے اعتبار سے تو انسان نظر آتا ہے؛ لیکن اس کا وجود حقیقی انسانیت سے خالی ہو چکا ہوتا ہے، شیطان کو بھی اس کے کردار پر شرم آنے لگتی ہے، وہ لذت پرستی میں اس قدر اندھا ہوجاتا ہے کہ سوائے جسمانی عیش وعشرت کے اس کو دنیا میں کوئی چیز قابل توجہ نظر نہیں آتی، یہ بحران ہے ، اخلاق کا بحران، یہ بحران ہے انسانی قدروں کا بحران، اور یہ بحران ہے تمام مذاہب اور مہذب انسانی سماج کی مشترکہ اور مسلمہ قدروں سے بغاوت کا بحران کسی بھی قوم کے لئے یہ بحران اُس معاشی بحران سے کہیں زیادہ نقصاندہ ہے، جس کی وجہ سے انسان کو بعض اوقات فاقوں سے گزرنا اور معمولی خوراک اور پوشاک پر گزر وبسر کرنا پڑتا ہے، اس لئے کہ جب کوئی قوم اخلاقی بحران میں مبتلا ہوتی ہے تو اس کا اجتماعی زوال شروع ہوجاتا ہے اور پھر وہ ایک باعزت قوم کی حیثیت

سے اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ پاتی۔

تاریخ میں یونان اور ایران کی مثالیں موجود ہیں، یہ قومیں ایک زمانے میں تمدن کے اعلیٰ مقام پر تھیں اور دنیا کے لوگ ان کی نقلیں کرنے کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے تھے؛ لیکن اخلاقی قدروں کی تباہی نے ان کو بالآخر صفحۂ ہستی سے مٹا دیا، روم اور یونان کی لذت پرستی اور اعلیٰ اخلاق سے محرومی کی داستان کے لئے پروفیسر لیکی کی ''تاریخ اخلاق یورپ'' دیکھئے کہ یورپ کا سماج اخلاقی اعتبار سے کس مقام پر پہونچ چکا تھا؟ فاحشہ عورتوں کو نہ صرف حکومتوں میں رسوخ حاصل تھا؛ بلکہ اس زمانہ کے عقلاء وحکماء بھی ان کی زلف کے اسیر ہوتے تھے اور ایک ایک عورت بے شمار مردوں کے ساتھ اور ایک ایک مرد ان گنت عورتوں کے ساتھ زندگی گزار چکے ہوتے تھے، بے لباسی اور عریانیت کو ایک فن اور ترقی کی علامت سمجھا جاتا تھا، جس کو آج بھی یورپ کے تراشیدہ قدیم مجسموں میں دیکھا جاسکتا ہے، اور جس کو مغرب کا ''آرٹ'' سے موسوم کرتا ہے، ایران میں اباحیت کی یہی تحریک ''مزدک'' کے ذریعہ اٹھی اور اس نے اخلاقی قدروں کو اس بے رحمی کے ساتھ پامال کیا کہ شاید پاگل ہاتھی بھی اپنے مدمقابل کو اس طرح نہیں روندتا، یہاں تک کہ ماں بہن کے مقدس رشتوں کی بھی اہمیت ختم ہوگئی، آخر یہی اخلاقی زوال اس قوم کی تباہی کا سبب بنا اور اب وہ تاریخ میں ایک داستان پارینہ کی حیثیت سے باقی ہے۔

اس وقت مغربی تہذیب اسی راستہ پر ہے، وہ تمام اخلاقی برائیاں جو پچھلی قوموں میں، یا ان قوموں میں تھیں، جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، وہ آج مغرب میں موجود ہیں؛ بلکہ مغرب نے اس کو علم واستدلال کا ذریعہ مضبوط بنانے اور اس کے لئے جواز پیدا کرنے کا رویہ بھی اختیار کیا ہوا ہے، اور مغرب میں اس کے اثرات بھی ظاہر ہورہے ہیں، خاندانی نظام کا بکھر جانا، نکاح کی شرح میں کمی، طلاق کی شرح میں اضافہ، انسان کی سکون قلب سے محرومی، نفسیاتی امراض میں عمومی طور پر ابتلاء اور امراض خبیثہ کی کثرت باوجودیکہ مغربی ممالک میں صحت کے وسیع مواقع ہیں، یہ سب اسی گناہ کی سزا اور قدرت کی طرف سے تنبیہ ہے؛ کیوں کہ سنت اللہ یہی ہے کہ جب کوئی قوم فطرت سے بغاوت پر اتر آتی ہے اور اللہ کے قانون کو توڑنے لگتی ہے تو پہلے بار بار تنبیہ کی جاتی ہے اور تازیانہ عبرت لگایا جاتا ہے؛ تاکہ وہ اپنے آپ کو سنبھال لے؛ لیکن جب یہ

تنبیہات بھی ان کے لئے کافی نہیں ہوتیں تو پھر اس قوم کی بساط لپیٹ دی جاتی ہے۔

آج دنیا میں مغربی ملکوں کا حال یہ ہے کہ وہ ترقی پذیر اور مشرقی ممالک سے قدرتی وسائل حاصل کرتے ہیں، پٹرول اور گیس سے لے کر لوہے اور سونے تک قدرتی وسائل کے ذخائر مشرق میں زیادہ ہیں، اسی طرح افرادی وسائل بھی مشرقی ملکوں میں کہیں زیادہ ہیں، اور اب مغربی ملکوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے روزمرہ کے معمولات کو باقی رکھنے میں بھی غریب ملکوں کے ماہرین اور مزدوروں کے محتاج ہیں، یہی غریب قوموں کی نمائندگی کرنے والے مزدور گاڑھے پسینے بہا کر بلند و بالا عمارتیں تعمیر کرتے ہیں، کاشت کاری میں ہاتھ بٹاتے ہیں اور یہیں کے ہنر مند ملک کو ترقی دینے میں اہم رول ادا کرتے ہیں؛ لیکن صورت حال یہ ہے کہ ان ملکوں کو قرض دے کر سود کے بوجھ سے اس طرح دبا دیا گیا ہے کہ وہ سر اٹھا نہیں سکتے، ان ملکوں کی پیداوار کی قیمتیں گرادی جاتی ہیں اور سستے داموں انہیں خریدا جاتا ہے، اور یہی خام مال جب مغرب کی فیکٹریوں سے گزر کر آتا ہے تو اس کی قیمتیں آسمان کو چھوتی ہیں، بعض دفعہ زراعتی اور غذائی پیداوار کو اس لئے ضائع کر دیا جاتا ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ان کی قیمتیں کم نہ ہو جائیں، دفاعی صفت پر ایک طرف اپنی اجارہ داری برقرار رکھی جاتی ہے اور دوسری طرف ترقی پذیر ملکوں کو لڑا کر ان ہتھیاروں کے لئے وسیع مارکیٹ فراہم کی جاتی ہے، جس ملک نے اب تک کی تاریخ میں پہلی اور آخری بار انسانیت کے خلاف نیوکلیر اسلحے استعمال کئے ہیں، وہی ترقی پذیر ملکوں کو پرامن مقاصد کے لئے بھی نیوکلیر ٹکنالوجی حاصل کرنے کا حق دینے کو تیار نہیں ہیں، اس طرح یہ ایک حقیقت ہے کہ مغرب نے معاشی، سیاسی اور دفاعی اعتبار سے مشرقی ملکوں کو اس خوبصورتی سے غلام بنا رکھا ہے کہ انہیں اپنی غلامی کا بھی احساس نہ ہو اور وہ استحصال کرنے والوں کو اپنا محسن اور دوست سمجھنے لگیں۔

مشرقی ملکوں میں مذہبی مزاج کے غلبہ کی وجہ سے بہت کچھ اخلاقی قدریں باقی ہیں، ایک مستحکم خاندانی نظام، رشتوں کا تقدس، سماجی بندھنوں کی وجہ سے بہت سی اخلاقی برائیوں سے حفاظت اور کسی نہ کسی درجہ میں جذبۂ ایثار، مادیت سے خالی بے غرض محبت، یہ وہ عناصر ہیں جن میں آج بھی مشرقی ملکوں کو تفوق حاصل ہے؛ لیکن اب گلوبلائزیشن کے نام پر ان قدروں کو بھی تباہ

کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

افسوس کہ ہمارے قانونی اداروں کے ہاتھ اس انسانیت کشی کے خون سے رنگے ہوئے ہیں، اس کی ایک مثال کچھ ماہ پہلے سامنے آچکی ہے کہ دہلی ہائیکورٹ نے ہم جنسی کو جائز قرار دینے کے لئے حکومت کو قانون سازی کی طرف متوجہ کیا اور حکومت کی صورت حال یہ ہے کہ اس نے اس کی مخالفت کرنے کی بجائے لیت ولعل کا رویہ اختیار کر رکھا ہے؛ چنانچہ بعض معتبر اطلاعات کے مطابق موجودہ لاء کمیشن نے نہ صرف ہم جنسی کی اجازت کے بارے میں حکومت کو قانون بنانے کی دعوت دی ہے؛ بلکہ بعض اور غیر اخلاقی قوانین کو منظور کروانے کے مشورے دیئے ہیں، جیسے زنا کے موجودہ قانون کے مطابق زنا اسی وقت جرم ہے، جب کہ نابالغہ کے ساتھ یہ فعل کیا جائے، یا کسی بالغ لڑکی سے جبرا کیا جائے، یا کسی منکوحہ عورت کے ساتھ ایسا عمل کیا جائے، لیکن اب اس میں نرمی برتتے ہوئے کمیشن کا مشورہ ہے کہ اگر شادی شدہ مرد یا عورت باہمی رضامندی سے اس طرح کا عمل کریں؛ لیکن اس کے عادی نہ ہوں تو اسے بھی جرم کے دائرہ سے باہر نکال دینا چاہئے، لاء کمیشن ایک ذمہ دار ادارہ ہے، جس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات بڑی بڑی تنخواہوں کے ساتھ کام کرتے ہیں اور بدقسمتی سے اس وقت بعض مسلمان ارکان بھی اس میں موجود ہیں، ایسے لوگوں کی طرف سے اس طرح کے مشورے کس قدر شرمناک اور قابل افسوس ہیں؟؟

ہماری عدالتیں بھی اس ترقی پسندی میں پیچھے کیوں رہتیں؟ چنانچہ اس وقت ۱۱/ دسمبر کا اخبار میرے سامنے ہے، جس کی اطلاع کے مطابق ملک کی اعلیٰ ترین عدالت نے حکومت سے پوچھا ہے کہ اسے قانونی طور پر کیوں نہ جائز قرار دیا جائے؟ اور اس کے فوائد بھی بتائے ہیں کہ اگر اسے قانونی شکل دے دی جائے تو اس پر نگرانی رکھنے میں اور جسم فروش کرنے والوں کی باز آباد کاری میں سہولت ہوگی، یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص بیماری کا علاج کرنے میں کامیاب نہ ہو رہا ہو تو وہ بیمار سے کہے کہ اس بیماری کو ہی صحت مان لو اور ان لوگوں کو بیمار سمجھو جو صحت مند ہیں، تا کہ تم میں بیمار ہونے کا احساس باقی نہ رہے۔

ہندوستان ایک مذہبی ملک ہے اور تمام مذاہب، نیز مہذب معاشرہ میں یہ بات تسلیم کی

جاتی رہی ہے کہ زندگی گزارنے کا شائستہ طریقہ یہ ہے کہ ایک عورت ایک ہی مرد کی وفادار رہ کر زندگی گزارے، ایک شخص خواہ کتنا ہی اوباش ہو؛ لیکن اگر اس سے کہا جائے کہ آپ کے کتنے باپ ہیں؟ آپ کی بہن کے کتنے شوہر ہیں؟ اور آپ کی بیوی کتنے مردوں کی زوجیت میں ہے؟ تو یہ ایک ناقابل برداشت اور انتہائی اشتعال انگیز سوال ہوگا، اس سے انسانی فطرت کی ترجمانی ہوتی ہے کہ جسم فروشی بے حیائی پر مبنی غیر قانونی فعل ہے نہ کہ قانونی عمل، پھر ہمیں فطرت انسانی کے اشاروں کو بھی سمجھنا چاہئے، نر و مادہ جانوروں میں بھی ہیں؛ لیکن ان میں خاندان اور نکاح کا کوئی تصور نہیں ہے، ایک مادہ سے کئی نروں کا اختلاط ہوتا ہے اور یہ اختلاط کسی بیماری کا سبب نہیں بنتا؛ بلکہ یہ ان کی فطرت کے دائرہ میں ہے؛ لیکن جب یہی کیفیت انسانی سماج میں پیش آتی ہے تو یہ طرح طرح کے خبیث امراض کا سبب بنتی ہے، اسی سے کسی زمانہ میں سوزاک اور آتشک جیسی بیماریاں پیدا ہوتی تھیں، اور اسی سے آج ایڈس جیسی بیماری وجود میں آرہی ہے، یہ قدرت کا واضح اشارہ ہے کہ خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے، اس کی فطرت کو دوسرے جانداروں سے مختلف اور بلند رکھا گیا ہے، اور اس کا اصل جوہر اس کی اخلاقی قدریں ہیں، اگر وہ اس جوہر سے خالی ہوکر ہوس کا پرستار ہوجائے تو نہ وہ انسان باقی رہتا ہے اور نہ ایک ایسا جانور جو صحت وسلامتی کے ساتھ زندہ ہو، اگر عدالت مشورہ دیتی کہ حکومت اس پیشہ کو ختم کرنے میں مؤثر رول ادا کرے، جن لوگوں کو جبراً اور دھوکہ دے کر اس گندے گڑھے میں اتار دیا جاتا ہے، ان پر زیادتی کرنے والوں کے لئے عبرت ناک سزائیں مقرر کی جائیں، ایسی عورتوں کو آباد کیا جائے، پاکیزہ زندگی کے لئے ان کی حوصلہ افزائی کی جائے، معاشرہ میں نکاح کی ترغیب دی جائے اور ایسے قوانین بنائے جائیں کہ نکاح آسان ہوجائے اور رسم ورواج کی زنجیریں ٹوٹ جائیں، تو یہ یقیناً یہ ایک تعمیری بات ہوتی۔

افسوس کہ ایسے واقعات پر دوسری قوموں کے ساتھ ساتھ امت اسلامیہ بھی ایک تماشہ بیں کا کردار ادا کرنے پر اکتفا کر رہی ہے؛ حالاں کہ ایک داعی امت کی حیثیت سے ہمارا فریضہ تھا کہ ہم ایسے مشوروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے، مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو اپنے ساتھ لیتے اور اس ملک کے خیر خواہ اور محب وطن شہری کی حیثیت سے اسے اخلاقی زوال وانحطاط کی راہ پر

جانے سے روکتے، یہ نہ صرف ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہماری ذمہ داری ہے؛ بلکہ یہ ایک بہترین موقع ہے کہ ہم فرقہ پرست عناصر کی سازشوں کو کمزور کریں، مسلمانوں کو الگ تھلگ کرنے کی ان کی کوششوں کو ناکام بنادیں، ایسے مسائل کو قومی اتحاد کا ذریعہ بنائیں اور برادران وطن کو محسوس کرائیں کہ ہمارے پاس صرف لینے والے ہاتھ نہیں ہیں؛ بلکہ دینے والے ہاتھ بھی ہیں اور ہم صرف اس ملک کے وسائل کے طلبگار نہیں ہیں؛ بلکہ ہم اس کے مسائل کو بھی حل کرنے کے اہل ہیں۔

۱۸/ دسمبر ۲۰۰۹ء

اجلاس مکہ کا پیغام

اسلام میں جن عبادتوں کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے، ان میں ایک عمرہ بھی ہے، اس کو ''حج اصغر'' بھی کہا گیا ہے ؛ کیونکہ بیت اللہ شریف کی زیارت کی سعادت اس میں بھی حاصل ہوجاتی ہے، بلکہ عمرہ میں جو افعال انجام دیئے جاتے ہیں، احرام، کعبۃ اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی، یہ تینوں حج کا بھی لازمی حصہ ہیں، عمرہ فضیلتوں کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ''ایک عمرہ کے بعد دوسرا عمرہ کرنا درمیان کے گناہوں کے لیے معافی کا سبب ہے'' (سنن ابن ماجة ، کتاب المناسک ، باب فضل الحج والعمرة، حدیث نمبر:۳۰۰۰)

یہ فضیلت ہم جیسے گنہگاروں اور معصیت شعاروں کے لیے بڑا سہارا ہے، خاص کر رمضان المبارک کے عمرہ کو آپ ﷺ نے حج کے برابر؛ بلکہ بعض روایتوں کے مطابق رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حج کے برابر قرار دیا ہے؛ اس لیے یہ حقیر کوشاں رہتا ہے کہ رمضان المبارک کے عمرہ کی سعادت کسی طور پر حاصل ہوجائے؛ تاکہ کچھ تو گناہوں سے آلودہ دامن دھل جائے۔

چنانچہ اس سال بھی شعبان کے اواخر میں حرمین شریفین میں حاضر ہونے اور رمضان المبارک کے اوائل میں عمرہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس کے بعد ہندوستان واپس ہوگیا، لیکن میری واپسی کے پہلے ہی سے یہاں خادم حرمین شریفین شاہ عبداللہ کی طرف سے ''وزارت اسلامی امور'' کے واسطہ سے رمضان المبارک کے اخیر عشرہ میں عمرہ کا دعوت نامہ موصول ہوا، میں چونکہ کافی تھکا ہوا تھا، اس کی وجہ سے اور ماہِ مبارک کے دوسرے معمولات کی وجہ سے معذرت کردی؛ بلکہ اپنی معذرت پر اصرار بھی کرتا رہا، سعودی سفارت خانہ کا اصرار جاری رہا، دو دو بار خود معزز سفیر نے

بھی فون کیا، آخر حرمین شریفین کی نسبت کی وجہ سے انہی کا اصرار غالب رہا، اور میں ۲۲ رمضان المبارک کو سعودی ایئر لائنس کے ذریعہ مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہوگیا، حیدرآباد ایئر پورٹ پر سعودی ایئر لائنس کے مقامی ذمہ داروں نے رخصت کیا اور جدہ ایر پورٹ پر استقبال کے لیے ''وزارت امور اسلامی'' کے نائب وزیر ڈاکٹر عبدالعزیز بن عبداللہ العمار ایک وفد کے ساتھ موجود تھے، مجھے جہاز کی سیڑھیوں سے اترتے ہی یہ حضرات وی آئی پی لاؤنج لے گئے اور پاسپورٹ کی کارروائی کر اکے پندرہ بیس منٹ میں وزارت کی گاڑی کے ذریعہ مکہ مکرمہ کے لیے روانہ کردیا گیا، میں نے فجر کی نماز حیدرآباد میں پڑھی تھی، اور ظہر کی نماز وہاں کے وقت کے لحاظ سے مکہ مکرمہ میں ادا کی۔

اس سفر کی خصوصی اہمیت اس لیے تھی کہ اس میں عمرہ کے علاوہ بادشاہ سے ملاقات اور ذمہ داران حکومت کے ساتھ تبادلہ خیال کا انتظام بھی تھا؛ لیکن گفتگو کے لیے پہلے سے کوئی ایجنڈہ متعین نہیں کیا گیا تھا، اس خصوصی دعوت میں پوری دنیا سے صرف ۲۰ مذہبی، علمی، دعوتی اور فقہی شخصیتوں کا انتخاب کر کے انہیں دعوت دی گئی تھی، جب سعودی سفارت خانہ اور ریاض سے وزارت شئون اسلامیہ کے سکریٹریٹ نے مجھے یہ تفصیل بتائی تو میں نے کسی تکلف سے کام لیے بغیر ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں اس لائق نہیں ہوں کہ آپ مجھے اس فہرست میں رکھیں اور وہ بھی ایسی صورت میں جبکہ ہندوستان سے صرف ایک شخصیت کو مدعو کیا جانا ہے، لیکن انہوں نے مان کر نہیں دیا، اور کہا کہ ہماری حکومت کو جو معلومات فراہم ہوتی ہیں، اس کے مطابق افراد کا انتخاب کیا جاتا ہے، اور آپ کا نام وزارت نے غور وفکر کے بعد طئے کیا ہے۔

میرے علاوہ قطر سے مشہور مصنف اور فاضل ڈاکٹر یوسف القرضاوی، مصر سے شیخ جمال مرابکی، کویت سے ڈاکٹر محمد طباطبائی (جو وہاں کے وزیر اوقاف بھی ہیں)، یمن سے وہاں کے وزیر اوقاف اور ممتاز عالم دین شیخ حمود بیتار، بحرین سے وہاں کے ممتاز صاحب علم اور رکن پارلیمنٹ شیخ عادل معاودۃ، مشہور فقیہ اور مصنف شیخ فیصل مولوی (لبنان)، لبنان ہی کے مفتی اعظم شیخ خلیل محی الدین، ترکی سے وہاں کے مفتی اعظم ڈاکٹر علی جرادق اوغلو، جن کی حیثیت وزیر کے درجہ کی ہوتی ہے، روس سے صدر جمعیت مفتیین روشان رافق عباس — جو روس میں شعبہ خارجہ تعلقات کے صدر بھی ہیں، — ایران سے اہل سنت کے ممتاز عالم اور قائد مفتی عبدالحمید اسماعیل (شیخ الحدیث و

مفتی دارالعلوم زاہدان)، افریقی ملک گھانا سے ممتاز صاحب علم، وزیر شؤون اسلامیہ اور اسلامک فینانس کے ماہر ڈاکٹر مصطفی قطب سانو، انڈونیشیا سے ڈاکٹر محمد ہدایت نور وحید — جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے فاضل بھی ہیں اور پارلیمنٹ کے چیرمین بھی، — تھائی لینڈ سے ڈاکٹر اسماعیل لطفی جافا کیا، جو حکومت تھائی لینڈ کے وفد حج کے صدر اور مختلف دینی اداروں کے ذمہ دار ہیں، اور ممتاز علماء میں ان کا شمار ہے، نیز جمعیۃ الدعوۃ سنگاپور کے صدر ابوبکر محی الدین ان مدعوین میں شامل تھے، پاکستان سے صدر جمعیۃ اہل حدیث ڈاکٹر ساجد میر، بنگلہ دیش سے وہاں کے معروف عالم دین محمد سلطان ذوق ندوی (ناظم جامعۃ المعارف چاٹگام)، ہندوستان سے یہ حقیر اور برطانیہ سے ہندوستان نژاد ڈاکٹر سبیل حسن مدعو تھے، مدعوئین میں مختلف مسالک اور نقاط نظر کو شامل رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔

اس پورے وفد کو مسجد حرام سے متصل شاہی محل ''قصر الصفاء'' میں ٹھہرایا گیا تھا، مہمان خانہ کا یہ حصہ ۱۸ منزلوں پر مشتمل ہے، اس کی پندرہویں منزل مسجد ہے، جس میں مسجد حرام کے امام کی اقتداء میں نماز ادا کی جاتی ہے، یہاں امام کی قرأت وغیرہ کو بالکل اسی طرح سنا جا سکتا ہے، جیسے آپ مسجد حرام کے اندر رہ کر سنتے ہیں، وہاں سے مسجد حرام میں نماز کا منظر اتنا خوبصورت اور پرکشش نظر آتا ہے کہ شاید آنکھوں نے اس سے پہلے کبھی ایسا منظر دیکھا نہیں تھا، نمازیوں کی صفیں کچھ اس طرح تھیں کہ گویا انسانوں کے جسم سے چنی ہوئی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں، ستائیسویں شب کو طواف کرنے والوں کی کثرت کی وجہ سے ایسا لگتا تھا کہ گویا زمین خود کعبۃ اللہ کے اطراف گھوم رہی ہے۔

۲۴ رمضان المبارک کو نماز تراویح کے بعد وفد کی ملاقات ڈاکٹر عبدالعزیز عماری نائب وزیر شئون اسلامیہ کے ساتھ ہوئی، وہ بہت خوش اخلاق، مہمان نواز اور سمجھدار شخصیت کے مالک ہیں، اور باضابطہ عالم دین بھی ہیں، وہ دوبار حیدرآباد آچکے ہیں، اور حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے ثناخوانوں میں سے ہیں، اس موقع سے انہوں نے تمام مہمانوں کا خود ہی تعارف کرایا، انہوں نے اپنی افتتاحی گفتگو میں بتایا کہ اس وقت مملکت کی طرف سے ۲۰ ان شخصیتوں کو مدعو کیا گیا ہے، جو علمی اور دعوتی پہلو سے عالم اسلام اور پوری دنیا میں امتیازی حیثیت کی حامل ہیں، اور اس کا مقصد

آپ کے مشوروں اور تجربات سے استفادہ کرنا ہے، تاکہ موجودہ حالات کے پس منظر میں اسلام کی دعوت کو پوری دنیا تک پہنچایا جائے، اور اسی کے مطابق نوجوان نسل کی تربیت کی جائے؛ اس لیے خاص طور پر ایسی شخصیتوں کو زحمت دی گئی ہے جو اپنے علمی وفقہی مقام، قلمی خدمات اور دعوتی جذبہ کے اعتبار سے مسلمانوں پر اثر رکھتے ہیں، انہوں نے میرا تعارف کراتے ہوئے جب کہا کہ یہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے جنرل سکریٹری اور ہندوستان و پاکستان میں علمی وفقہی حیثیت سے معروف ہیں، دعوتی کام کرنے والے لوگ بھی ان سے وابستہ ہیں، ان کی تحریریں اردو دنیا میں کافی پڑھی جاتی ہیں اور ان کے شاگرد پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، تو میں خود حیرت زدہ رہ گیا کہ یہ معلومات انہیں کیوں کر حاصل ہوئیں؟

اس کے بعد تبادلہ خیال کا سلسلہ شروع ہوا، جس کا آغاز لبنان سے آئے ہوئے مہمان اور مفتی شیخ خلیل محی الدین سے ہوا، انہوں نے تمام حاضرین کی طرف سے بڑے اچھے انداز میں شکریہ ادا کیا، پھر بحرین سے آئے ہوئے عالم دین اور رکن پارلیمنٹ شیخ عادل معاودۃ نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ بڑی اچھی بات یہ ہے کہ سعودی عرب میں اپنی ذمہ داری کا شعور پایا جاتا ہے، انہوں نے کہا کہ اس وقت سب سے اہم ضرورت امت کا اتحاد واتفاق ہے، انہوں نے مشورہ دیا کہ اس وقت ضرورت ہے کہ سعودی عرب نئی نسل کو اعتدال ومیانہ روی کی دعوت دے اور اس میں دنیا بھر کے علماء سے تعاون حاصل کرے۔ انہوں نے سعودی عرب میں مزید اسلامی جامعات کھولنے کی بھی بات کہی، شیخ خلیل نے اس پر اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ بہتر ہے کہ سعودی عرب اپنی جامعہ اسلامیہ کے تحت مختلف ملکوں میں معاہد کھولے، اس طرح کم اخراجات میں زیادہ سے زیادہ افراد تیار ہو سکتے ہیں، ڈاکٹر صہیب حسن (برطانیہ) نے کہا کہ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں بھی مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے میں سعودی عرب اہم کردار ادا کر سکتا ہے، جیسا کہ اس وقت چین میں مسلمانوں کے ساتھ صورتحال پیش آئی، یا جیسا کہ برطانیہ میں مسلمانوں کے خلاف شدت پسند انگریزوں نے احتجاج کیا، ایسے مسائل میں اگر سعودی عرب سفارتی سطح پر کوشش کرے تو مسلمان اقلیتوں کے مسائل حل ہو سکتے ہیں، انڈونیشیا کے نمائندہ ڈاکٹر محمد ہدایت نور وحید نے اپنے ملک کے حالات بتاتے ہوئے کہا کہ وہاں سب سے اہم مسئلہ عیسائی مشنریز کی طرف

سے فتنۂ ارتداد کا ہے؛ اس لیے سعودی حکومت اگر وہاں ہاسپٹلس اور عصری علوم کے ادارے قائم کرے تو اس فتنہ کا تدارک ہوسکتا ہے، ڈاکٹر قطب مصطفی (گھانا) نے کہا کہ موجودہ حالات میں اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ کس طرح ہونا چاہیے اور دشمنوں کو کس طرح دوست بنانا چاہیے؟ اور اس کے لیے تعلیم وتربیت کی ضرورت ہے، ڈاکٹر قطب' ماشاء اللہ بڑی فاضل شخصیت کے مالک ہیں، بڑی خوبصورت عربی بولتے ہیں، سیاہ فام ہیں اور اپنے ملک کے اسلامی امور کے وزیر ہیں۔

راقم الحروف کو اندازہ تھا کہ موجودہ حالات میں کیا امور زیر بحث آسکتے ہیں؟ اس پس منظر میں اس نے چار تجاویز تحریری شکل میں مرتب کر لی تھی؛ تاکہ وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے آسکے، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی نئی نسل کی تربیت کرنے، ان میں داعیانہ ذہن پیدا کرنے اور جہاد کے نام پر دنیا کے بعض علاقوں میں جو برادرکشی ہو رہی ہے اس کے بارے میں سمجھانے، نیز جہاد کا حقیقی مفہوم اور اس کے مواقع کو واضح کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کام دنیا بھر کے علماء کے تعاون کے بغیر نہیں ہوسکتا، دوسرے جس طرح سعودی عرب میں قرآن مجید کی طباعت کے لیے ''مجمع لملک فہد'' قائم ہے، اسی طرح ضرورت ہے کہ سعودیہ ایک ایسی اکیڈمی بھی قائم کرے جو اسلام کی رحم دلی پر مبنی تعلیمات، اس کی انسانیت نوازی، غیر مسلموں، یہاں تک کہ جانوروں کے ساتھ حسن سلوک وغیرہ پر معتبر اور موثر لٹریچر تیار کرے اور اس میں غیر مسلموں میں پھیلائی گئی غلط فہمیوں کو پیش نظر رکھا جائے، نیز دنیا کی تمام اہم زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا جائے۔ اس سے نہ صرف غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگا؛ بلکہ دعوت اسلام کا کام بھی بڑے پیمانہ ہوسکے گا، تیسرے یہ کہ سعودی عرب کو چاہیے کہ انٹرنیشنل سطح پر ایسا ٹی وی چینل قائم کرے جو دنیا کی تمام اہم مروج زبانوں میں اسلام کا صحیح تعارف کرائے اور اسلام کے بارے میں پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کرے، چوتھے یہ کہ سعودی عرب چونکہ پوری امت مسلمہ کے لیے مرکزی حیثیت کا حامل ہے؛ اس لیے یہ عالم اسلام کے باہمی اختلافات کو سلجھانے اور ان میں اتفاق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرے، بحمد للہ ان تجاویز کو نہ صرف توجہ سے سنا گیا؛ بلکہ حاضرین نے ان کی تائید وتحسین بھی کی اور متعدد شرکاء نے انہی تجاویز کے حوالہ سے گفتگو کی۔

۲۵ رمضان المبارک کونماز تراویح کے بعد شیخ صالح آل شیخ وزیر امور اسلامی کے ساتھ ملاقات طئے تھی۔ یہ پہلے وزیر عدل بھی رہ چکے ہیں، ماشاء اللہ اسلامی علوم سے اچھی مناسبت رکھتے ہیں اور بہت ہی متواضع اور خلیق ہیں، انہوں نے حاضرین کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی گفتگو اس بات سے شروع کی کہ دین کی دعوت واشاعت میں ہر دور کی ترجیحات الگ الگ ہوسکتی ہیں اور شریعت کے احکام پر مختلف ادوار کی تبدیلیوں کا اثر بھی پڑتا ہے، اس دور کے تقاضے اور مشکلات گذشتہ ادوار سے مختلف ہیں، ایک زمانہ مساجد کے خطبات، دروس اور تقریروں کا تھا، آج کا دور الکٹرانک ذرائع ابلاغ کا ہے، اور بعض سروے کے مطابق ۷۰ سے ۹۰ فیصد لوگ آج اسی ذریعہ سے متاثر ہوکر رائیں قائم کرتے ہیں، آج کا دور اپنے افکار کو وضاحت اور سلیقہ سے پیش کرنے کا ہے، اس کے لیے پوری دنیا کے دروازے کھلے ہیں، اگر ہم اپنی بات صحیح طور پر پیش کرسکیں تو اسلامی دعوت کو فروغ حاصل ہوسکتا ہے، انہوں نے مختصر؛ لیکن بڑی موثر گفتگو کی، پھر تمام شرکاء کو فرداً فرداً اظہار خیال کی دعوت دی۔

اس موقع سے ڈاکٹر محمد طباطبائی (کویت) نے کہا کہ سعودی عرب ایک ایسی مملکت ہے، جو اقدام اور سبقت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، انہوں نے اس سلسلہ میں بین مذہبی مذاکرات کا ذکر کیا اور کہا کہ ہم مملکت سے ایسے اقدامات کے منتظر رہتے ہیں۔ شیخ خلیل محی الدین (لبنان) نے کہا کہ سعودی عرب ہر مسلمان کا وطن اول اور اس کا اپنا ملک وطن ثانی ہے۔ انہوں نے بھی سعودی عرب کی جامعات کے تحت معاہد کے قیام کا مشورہ دیا۔ شیخ عادل معاودۃ (بحرین) نے کہا کہ سعودی عرب کی ایک خصوصی حیثیت ہے اور پوری دنیا کے مسلمان اس کی رہنمائی کے منتظر رہتے ہیں۔ شیخ روشان رافق عباس نے روس اور سعودی عرب کے درمیان پیدا ہونے والے بہتر تعلقات پر شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ روس میں مسلمان اپنا خصوصی چیانل شروع کرنے والے اور مستقبل قریب میں ''روس اور عالم اسلام کے تعلقات'' پر ایک کانفرنس کرنے والے ہیں، جس میں مختلف اسلامی ممالک کے وزراء شئون اسلامیہ اور روس کے متعدد وزراء شرکت کریں گے، مفتی عبدالحمید (ایران) نے ایران کے سنی اکثریت صوبہ زاہدان کے تعلیمی نظام اور خاص کر دارالعلوم زاہدان کا ذکر فرمایا، وہ کسی قدر تکلف کے ساتھ اردو میں بھی گفتگو کر لیتے ہیں۔

ڈاکٹر اسماعیل لطفی (تھائی لینڈ) نے اپنے ملک کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اگر ملک کے جنوبی علاقہ کے مسلمان حکومت کے خلاف جدوجہد کرنے کی بجائے حکومت میں شامل ہوجاتے تو وہ مسلمانوں کو زیادہ فائدہ پہنچا سکتے تھے، انہوں نے بتایا کہ ان کے یہاں مختلف مذاہب کے لوگوں نے ملک میں سماجی اصلاح کے لیے ایک مشترکہ پلیٹ فارم قائم کیا ہے، حالانکہ مسلمان آبادی کا تناسب بہت کم ہے، مگر مجھے اس کا صدر بنایا ہے۔ مولانا سلطان ذوق ندوی (بنگلہ دیش) نے دعوتی مقاصد کے لیے خصوصی تربیتی کیمپ رکھنے کی خواہش کی۔ ڈاکٹر قطب مصطفی (گھانا) نے اپنی گفتگو میں کہا کہ ہمیں نوجوانوں کو سمجھانا چاہیے کہ عمل کے مقابلہ میں ردعمل ہمیشہ اس سے زیادہ خراب ہوتا ہے، ''ردود الفعل تکون اسوأ من الفعل'' اس حقیر نے عرض کیا کہ میں نے اپنی تجاویز تحریری طور پر حوالہ کردی ہیں؛ البتہ دو باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں، ایک یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم میں ہر ایک ذمہ دار ہے اور جو لوگ اس کی ذمہ داری میں ہیں، وہ ان کے بارے میں جوابدہ ہیں: ''کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته'' (صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب المرأة رعیة في بیت زوجها، حدیث نمبر: ۵۲۰۰) پس ہر حکومت ان لوگوں کی ذمہ دار ہے جو اس کے ملک میں آباد ہوں؛ لیکن سعودی عرب کا معاملہ اس سے مختلف ہے، دنیا میں کہیں بھی کوئی مسلمان ہو، وہ اس ملک کی ذمہ داری میں داخل ہے اور یہ حکومت ان کے بارے میں عنداللہ جوابدہ ہے، کیونکہ یہ پوری ملت اسلامیہ کا مرکز و ماویٰ ہے، سعودی عرب کو ہمیشہ اپنی اس حیثیت کو ذہن میں رکھنا چاہیے، دوسرے اس وقت دعوت اسلام کی طرف توجہ کی خصوصی ضرورت ہے، اگر اس پر توجہ دی گئی تو ممکن ہے کہ دنیا میں اسی طرح کا معجزہ ظاہر ہو جیسا کہ تاتاریوں کے دور میں ظاہر ہوا تھا۔ میں نے یہ بھی عرض کیا کہ سعودی حکومت کو مملکت کے اندر اور اس کے باہر لوگوں کا مزاج بنانا چاہیے کہ وہ فقہی اختلافات میں غلو اور مخالف نقطۂ نظر کو بالکلیہ غلط اور نادرست قرار دینے سے اجتناب کریں۔

ڈاکٹر صہیب حسن (برطانیہ) نے یورپ میں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ناروا رویہ کا ذکر کیا، اس پر وزیر موصوف نے جواب دیا کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ اسلام اور رسول اللہ ﷺ سے ناواقف ہیں اور ناواقفیت کی بنا پر ایسی باتیں کرتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے

کہ یورپ میں جو اسلامی مراکز قائم ہیں، انہوں نے اسلام کے تعارف کا حق ادا نہیں کیا اور وہاں جو مسلمان گئے وہ اس معیار کے نہیں تھے کہ گرجاؤں کے رہنماؤں اور سیاسی قائدین کو خطاب کر سکتے اور ان کے سامنے اسلام کی شایان شان تصویر رکھتے، آج بھی دراصل اسی کام کی ضرورت ہے۔ انہوں نے اخیر میں کہا کہ یہ پہلی اور آخری ملاقات نہیں ہے؛ بلکہ آئندہ ملاقاتوں کے لیے نقطہ آغاز ہے۔ مجلس میں جو تجاویز پیش کی گئیں انہیں وزارت کے نمائندے نوٹ کرتے رہے، واقعی اگر ان تجاویز پر عمل ہو تو اس کے بڑے گہرے اور مفید اثرات مرتب ہوں گے، وزیر موصوف کی انکساری اور بلند اخلاقی نے تمام شرکاء کو متاثر کیا، انہوں نے بعض ہدایا کے ذریعہ بھی مہمانوں کا اکرام کیا۔

۲۶ رمضان المبارک کو ہم لوگ افطار پر خادم الحرمین الشریفین شاہ عبداللہ کے یہاں مدعو تھے، مکہ میں شاہی محل اس مہمان خانہ کی پشت پر ہے، جس میں ہم لوگوں کا قیام تھا، مگر حفاظتی نقطہ نظر سے اس کا راستہ باہر ہے، ہم لوگ مختلف حفاظتی تدبیروں اور برقی سیڑھیوں کے چھ مراحل سے گزرنے کے بعد ایک خوبصورت اور کشادہ مستطیل ہال میں پہنچے، دعوت افطار میں ان نمائندوں کے علاوہ مسجد حرام کے ائمہ، چند منتخب علماء و وزراء شامل تھے، تقریباً پچاس کی تعداد رہی ہوگی، ہر شخص کی نشست متعین تھی، ترتیب یہ تھی کہ دو افراد کی گنجائش والی کرسی پر ایک مہمان اور ایک امام مسجد حرام یا مقامی عالم کو رکھا گیا تھا، ہر ایک کے سامنے افطار کے سامان سے سجی میز تھی اور اس میں کوئی زیادہ تنوع نہیں تھا، یہیں شیخ عبدالرحمن سدیس سے بھی مصافحہ کا شرف حاصل ہوا، شیخ سعود شریم بھی موجود تھے، جن کی تلاوت کی کشش کی وجہ سے نماز طویل ہو تب بھی مختصر معلوم ہوتی ہے اور دل چاہتا ہے کہ قرآن مجید سنتے ہی رہیں۔

جب تمام لوگ بیٹھ گئے تو شاہ عبداللہ داخل ہوئے، ان کی عمر نوے کے آس پاس ہے، مگر چہرہ بشرہ سے اس کا احساس نہیں ہوتا، انہوں نے سلام کیا اور ہاتھ اٹھا کر لوگوں کے سلام کا جواب دیا، اس کے بعد تمام حاضرین نے فرداً فرداً مصافحہ کیا، وہ کھڑے ہو کر ہر ایک سے ملتے اور دعائیہ کلمہ کہتے رہے، اس کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھ گئے، ان کے دائیں طرف ایک سعودی عالم اور بائیں طرف ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی نشست رکھی گئی تھی۔ شیخ قرضاوی نے میزبانوں کی طرف سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سعودی عرب کی اساس دین اور سیاست کے امتزاج پر ہے اور اس کی

بنیاد ایک سیاسی شخصیت شاہ عبدالعزیز اور مذہبی شخصیت شیخ محمد بن عبدالوہاب نے مل کر رکھی ہے؛ اس لیے دین اس ملک کی سرشت میں ہیاور اس کو اسی طرح رہنا چاہئے، دوسری بات انہوں یہ کہی کہ عالم اسلام کے حکمرانوں کا عموماً اور عالم عرب کے حکمرانوں کا خصوصاً مزاج یہ ہے کہ وہ صرف تعریف کے گن گانے والوں اور خوشامدانہ رویہ اختیار کرنے والوں کو مدعو کرتے ہیں، نصیحت کرنے والوں کو مدعو نہیں کرتے، مگر مجھے مسرت ہے کہ آج آپ نے ناصحین کو دعوت دی ہے، جو بے غرض لوگ ہیں اور جن کی نصیحت نہ صرف آخرت کے لیے فائدہ مند ہے؛ بلکہ دنیا میں بھی نفع رساں ہے، ابھی ان کی گفتگو جاری تھی کہ اذان ہوگئی اور لوگ افطار کرنے لگے۔

افطار کے بعد ایک دوسرے ہال — جو حرم شریف کے صحن سے متصل، مگر بلندی پر تھا، — میں مسجد حرام ہی کے ساتھ نماز ادا کی گئی، شاہ عبداللہ نے اگلی صف میں کرسی پر بیٹھ کر نماز ادا کی اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ فرض ادا کرنے کے بعد بھی دیر تک نوافل پڑھتے رہے، اس کے قریب ایک اور ہال میں عشائیہ کا نظم تھا، اس میں بھی ہر ایک کی نشست مقرر تھی، جب سب لوگ بیٹھ چکے تو بادشاہ داخل ہوئے، لوگوں نے کھڑا ہونا چاہا، مگر انہوں نے اشارہ سے روک دیا، کھانے میں مختلف علاقوں کے ذوق کی رعایت ملحوظ رکھی گئی تھی، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جب لوگ واپس ہوئے تو بادشاہ خود دروازہ پر کھڑے ہوئے اور ایک ایک شخص کو مصافحہ کرتے ہوئے ''مع السلامۃ'' کہہ کر رخصت کیا، اس پوری مجلس میں شیخ یوسف القرضاوی کا جرأتمندانہ خطاب واقعی بہت ہی قابل تحسین تھا اور یہ بات کہ شاہ عبداللہ نے کسی ناگواری کے بغیر توجہ کے ساتھ پورا خطاب سنا؛ البتہ انہوں نے خود کوئی گفتگو نہیں کی۔

ستائیسویں شب کی مناسبت سے آج حرم شریف میں غیر معمولی ہجوم تھا، پورا مطاف طواف کرنے والوں سے بھرا ہوا تھا اور اوپر سے یہ منظر اتنا خوبصورت اور دلکش تھا کہ الفاظ کے ذریعہ اس کی تصویر کھینچی نہیں جاسکتی، نماز تراویح کے بعد ہمیں امیر نائف بن عبدالعزیز کے یہاں لے جایا گیا، یہ وزیر داخلہ بھی ہیں، بادشاہ کے نائب ثانی بھی اور کہنا چاہیے کہ سعودی حکومت کے دماغ اور پالیسی ساز بھی، ان کی قیامگاہ غالباً منیٰ یا مکہ کے آخری حصہ میں واقع ہے، وہ بھی کافی سن رسیدہ ہیں، گرمجوشی کے ساتھ مہمانوں سے ملے، کچھ ہی عرصہ پہلے ان کے لڑکے محمد بن نائف پر ایک

خودکش حملہ ہو چکا ہے، جس میں وہ بال بال بچ گئے، شیخ قرضاوی نے انہیں تسلی کے کلمات کہتے ہوئے اس واقعہ پر بہت افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ قابل افسوس ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں مسلمانوں کے ہاتھ خود مسلمانوں کے خون سے رنگین ہیں اور ہر دن ایسی خبریں پڑھ کر کلیجہ پھٹنے لگتا ہے، انہوں نے کہا کہ یہ بالکل خوارج کی طرح ہیں، جن کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ قرآن مجید کی تلاوت اور عبادت میں پیش پیش ہوں گے، مگر جیسے ترکش سے تیر نکل جاتا ہے، اسی طرح دین ان سے نکل چکا ہوگا۔

وزیر موصوف نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ نوجوانوں کی صحیح تربیت علماء کی ذمہ داری ہے، کیونکہ ان کی بات قبول کی جاتی ہے۔ انہوں نے سعودی حکومت کے اعتدال اور میانہ روی کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس حکومت کے مؤسس اول سے لے کر آج تک ہم اعلان کرتے آئے ہیں کہ کتاب وسنت ہی ہمارا دستور ہے، مملکت کا فقہی مذہب حنبلی ہے ؛ لیکن عدالتیں اور دارالافتاء اگر امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے مذہب کے مطابق اور اہل سنت کے مذاہب اربعہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے فیصلے کریں اور فتوے دیں تو ہم اس کو بھی قبول کرتے ہیں، انہوں نے عراق میں صدام حسین اور افغانستان میں اسامہ بن لادن کی لائی ہوئی مصیبت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا، اس کا فائدہ صرف اور صرف اسرائیل کو ہوا۔ انہوں نے جمال عبدالناصر کے عہد میں اخوانیوں کی مدد کا ذکر کیا اور افسوس ظاہر کیا کہ اس تنظیم نے بھی انتہاء پسندی اور تشدد کو تقویت پہنچائی، اس پر شیخ قرضاوی نے اختلاف کرتے ہوئے نہ صرف وضاحت کی ؛ بلکہ کہا کہ میں خود اخوانی رہا ہوں، اس پر کافی دیر تک دونوں میں بحث جاری رہی، شیخ عادل معاودۃ اور شیخ جمال مرابکی (مصر) نے گفتگو کا رخ موڑنا چاہا، مگر انہیں اس میں کامیابی نہ ہوسکی، آخر شیخ صالح آل شیخ نے موضوع بدلتے ہوئے وزیر موصوف سے کہا کہ اس وقت دنیا کے منتخب ترین علمائے اسلام آپ کے یہاں اس مبارک مہینہ اور بابرکت رات میں موجود ہیں، اور آپ کی اس ضیافت کے لیے شکر گزار ہیں۔

امیر نائف نے بھی اس کے جواب میں مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ پر ہمارا حق ہے کہ ہم سے جو غلطی ہو، آپ ہمیں اس پر متنبہ کریں اور آپ کا ہم پر حق ہے کہ آپ کی جو نصیحت

کتاب وسنت کے مطابق ہو، ہم اسے قبول کریں، امیر نائف کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ نہایت ذہین، حالات سے باخبر اور اسلامی علوم سے اچھی طرح واقف لوگوں میں ہیں۔ افسوس کہ اس مجلس کے طویل ہوجانے کی وجہ سے ہم لوگ نماز تہجد کی چار رکعت ہی پا سکے اور پہلی چار رکعت سے محروم رہے، اس طرح سعودی حکومت کے ذمہ داروں سے ملاقات کا سلسلہ انجام کو پہنچا اور مختلف مہمان اپنے اپنے ملک روانہ ہوگئے، یہ حقیر ۲۷ رمضان المبارک کو مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوگیا، اس پورے پروگرام میں میرے لیے جو بات گراں خاطر تھی، وہ یہ کہ اکثر عرب علماء کا چہرہ داڑھی سے خالی تھا اور لباس نہایت پرشکوہ، یہی حال ترکی اور روس کے نمائندوں کا تھا، ان میں ایک شخصیت وہ تھی جن کی تحریروں کی بنا پر میں ان سے بہت متاثر اور فقہ المعاملات پر ان کی بصیرت کا قائل تھا، وہ اب اپنی عمر طبعی کے آخری مرحلہ میں ہیں، مگر ان کا بھی یہی حال تھا؛ البتہ خلیج کے علماء صالحانہ وضع قطع اور عالمانہ شان کے ساتھ تھے، افسوس کہ ان عرب ملکوں میں یہودی علماء بڑی بڑی داڑھیاں رکھتے ہیں، شیعہ علماء بھی داڑھی رکھتے ہیں، مگر اہل سنت کی نمائندگی کرنے والے اس اہم سنت سے دور ہیں۔ والی اللہ المشتکی۔

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ پورے عالم اسلام میں سعودی عرب نے بحمد اللہ اپنی ایک اسلامی شناخت رکھی ہے اور اس نے اپنی طاقت بھر امت مسلمہ کے مسائل کو حل کرنے اور حکمرانوں نے اسلام کی خدمت کو اپنی وجہ شناخت بنانے کی کوشش کی ہے؛ چنانچہ شاہ عبدالعزیز نے ملک میں اسلامی قوانین نافذ کیے اور حرمین شریفین کی اس زمانہ کی ضرورت کے مطابق توسیع کی، شاہ فیصل شہید نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور عالمی سطح پر مسلمانوں کو متحد کرنے کے لیے رابطہ عالم اسلامی کی بنیاد رکھی۔ شاہ فہد نے قرآن مجید کی خدمت کے لیے ''مجمع الملک فہد'' قائم کیا اور بڑے پیمانہ پر حرمین شریفین کی توسیع کی اور مقامات حج میں عالیشان مسجدیں بنوائیں، شاہ عبداللہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو عصری علوم میں آگے بڑھانے کے لیے جامعۃ الملک عبداللہ قائم کر رہے ہیں اور حرمین شریفین کی خدمت میں بھی لگے ہوئے ہیں، حج وعمرہ کرنے والوں کی یہ حکومت جس حسن وخوبی کے ساتھ خدمات کر رہی ہے، وہ ایک ایسا کارنامہ ہے کہ اس کی جس قدر تحسین کی جائے کم ہے، اس کے علاوہ اس کی معتدل روش اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات سے اپنے آپ

کو دور رکھنے اور ثالث کا کردار ادا کر کے صلح کرانے کی کوشش بھی اس کی ملی خدمت کا ایک نمایاں حصہ ہے؛ البتہ یہ بات ظاہر ہے کہ حکومتیں یا افراد، خامیوں اور کوتاہیوں سے یکسر خالی نہیں ہوتے۔

مکہ مکرمہ کے اس اجتماع سے اس حقیر نے عبرت وموعظت کے جو پھول چنے ہیں، وہ اس طرح ہیں:

- اتحاد مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت ہے، اور یہ ایک دوسرے کے احترام اور غیر اہم مسائل میں تشدد سے اجتناب کے ذریعہ ہی حاصل ہوسکتا ہے۔
- فقہی مسائل واحکام میں تشدد دین کے مزاج کے خلاف ہے۔
- غیر مسلموں کے درمیان اسلام کا تعارف، غلط فہمیوں کا ازالہ اور دعوت اس وقت مسلمانوں کے لیے سب سے اہم کام ہے۔
- علماء کی ذمہ داری ہے کہ موجودہ نازک حالات میں وہ نئی نسل کی تربیت کریں، انہیں اعتدال ومیانہ روی پر قائم رکھیں، اور نقصاندہ جذباتیت سے بچائیں۔
- علماء کے لیے ضروری ہے کہ وہ حکمت اور جرأت کے ساتھ حکمرانوں کے سامنے اپنی بات پیش کریں۔
- موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے اپنے ٹی وی چینل ضروری ہیں، جو اسلامی تعلیمات کو صحیح طور پر پیش کریں اور غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کریں۔
- موجودہ دور میں مسلمان حکومتوں سے تصادم اکثر اوقات خونریزی، طاقت کے بکھراؤ اور انتشار کا سبب بنتا ہے؛ اس لیے ضرورت ہے کہ حکمت کے ساتھ حکمرانوں تک بات پہنچانے کی کوشش کی جائے اور صبر کا رویہ اختیار کیا جائے جیسا کہ امام ابو یوسفؒ نے حکمت سے کام لیا اور سعید بن جبیرؒ، امام ابوحنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ نے صبر ودرگزر کا رویہ اختیار کیا کہ یہ نقصان پہلے نقصان سے کم تر ہے!

۲، ۹/اکتوبر ۲۰۰۹ء

سچر کمیٹی رپورٹ — لمحۂ فکریہ

کسی گروہ کا اکثریت میں ہونا بجائے خود اس کے لئے حفاظت کا ایک حصار ہے، خاص کر ایسے ملک میں جہاں جمہوری نظام رائج ہو، اکثریت کو از خود سیاسی بالادستی حاصل ہوجاتی ہے اور سیاست کے ایوان ہی سے ملک وقوم کے لئے نفع ونقصان کے سارے فیصلے ہوتے ہیں؛ اس لئے انہیں حقوق مانگنے کی ضرورت نہیں پڑتی؛ بلکہ دوسرے مذہبی، تہذیبی اور لسانی گروہ خود ان سے اپنے حقوق طلب کرنے پر مجبور ہوتے ہیں؛ اسی لئے عالمی سطح پر اقلیتوں کے حقوق کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے اور ہمارے ملک کے دستور میں بھی اقلیت کے حقوق پر وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اسے نمایاں حیثیت دی گئی ہے۔

اسلام میں بھی اقلیتوں کے حقوق کو خاص اہمیت حاصل ہے اور انہیں نام ہی ''اہل ذمہ'' کا دیا گیا ہے، یعنی مسلمان بحیثیتِ فرمانروا کے ان کی حفاظت، نگداشت اور ان کو ان کے جائز حقوق دینے کے ذمہ دار ہیں اور انہوں نے خدا سے اس کا عہد کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ مسلم ممالک میں ہمیشہ غیر مسلم اقلیتیں چین وسکون کے ساتھ رہتی آئی ہیں، خود ہمارے ملک ہندوستان کو دیکھئے کہ ملک کی آزادی کو پچاس سال کا بھی عرصہ نہیں گذرا، اور اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمان اپنے مذہبی، تہذیبی اور لسانی تشخص سے دست بردار ہوجائیں اور اپنی شناخت کو گم کردیں؛ لیکن مسلمانوں نے اس ملک پر کم وبیش ایک ہزار سال حکومت کی، اس طویل عرصہ میں انہوں نے کبھی بھی برادران وطن کو ان کی تہذیبی شناخت سے محروم کرنے کی کوشش نہیں کی، ان کی زبانیں — جس میں ہندی کے علاوہ سنسکرت زبان سے پیدا ہونے والی دوسری زبانیں، ملیالم، تمل، تلگو اور مراٹھی وغیرہ شامل ہیں — کو مٹانے اور بے نام ونشان کرنے کی کوشش نہیں کی گئی؛ اسی لئے آج یہ زبانیں اپنے امتیازات کے ساتھ موجود ہیں اور اسی لئے ہندو تہذیب وثقافت تاریخ کی فراموش

کردہ تہذیبوں کی صف میں نہیں چلی گئی، اسی طرح برادرانِ وطن کی مذہبی عبادت گاہیں مسلم عہد میں بھی پوری شان وشوکت کے ساتھ باقی رہیں اور نہ صرف یہ کہ مسلمانوں نے ان پر دست درازی نہیں کی؛ بلکہ مسلمان فرمانرواؤں نے مندروں پر بڑی بڑی جاگیریں وقف کیں، یہاں تک کہ اورنگ زیب عالمگیر — جن بعض حضرات اپنی ناواقفیت کی وجہ سے ہندو دشمن تصور کرتے ہیں، — ہندو مندروں پر ان کی عطا کی ہوئی جاگیریں دوسرے فرمانرواؤں سے بھی بڑھ کر ہیں؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بعض دفعہ برادرانِ وطن کے ساتھ رواداری کا جذبہ اعتدال سے بڑھ جاتا تھا اور ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد سے بڑھ کر مختلف مذاہب کے انضمام کی غیر حقیقت پسندانہ سوچ بھی پروان چڑھنے لگتی تھی، اکبر اور دارا شکوہ اس کی واضح مثال ہیں۔

مگر یہ کڑوا سچ اور افسوس ناک حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے برادرانِ وطن کے ساتھ جس فراخ دلی کا ثبوت دیا اور ایک ہزار سال تک انہیں اپنے مذہب اور تہذیب کے تحفظ اور تعلیمی ومعاشی ترقی کا موقع دیا، پھر ملک کو آزاد کرانے میں قربانیاں دیں، اور اپنے خون جگر کی سوغات پیش کر کے ملک کو آزاد کرایا، آج ان سے ان کی شناخت چھیننے کی کوشش کی جارہی ہے، ملک کو آزاد ہوئے صرف ساٹھ سال کا عرصہ ہوا ہے؛ لیکن اس مختصر عرصہ میں ان کی زبان تراش لی گئی، تخت وتاج سے کھیلنے والوں کو کاسۂ گدائی لینے پر مجبور کر دیا گیا، علم ودانش کے دروازے ان پر بند کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، بے جا شکوک وشبہات کے دائرہ میں لا کر انہیں رسوا کیا جاتا ہے، ان کے مذہبی مقامات کی توہین کر کے دل آزاری کی جاتی ہے، سیاسی اعتبار سے ان کو بے اثر کرنے کے لئے مسلم اکثریت علاقوں کو پسماندہ اقوام کے لئے ریزروحلقہ قرار دیا جاتا ہے اور بعض صوبوں میں مسلم ووٹرو کے تناسب کو کم کرنے کے لئے بنگلہ دیشی ہونے کا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔

یہ ایسی ناانصافیاں ہیں، جو دوپہر کی دھوپ کی طرح واضح ہیں؛ لیکن فرقہ پرست عناصر اس سچائی کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھے، اسی پس منظر میں موجودہ یو، پی، اے حکومت نے دہلی ہائی کورٹ کے سابق جج جسٹس راجندر سچر کے زیر قیادت مارچ ۲۰۰۵ء میں ایک چھ رکنی کمیٹی تشکیل دی تھی، جس نے تقریباً ڈیڑھ سال کی محنت اور ملک کے مختلف علاقوں کے جائزہ کی روشنی میں ۱۷/ نومبر ۲۰۰۶ء کو اپنی رپورٹ پیش کر دی، سچر کمیٹی کی یہ رپورٹ ہندوستان میں مسلمانوں کے سماجی،

تعلیمی اور معاشی حالات پر ایک جامع جائزہ بھی ہے اور تجویز بھی، اس رپورٹ میں جو کچھ کہا گیا ہے، نہ صرف مسلمانوں؛ بلکہ انصاف پسند غیر مسلم بھی پہلے سے ان سے واقف تھے؛ لیکن اس رپورٹ نے دستاویزی طور پر مسلمانوں کی زبوں حالی کو ثابت کر دیا ہے اور فرقہ پرستوں کے اس الزام کی قلعی بھی کھول دی ہے کہ حکومت مسلمانوں کے خوشامد میں لگی ہوئی ہے، یہ خوشامد بھی خوب ہے، جس نے مسلمانوں کو تخت اقتدار سے تختۂ دار تک پہنچا دیا ہے۔

سچر کمیٹی رپورٹ مسلمانوں کو دو سمتوں میں متوجہ کرتی ہے، رپورٹ کا پہلا رخ یہ ہے کہ ناانصافی کرنے والوں نے گویا اپنا اقبالی بیان اور اعتراف گناہ کا دستاویزی ثبوت ہمارے حوالہ کر دیا ہے؛ اس لئے ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم مسلسل اور مربوط کوشش کے ذریعہ حکومت کو انصاف کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کریں، ظلم و ناانصافی کے خلاف احتجاج نہ صرف ایک ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ہمارا دستوری حق ہے؛ بلکہ یہ ہمارا شرعی اور ملی فریضہ ہے؛ کیوں کہ قرآن مجید نے بھی ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی تلقین کی ہے:

{لاَیُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلاَّ مَن ظُلِمَ}

(النساء: ۱۴۸)

رسول اللہ ﷺ نے ظالم فرمانروا کے سامنے حق اور سچائی کے پیش کرنے کو افضل ترین جہاد قرار دیا ہے:

''أفضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر''(سنن أبي داؤد، كتاب الملاحم، باب الأمر والنهي، حدیث نمبر: ۴۳۴۶، سنن الترمذی، حدیث نمبر: ۲۳۲۹، سنن ابن ماجة، حدیث نمبر: ۴۱۴۷)

رسول اللہ ﷺ نے ناانصافی کو روکنے ہی کے لئے ''حلف الفضول'' کے نام سے باضابطہ ایک انجمن کی تشکیل فرمائی، آپ ﷺ کا یہ عمل گو نبی بنائے جانے سے پہلے کا ہے؛ لیکن آپ ﷺ کو انصاف دلانے اور ظلم سے بچانے کی یہ تحریک اتنی عزیز تھی کہ آپ ﷺ نبی بنائے جانے کے بعد بھی فرماتے تھے کہ ''اگر اب بھی مجھے اس کی طرف دعوت دی جائے تو میں اسے قبول کروں گا'' (السنن الکبری للبیہقی، حدیث نمبر: ۱۳۴۶۱)؛ اس لئے مسلمان نہ صرف اپنے آپ پر ہونے والے ظلم کے

خلاف استقامت کے ساتھ آواز اٹھانے کے مکلف ہیں ؛ بلکہ دوسرے طبقات کے ساتھ زیادتی روا رکھی جائے تو اس کو روکنے کی کوشش کرنا بھی ان کا فریضہ ہے۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مسلمان ایسے مسائل میں فوری طور پر تو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ؛ لیکن ان کی کوشش میں تسلسل نہیں ہوتا، یہ کمی ان کوششوں کو بے نتیجہ بنا دیتی ہے، قدرت کا نظام ہے کہ سیلاب کا تیز بہاؤ پتھر کی چٹان میں سوراخ نہیں کرتا ؛ لیکن اگر پانی کی حقیر بوندیں مسلسل گرتی رہیں تو وہ پتھر کے جگر میں بھی سوراخ کر دیتی ہیں، یہی حال عملی زندگی میں انسانی کوششوں کا ہے، جد وجہد کی مقدار زیادہ ہو ؛ لیکن مختصر وقت میں ہی دم توڑ دے تو اکثر وہ بے نتیجہ ہو جاتی ہے ؛ لیکن تھوڑی کوشش بھی مسلسل کی جائے تو انسان کامیابی کا سفر طے کرتا ہے اور اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے، اس کی مثال ہمارے ہی ملک میں بسنے والے سکھ ہیں ؛ ۱۹۸۴ء میں ان کے خلاف خونریز فسادات برپا کئے گئے، ہزاروں لوگ مارے گئے اور کتنی ہی خواتین اس طرح اغوا کی گئیں کہ آج تک ان کا پتہ نہیں چل سکا، سکھوں نے اس ظلم کے خلاف وقتی احتجاج پر اکتفا نہیں کیا ؛ بلکہ مسلسل اس تحریک کو چلاتے رہے اور آخر مظلوموں کو ان کا حق دلانے میں کامیاب ہوئے، یہ استقامت اور تسلسل کی برکت ہے ؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اس عمل کو بہتر قرار دیا، جو گو مقدار میں کم ہو، مگر اس پر مداومت برتی جائے :

" ـــ وأن أحب الأعمال أدومها إلى الله وإن قل " (صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومۃ علی العمل، حدیث نمبر : ۶۴۶۴)

مسلم تنظیموں کو اس رپورٹ پر ایسی ہی جد وجہد کی ضرورت ہے، جو رپورٹ کی سفارشات کے مطابق حکومت سے اقدامات کرائے اور پھر ان اقدامات کی نگرانی بھی کرتی رہے۔

حکمت کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ مسلمان اسے ایک قومی مسئلہ کی حیثیت سے پیش کریں، اس میں انصاف پسند اور سیکولر فکر کے حامل برادرانِ وطن کی بھی تائید حاصل کریں اور ان کو بھی اپنے ساتھ لے کر چلیں، اس طرح اس تحریک کو منزل تک پہنچانا آسان ہوگا، اگر جسم کا ایک عضو ناکارہ ہو تو جسم کے اور حصے کتنے بھی صحت مند ہوں، اس جسم کو بیمار ہی سمجھا جائے گا، اسی طرح ملک کی سب

سے بڑی اقلیت کی پس ماندگی کے ساتھ ملک کے ترقی یافتہ ہونے کا خواب ہرگز شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا، یہ حقیقت ملک کے بہی خواہوں پر واضح کی جائے، کسی سیاسی پارٹی کو اس کے سیاسی استحصال کی اجازت نہیں دی جائے اور تمام سیاسی جماعتوں تک مسلمانوں کی اپنے جائز حق اور انصاف کے لئے آواز پہنچائی جائے۔

اس رپورٹ نے یقیناً ایک سچائی کو اعداد شمار کا دستاویزی ثبوت فراہم کر کے مظلموں کی ترجمانی کی ہے؛ لیکن اس کا ایک منفی پہلو یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کو بھی ذات پات کی بنیاد پر تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ایک طبقہ کو اعلیٰ طبقہ قرار دیتے ہوئے ''اشراف'' اور ایک طبقہ کو سب سے کم تر قرار دیتے ہوئے ''ارذال'' کا نام دیا گیا ہے، یہ بات سراسر خلافِ واقعہ ہے، مسلمان کسی مسلمان کو ''رذیل'' نہیں سمجھتا؛ کیوں کہ انسانی وحدت اور اسلامی اخوت اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے:

''المسلم أخو المسلم'' (صحیح البخاری، کتاب المظالم، باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمه، حدیث نمبر: ۲۴۴۲)

قرآن مجید نے صاف کہا ہے کہ عزت وشرافت کا معیار تقویٰ ہے نہ کہ نسلی اور نسبی تعلق:

{إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ} (الحجرات: ۱۳)

برادران وطن کا مسئلہ اور ہے، ان کے یہاں طبقاتی تقسیم اور اونچ نیچ کا تصور محض ایک سماجی برائی نہیں ہے؛ بلکہ ان کے عقیدہ کا حصہ ہے؛ اسی لئے مہاتما گاندھی، راجہ رام موہن رائے وغیرہ کی اصلاحی کوششوں اور ریزرویشن کی رعایت کے باوجود ہندو قوم اس فرسودہ فکر کی قید سے آزاد نہ ہوسکی ،مسلمانوں میں اگر کہیں ذات پات کے تصور نے تعصب اور تنگ نظری کی صورت اختیار کی ہے تو یہ برادران وطن سے تاثر کا نتیجہ ہے اور ایک سماجی برائی ہے؛ اسی لئے مسلمانوں کو معاشی پس ماندگی کے پس منظر میں ریزرویشن ملنا چاہئے، ذات پات کی بنیاد پر ریزرویشن مسلمانوں کے لئے تریاق نہیں ہے، زہر ہے، یہ امت کو تقسیم کردے گا اور مسلمانوں میں بھی اونچ نیچ کے اسی تصور کو جنم دے گا اور تقویت پہنچائے گا، جو برادرانِ وطن میں اس وقت موجود ہے۔

یہ تو مسئلہ کا پہلو ہے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ سچر کمیٹی رپورٹ خود مسلمانوں کو خود احتسابی کی

دعوت دیتی ہے، جس شخص کو خود چلنے کا حوصلہ نہ ہو اسے بیساکھیوں کے سہارے کب تک چلایا جا سکتا ہے؟ جو شہسوار خود میدان جیتنے کا عزم نہ رکھتا ہو وہ دوسروں کا بازو تھام کر کتنا فاصلہ طے کرسکتا ہے؟

رسول اللہ ﷺ نے ایک دعا یہ بھی سکھائی ہے: اے اللہ! ہمیں اپنے سوا کسی کا محتاج نہ بنا:

"اللهم اكفني بحلالك عن حرامك وأغنني بفضلك عمن سواك" (سنن الترمذی، کتاب الدعوات، حدیث نمبر: ۳۹۱۱)

یہ صرف دعا نہیں ہے، ایک پیغام بھی ہے کہ مسلمانوں کو دوسروں کی محتاجی سے بچنا چاہئے اور خدا سے لو لگا کر اور خود جد و جہد کر کے منزل مقصود حاصل کرنی چاہئے، ہمیں خود مسلم معاشرہ کی تربیت کرنی چاہئے کہ وہ تنگی و ترشی جھیل کر اپنے بچوں کو تعلیم دلائیں وہ اپنا سرمایہ بے جان عمارتوں کی تزئین کاری اور خوشی و غم کی تقریبات میں فضول خرچی کے بجائے تجارت اور کسب معاش کے مفید وسائل میں صرف کریں، انہیں اجتماعی کوششوں کے ذریعہ اعلیٰ فنی تعلیمی ادارے قائم کرنے چاہئیں، ان میں خود اپنے اوقاف کے احترام کا جذبہ پیدا ہو، وہ حقیر انفرادی مفادات کے لئے وقف کی جائدادوں پر غاصبانہ قبضہ سے بچیں اور وقف کی املاک کو ملت کی فلاح و بہبود اور تعلیمی و رفاہی کاموں میں استعمال کریں۔

اس رپورٹ نے حفظان صحت کے پہلو کا بھی احاطہ کیا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان آبادیوں کو شہری سہولتیں فراہم کرنے میں بخل سے کام لیا جاتا ہے اور دو نظری برتی جاتی ہے، مگر یہ بھی ایک سچائی ہے کہ خود مسلمانوں نے ماحول کو صاف ستھرا رکھنے کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات کو فراموش کر دیا ہے، گھر کے کچرے اور گندگی کو سڑک پر ڈال دینا اور گندے پانی کی نالیوں کو گلیوں میں بہا دینا ہماری پہچان بن گئی ہے، سڑکوں پر آگے بڑھ کر مکانات کی تعمیر اور بجلی کی چوری ہمارا شیوہ سمجھا جاتا ہے؛ حالاں کہ رسول اللہ ﷺ نے صفائی کو نصف ایمان قرار دیا ہے:

"الطهور شطر الإيمان" (صحیح مسلم، کتاب الطهارة، باب فضل الوضوء، حدیث نمبر: ۵۵۶)

اور چوری (صحیح البخاری، کتاب أحاديث الأنبياء، حدیث نمبر، ۳۴۷۵) اور غصب کو سخت

ترین سزا کا موجب ٹھہرایا، (صحیح البخاری تعلیقاتحت کتاب الحیل ، باب إذا غصب جاریة فزعم أنها ماتت) جب تک کہ ہم خود اپنے آپ کو اسلامی قدروں کا پابند نہیں بنائیں گے اور اپنی آبادیوں کو مہذب رنگ اور صحت بخش ماحول دینے میں تعاون نہیں کریں گے، صرف شکووں اور گلوں سے ہمارے مسائل حل نہیں ہوں گے؛ اس لئے ضرورت ہے کہ مسلمان خود اپنا احتساب کریں کہ

{إِنَّ اللّٰہَ لاَ یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوا مَا بِأَنْفُسِہِمْ}(الرعد : ۱۱)

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

لال مسجد کا سیاہ واقعہ

کسی بھی عمل کے درست ہونے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں: ایک یہ کہ فکر صحیح ہو اور دو مقصد پیش نظر رکھا گیا ہو، وہ دین میں مطلوب ہو، دوسرے طریقۂ کار بھی درست ہو اور وہ شریعت کے دائرہ میں ہو، نماز کا مقصد اللہ کو یاد کرنا اور اسے راضی کرنا ہے، اگر کوئی شخص دکھاوے کے لئے اور خدا کے ذکر بجائے لوگوں میں اپنے ذکر کو عام کرنے کی غرض سے نماز پڑھنے لگے تو یقینا بنیادی فکر ہی غلط ہوگی اور اس کا یہ عمل گو عبادت نظر آئے؛ لیکن حقیقت میں یہ اس کو خدا سے قریب کے بجائے مزید دور کرنے کا ذریعہ ہے، اسی طرح ایک شخص نے نماز تو واقعی صحیح مقصد کے لئے پڑھی، اس کا منشأ سچ مچ اللہ کو راضی کرنا ہے؛ لیکن نماز کی ادائیگی کے لئے اس نے من چاہا طریقہ اختیار کرلیا، وہ قیام کی جگہ رکوع کرتا ہے، سجدہ دو کے بجائے تین کرلیتا ہے، جو ذکر رکوع میں منقول ہے اسے قیام کی حالت میں پڑھتا ہے تو باوجود مقصد میں اخلاص کے نماز درست نہیں ہوگی۔

یہ صرف نماز ہی پر موقوف نہیں ہے، زندگی کے تمام اعمال کا یہی حکم ہے، جہاد ایک عظیم عبادت ہے، جس میں انسان جان کو اپنی ہتھیلی میں لے کر نکلتا ہے؛ لیکن اگر جہاد کا مقصد خدا کو راضی کرنا اور اللہ کے دین کو غالب کرنا نہ ہو؛ بلکہ اپنی بہادری کا اظہار ہو تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ اللہ کے راستہ میں جہاد نہیں، اسی طرح اگر جہاد میں احکام شریعت کو ملحوظ نہیں رکھا جائے، بے قصوروں کو نشانہ بنایا جائے، عورتوں اور بچوں کو ڈھال بنالیا جائے، جن لوگوں کو جہاد کرنے کی ولایت حاصل نہیں ہے، وہ اپنے طور پر امیر بن کر کھڑے ہوجائیں تو یہ قتل وخونریزی اور خودکشی تو ہوسکتی ہے، جہاد نہیں ہوسکتا، آپ ﷺ نے میدانِ جنگ میں ایک عورت کی لاش دیکھی تو سخت ناراض ہوئے، حدیث میں یہ بھی موجود ہے کہ دشمن کے کچھ لوگ فوجی حملہ کے وقت کلمۂ شہادت پڑھنے لگے، مسلمان فوج نے حالات وقرائن کی وجہ سے خیال کیا کہ یہ دل سے ایمان لانے والے

لوگ نہیں ہیں ؛ بلکہ محض جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھ رہے ہیں اور انہوں نے ہلّہ بول دیا، آپ ﷺ مجاہدین پر سخت ناراض ہوئے اور ارشاد فرمایا: کیا تم لوگوں نے ان کے دل چیر کر دیکھے تھے؟ پس اگر کوئی شخص واقعی جہاد کرے اور اس کا عمل تعلیمات قرآن وحدیث کے مطابق سچ مچ جہاد کا مصداق ہو، پھر بھی اگر طریقۂ کار میں غلطی پائی جائے تو وہ عتاب ومؤاخذہ کا مستحق قرار پاتا ہے۔

ابھی ''لال مسجد، اسلام آباد'' میں جو صورت حال پیش آئی ، وہ نہایت ہی افسوس ناک ، اسلام اور مسلمانوں کے لئے بدنامی کا باعث اور مقدس مقامات کے تقدس کو پامال کرنے والی ہے، لال مسجد کے ذمہ دارنوں کی شہرت قانونِ شریعت کے نفاذ کے مطالبہ اور منکرات اور برائیوں کو بہ قوت روکنے کی کوشش سے شروع ہوئی ، امام مسجد کے معتقدین اور اس مسجد سے مربوط طلبہ وطالبات نے بے حیائی کے اڈوں، فلم ہالوں اور ویڈیو کی دوکانوں پر چھاپہ مارنا اور بزورقوت ان کو بند کرانا شروع کیا، اس میں ایک حد تک انہیں کامیابی بھی حاصل ہوئی ؛ لیکن ایک گروہ میں اس کی وجہ سے دین اور علماء سے نفرت پیدا ہونے لگی ،حکومت سے تصادم کی نوبت آ گئی اور یہ تصادم اس درجہ بڑھا کہ مسجد اور اس سے ملحق مدارس حکومتِ پاکستان کے مخالفین کی چھاؤنی بن گئے اور پھر وہی ہوا جو پہلے سے نقش دیوار تھا، سینکڑوں جانیں گئیں ، بہت سے معصوم طلبہ وطالبات بھی موت کے خونی پنجہ کی گرفت میں چلے گئے ،مسجد ومدرسہ کا تقدس پامال ہوا، پوری دنیا میں اسلامی مراکز کی بدنامی ہوئی اور برائی سے روکنے کا جو کام حکمت ودانائی سے انجام پا سکتا تھا، یقیناً اس واقعہ سے وہ بھی متأثر ہو گیا، اس واقعہ کا محرک جو بھی ہو، ہوسکتا ہے کہ پرویز مشرف نے اپنی لاقانونیت کے جواز اور جسٹس افتخار چودھری کے احتجاج کو بے اثر کرنے اور مغرب سے اپنی ضرورت کو منوانے کے لئے یہ ڈرامہ رچایا ہو،مگر بہر حال نقصان اس کا پوری امت کو ہوا ہے۔

برائی سے روکنا ایک اہم ترین شرعی فریضہ ہے،قرآن مجید نے اس کو اس امت کا فریضۂ منصبی قرار دیا ہے ؛ لیکن کوئی شخص برائی سے روکنے کے لئے کون سے وسائل اختیار کرے؟ آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں اصولی ہدایت دی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

''تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے ، وہ اسے ہاتھ یعنی قوت سے روکنے کی کوشش کرے ، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے اور

اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے اور یہ ایمان کا سب سے کم تر درجہ ہے''
(صحیح مسلم، حدیث نمبر:۴۹)

دل سے روکنے میں دو باتیں شامل ہیں: ایک یہ کہ برائی کو دیکھ کر دل میں کڑھن پیدا ہو، دوسرے یہ عزم کرے کہ آئندہ جب بھی اس میں برائی کو روکنے اور اس پر ٹوکنے کی طاقت پیدا ہوجائے گی تو وہ اسے روکنے کی پوری کوشش کرے گا، حضور ﷺ کا ارشاد کہ ''اگر طاقت سے روک سکے تو طاقت استعمال کر کے روکے'' کو تو اس پس منظر میں سمجھنا چاہئے کہ بعض سزائیں ایسی ہیں، جن کو جاری کرنے کی ولایت افراد کو بھی حاصل ہے، جیسے باپ اپنے بچوں کی تنبیہ کرسکتا ہے، شوہر کو بیوی اور استاذ کو شاگرد کی تأدیب کا حق دیا گیا ہے؛ لیکن یہ حق بہت محدود ہے اور فقہ کی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے، یہ تأدیب ایذاء اور تکلیف رسانی کے درجہ کو ہرگز نہیں پہنچنی چاہئے، نہ اس کا مقصد توہین وتذلیل ہونا چاہئے، بیشتر جسمانی اور مالی سزائیں اور منکر کو روکنے کے لئے ان کے استعمال کا حق حکومت کو حاصل ہے، کوء شخص کسی کو زنا کرتے ہوئے دیکھے اور اس پر مطلوبہ گواہی موجود ہو، پھر بھی وہ اپنے طور پر زنا کی سزا نافذ نہیں کرسکتا، شریعت میں شراب کی سزا مقرر ہے ؛لیکن عام مسلمانوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے طور پر شراب خانہ میں داخل ہوکر شراب پینے والوں کو مار پیٹ کرنا شروع کردیں، قوت کے ذریعہ برائی کو روکنا اور اس کے لئے طاقت کا استعمال کرنا اصل میں حکومت کی ذمہ داری ہے؛ اسی لئے حدود دار الاسلام میں امیر وقاضی کے واسطہ سے نافذ کی جاتی ہے، اگر حکومت اس میں کوتاہی سے کام لے تو داعیانِ دین کا فریضہ ہے کہ وہ ایک طرف حکمت اور نرمی کے ساتھ ماحول کی رعایت کرتے ہوئے ایسے لوگوں کو برائی سے باز رہنے کی دعوت دیں اور سماج میں منکرات کو ختم کرنے کی تدبیر کریں، شاہ اسماعیل شہیدؒ کے حالات میں لکھا کہ وہ لکھنؤ کی طوائف میں دعوتی واصلاحی کام کرنا چاہتے تھے، اس کے لئے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان کی ایک دن کی فیس ادا کردیتے، اور یہ پورا وقت ان کے درمیان اصلاحی باتیں کہنے اور گناہوں سے توبہ کرنے کی طرف راغب کرنے میں لگاتے، اس طرح لکھنؤ (جو اس زمانہ میں رقص وسرود کی بزمیں آراستہ کرنے والی طوائفوں کے لئے مشہور تھا) میں پچاسوں پیشہ ور طوائفوں نے توبہ کی اور ان کی زندگی میں ایسا صالح انقلاب آیا کہ ان کو دیکھ کر کوئی ان کے ماضی کا

تصور بھی نہیں کرسکتا تھا، اس طرح حکمت ومصلحت کے ذریعہ اصلاح کی خدمت انجام پاتی ہے۔

دوسری طرف حکومتِ وقت سے متصادم ہوئے اور اس کے قصر اقتدار پر پتھر پھینکے بغیر ان کو برائیوں سے روکنے پر آمادہ کیا جائے، ان کو بتایا جائے کہ یہ نہ صرف اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والے افعال ہیں؛ بلکہ دنیا کے اعتبار سے بھی انسانی سماج کے لئے مہلک اور نقصاندہ ہیں وایسی تدبیروں سے محبت کی فضا میں مسائل حل ہوتے ہیں، علماء کو چاہئے کہ موجودہ حالات میں وہ امام ابو یوسفؒ اور شیخ احمد سرہندیؒ کے طریقۂ کار کو اسوہ بنائیں، امام ابو یوسفؒ نے جس دور میں عہدۂ قضاء قبول کیا، اس وقت عباسی حکومت اور علماء اہل سنت کے درمیان آویزشوں کا ماحول تھا؛ اسی لئے جب آپ نے عہدۂ قضاء کو قبول کیا تو دوستوں اور بہی خواہوں کی طرف سے طعن وتشنیع کے تیر بھی سہنے پڑے؛ لیکن آپ نے اس عہدہ کو بڑی حکمت کے ساتھ حکومت کے رُخ کو درست کرنے کے لئے استعمال فرمایا، اصلاح کی بات کہنے میں کی تکلف سے کام نہیں لیا؛ لیکن اس کے لئے ایسی زبان اختیار کی، جس میں قندونبات کی مٹھاس اور محبت کی خوشبو تھی، جس کا اندازہ آپ کی کتاب ''کتاب الخراج'' کے مقدمہ سے ہوتا ہے، اسی طرح مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے نصح و موعظت کے ذریعہ ایسی کامیابی حاصل کی، کہ اکبر کی دو پشتوں کے بعد حضرت اورنگ زیبؒ جیسا خدا ترس فرمانروا مغلوں میں پیدا ہوا، یہی وہ طریقۂ کار ہے، جو علماء کو آج اختیار کرنا چاہئے، مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک، علماء کا کردار یہ ہونا چاہئے کہ وہ براہِ راست سیاست کے دلدل میں نہ اتریں، سیاسی فوائد سے اپنے آپ کو دور رکھیں، ان کا استغناء، ان کی بے نیازی اتنی واضح ہو کہ کسی کو ان پر انگلی اٹھانے کی جرأت نہ رہے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ حکومت سے خواہ مخواہ کا تصادم (جو تشدد پر مبنی ہو) مول نہ لیا جائے، کہ اس سے فائدہ یا تو نہیں ہوتا ہے یا کم ہوتا ہے اور نقصاد کہیں زیادہ، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

''إن اللہ رفیق یحب الرفق ویعطی علی الرفق ما لا یعطي علی العنف'' (سنن أبي داؤد، کتاب الأدب، باب في الرفق، حدیث نمبر: ۴۸۰۹، سنن ابن ماجۃ، کتاب الأدب، باب الرفق، حدیث نمبر: ۳۸۱۹، صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، حدیث نمبر: ٦٧٦٦)

''اللہ تعالیٰ نرم خو ہیں اور نرم خوئی کو پسند فرماتے ہیں اور نرم روئی پر وہ عطا فرماتے ہیں، جو سخت روی پر عطا ہیں فرماتے''

رسول اللہ ﷺ کے اسوہ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مقدس مذہبی مقامات کو بے احترامی سے بچانے اور اس کے تقدس کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے، رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ کعبۃ اللہ کی تعمیر بناء ابراہیمی پر ہو، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ اقتدار میں اس خواہش کی تعمیل فرمائی؛ لیکن حجاج بن یوسف کو یہ بات کہاں گوارہ ہوسکتی تھی کہ اس کے مخالف شخص کی تعمیر باقی رہے؛ اس لئے اس نے دوبارہ کعبہ کو زمانۂ جاہلیت کی بنیاد پر تعمیر کر دیا، پھر عباسیوں نے جب اسے بناؤ نبوی پر تعمیر کرنا چاہا تو امام مالکؒ نے یہ کہہ کر منع فرمایا کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو کعبۃ اللہ بادشاہوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن جائے گا اور کعبہ کی حرمت دلوں سے کم ہوجائے گی، اسی طرح عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بعد سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے، ان کی خلافت برحق تھی اور جمہور صحابہ ان کے ساتھ تھے، اسی دور میں شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت قائم ہوگئی اور یہ بات بالکل واضح تھی کہ مستقبل میں ٹکراؤ کی نوبت آئے گی، اسی پس منظر میں سیدنا حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ نے اپنا دار الخلافہ مدینہ سے کوفہ منتقل کر دیا کہ مدینہ کی حرمت پامال نہ ہو، خود رسول اللہ ﷺ نے بھی فتح کے موقع سے پوری احتیاط برتی کہ حرم کے تقدس پر آنچ نہ آئے، یہ اور اس طرح کے شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد و مدارس اور مذہبی مقامات کو ایسی صورتِ حال سے بچانا چاہئے، جس میں ان کی بے حرمتی ہو؛ بلکہ قرآن نے تو دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کی بھی بے حرمتی کو ناپسند کیا ہے، (**الحج: ۴۰**) بلکہ قرن اوّل میں مجاہدین کو اس بات کی ہدایت کی جاتی تھی کہ دشمن پر حملہ کرتے ہوئے ان کے مذہبی پیشواؤں اور مذہبی مقامات کی پناہ لینے والوں کو نشانہ نہ بنایا جائے، پھر کیا اس بات کا جواز ہوسکتا ہے کہ ہم تصادم کے ماحول میں مساجد کو اپنی پناہ گاہ بنائیں اور بالواسطہ ان کی بے حرمتی کا باعث بنیں؟

پھر اس پہلو پر بھی غور کریں کہ جو عمل اسلام اور مسلمانوں کی بدنامی کا باعث بن سکتا ہو، خواہ اس کے اسباب میں معاندین کی عداوت بھی شامل ہو تو کیا ایسا عمل جائز ہوگا؟ رسول اللہ ﷺ کی نبوت سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں کعبۃ اللہ کی عمارت کی تجدید ہوئی؛ لیکن کچھ تو وسائل کی کمی اور کچھ

قریش کی نخوت کی وجہ سے تعمیر میں تبدیلی کی گئی، حطیم کا حصہ باہر ہوگیا، دروازے دو کے بجائے ایک ہوگئے، دروازے کی سطح قدآدم اونچی کردی گئی؛ تاکہ عام لوگ اندر داخل نہ ہوسکیں، حضور ﷺ فتح مکہ کے بعد چاہتے تھے کہ یہ عمارت بناء ابراہیمی پر پھر سے تعمیر ہوجائے، مگر آپ ﷺ نے یہ سوچ کر چھوڑ دیا کہ اس کی وجہ سے عرب بدگمان نہ ہوجائیں اور وہ یہ نہ سوچنے لگیں کہ مسلمان اب کعبہ کے تقدس کو بھی پامال کرنا چاہتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ بعض جائز؛ بلکہ مستحب کام کو بھی دین اور امت کو بدنامی سے بچانے کے لئے ترک کیا جاسکتا ہے، آج امت کو اور بالخصوص علماء اور مذہبی قائدین کو ا جہتوں پر ضرور نظر رکھنی چاہئے، ورنہ نسبتاً چھوٹی برائی کو دور کرنے کی کوشش اس سے بڑی برائی لانے کا سبب بن جاتی ہے!

خانگی تشدد انسداد ایکٹ مغربی ایجنڈا کی تکمیل

انسان کا علم چوں کہ ناقص ہے؛ اسلئے اس کا بنایا ہوا قانون بھی اکثر افراط وتفریط پر مبنی ہوتا ہے؛ اسی لئے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین میں بار بار تبدیلی کی نوبت آتی ہے اور بہت سب دفعہ انصاف اور اعتدال کو شرمسار ہونا پڑتا ہے، اس کی مثال ہمارے ملک کا وہ قانون ہے، جو جہیز کے مطالبہ کو قابل سرزنش جرم قرار دیتا ہے، اس قانون کا مقصد یقینا بہتر ہے کہ عورتوں کو جہیز کے سلسلہ میں ہراسانی سے بچایا جائے؛ لیکن قانون کی تفصیلات کچھ اس طرح کی ہیں کہ گویا عورت تشدد کے دعویٰ میں جھوٹ نہیں بول سکتی اور مرد ہی ہمیشہ مجرم ہوا کرتا ہے، نیز اس قانون نے ملزم کو مجرم کا درجہ دے دیا ہے، جرم کے پایہ ثبوت تک پہنچنے سے پہلے ہی اس پر سزا کا نفاذ شروع ہوجاتا ہے اور پولیس کی تذلیل کے علاوہ جیل کی ہوا بھی سہنی پڑتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آخری مرحلہ میں عدالت شوہر کو باعزت بری کردیتی ہے، سوال یہ ہے کہ اس باعزت براءت سے پہلے جو اس کی بےعزتی اور رسوائی ہوچکی ہے، اس کا مداوا کیا ہے؟ —— یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قانون نے بہت سے باعزت اور شریف لوگوں کو بدنام اور رسوا کیا ہے اور بعض واقعات تو ایسے بھی سامنے آئے ہیں کہ اس رسوائی کے صدمہ سے غیرت منداور باحیا لوگوں کی جان تک چلی گئی ہے۔

اسی طرح کا ایک قانون ''خانگی تشدد انسداد ایکٹ برائے خواتین'' کے نام سے بنا ہے، جو دونوں ایوانوں سے گذرنے کے بعد ۱۳ / دسمبر ۲۰۰۵ء کو صدر جمہوریہ کی دستخط کے بعد پاس ہوچکا ہے اور اکتوبر ۲۰۰۶ء سے اسے نافذ العمل قانون کا درجہ حاصل ہوگیا ہے، اندیشہ ہے کہ جہیز سے متعلق قانون کا جو غلط استعمال ہورہا ہے، اس قانون کا اس سے بھی زیادہ غلط استعمال ہوگا، باعزت لوگ بےقصور اس کا شکار بنیں گے، قانون کے غلط استعمال سے قطع نظر خود اس قانون کی کئی دفعات محل نظر ہیں۔

اسلام نے عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور چوں کہ خاندانی زندگی میں انسان کا سابقہ، بیوی سے زیادہ پیش آتا ہے اور تعلقات میں نشیب وفراز آتا رہتا ہے؛ اس لئے خاص طور پر بیوی کے ساتھ اچھے برتاؤ کی تلقین کی گئی ہے، اس سلسلہ میں قرآنِ مجید نے ایک جامع اور اصولی تعبیر اختیار کی ہے:

{ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَى أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا } (النساء : ۱۹)

'' بیویوں کے ساتھ بہتر طور پر زندگی گذارو، اگر تم کو وہ ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اسی میں بہت سا خیر پیدا فرمادے''

''معاشرت بالمعروف''، یعنی بہتر طور پر زندگی گذارنا ایک ایسا لفظ ہے، جس میں ہر طرح کا حسن سلوک شامل ہے اور ہر طرح کی بدسلوکی سے بچنا اس میں داخل ہے، کوئی شخص اپنی بیوی کو گالی گلوج کرے، مار پیٹ کرے، طعنہ دے، ذہنی طور پر تکلیف پہنچائے تو یہ معاشرت بالمعروف نہیں ہوسکتی، معاشرت بالمعروف تو اسی وقت ہوگی، جب بیوی محسوس کرے کہ وہ محبت واُلفت، چاہت اور سکون واطمینان کے سایہ میں زندگی گذار رہی ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ عورتوں سے بہتر سلوک کرنے کے سلسلہ میں میری وصیت قبول کرو، اسی ارشاد میں آپ ﷺ نے عورتوں کی زودرنجی اور جذباتیت کے پس منظر میں بھی فرمایا کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے، اگر تم اس کو سیدھا کرنا چاہوگے تو توڑ دوگے، (صحیح مسلم مع شرح نووی: ۱۰/ ۶۸) مقصد یہ ہے کہ اگر عورتوں کی طرف سے زودرنجی کے واقعات پیش آئیں تو اسے برداشت کرجاؤ، آپ ﷺ نے بہتر اخلاق کے لئے بیوی ہی کو معیار بنایا اور فرمایا تم میں سے بہتر وہ ہے، جس کا سلوک اپنی عورتوں کے ساتھ بہتر ہو: ''خيار كم خيار كم لنساءهم'' (ترمذی: ۴/ ۳۲۵) ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے اس کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ تم سب سے بہتر سلوک کرنے والا ہوں: ''أنا خير كم لأهلي'' (سنن ابن ماجۃ: ۱/ ۶۳۶) اسی طرح آپ ﷺ نے ماں باپ کے بارے میں فرمایا کہ اس کے قدموں کے نیچے جنت ہے اور بیٹیوں کے بارے میں ارشاد ہوا کہ جو محبت کے

ساتھ ان کی پرورش کرے گا، وہ جنت میں مجھ سے اتنا قریب رہے گا، جتنی قریب دونوں انگلیاں ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ مرد کو صدر خاندان بنایا گیا ہے: { وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَة } (البقرۃ: ۲۲۸) اور یہ اعزاز مردوں کو اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ فیصلہ کی، بھلے بُرے کو سمجھنے کی اور خاندان کی حفاظت ونگداشت کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں اور اسی پر خاندان کی پرورش کے تمام اخراجات کی ذمہ داری بھی ہوتی ہے:

{ الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ
وَبِمَاأَنفَقُوامِنْ أَمْوَالِهِمْ }		(النساء : ۳۴)

اس پہلو سے شریعت نے مردوں اور عورتوں کی ذمہ داریوں میں فرق رکھا ہے۔

ان میں سے ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ مرد کی طرف سے اگر زیادتی ہوتو عورت عدالتی چارہ جوئی کے ذریعہ اس کو سزا دلوا سکتی ہے اور اگر عورت کی طرف سے زیادتی ہوتو کچھ خاص شرائط وحدود کے ساتھ مرد اس کی تنبیہ کرسکتا ہے، ان شرائط وحدود کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر عورت کی طرف سے کوئی کھلی ہوئی زیادتی نہ ہو —— جیسے: شوہر پر ہاتھ اٹھانا، اس کو گالی گلوج کرنا یا ایسے فعل کا مرتکب ہونا ،جس سے اس کی عزت و پاک دامنی مشکوک ہوتی ہو یا کسی شرعی اور طبعی عذر کے بغیر بلاوجہ شوہر کی طبعی صنفی ضرورت کی تکمیل سے انکار کرنا —— تو مرد کے لئے کسی بھی صورت عورت پر ہاتھ اٹھانا جائز نہیں، (دیکھئے: بدائع الصنائع: ۲/ ۳۳۴) اگر زیادتی ہوتو شوہر کو چاہئے کہ پہلے پند ونصیحت سے کام لے، اس سے کام نہ چلے تو چند دنوں اپنی خواب گاہ میں رکھتے ہوئے ترک تعلق کرلے، اس کے باوجود اصلاح نہ ہوسکے اور بار بار نافرمانی کا ارتکاب کرتی ہوتو شوہر اس کی معمولی سرزنش بھی کرسکتا ہے، (النساء: ۳۳) مگر اصلاح وفہمائش میں اسی ترتیب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے، چنانچہ فقہ اسلامی پر مرتب ہونے والی عظیم الشان انسائیکلو پیڈیا میں ہے:

”جمہور فقہاء —— حنفیہ، مالکیہ، حنابلہ اور شافعیہ —— کی رائے ہے کہ شوہر بیوی کی نافرمانی کی وجہ سے اس کی تادیب آیت میں مذکور ترتیب کے ساتھ کرسکتا ہے، یعنی پہلے سمجھائے، پھر ترک تعلق کرے، پھر سرزنش

کرے'' (الموسوعۃ الفقھیہ: ۴۰/ ۳۰۱، مادہ : نشوز)

پھر جسمانی تادیب کے بارے میں بھی آپ ﷺ نے صراحت فرمائی کہ عورتوں کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور ان کو تکلیف دہ مار پیٹ نہ کرو: ''فاضربوھن ضربا غیر مبرح'' (صحیح مسلم، عن جابر بن عبد اللہ ص، کتاب الحج، باب حج النبي ﷺ، حدیث نمبر: ۳۰۰۹) تکلیف دہ مار پیٹ سے مراد یہ ہے کہ خون نکل آئے، جان یا عضو کی ہلاکت کا اندیشہ ہو، اس سے شکلاً کوئی عیب پیدا ہو جائے، جسم پھول جائے، پھٹ جائے، یا اس پر نشان پڑ جائے؛ (الموسوعۃ الفقھیہ: ۴۰/ ۲۹۸) اسی لئے بعض فقہاء نے صراحت کی ہے کہ کوڑے سے، لاٹھی سے یا لکڑی سے بیوی کو مارنا جائز نہیں؛ بلکہ مسواک یا رومال یا زیادہ سے زیادہ ہاتھ سے مار سکتا ہے، (دیکھئے: تفسیر قرطبی: ۵/ ۱۷۳) گویا مارنا مقصود نہیں ہے؛ بلکہ عورت کو احساس دلانا مقصود ہے کہ اس کی تنبیہ کی گئی ہے۔

تنبیہ کے سلسلہ میں یہ بات بھی فقہاء نے واضح کر دی ہے کہ اس کا مقصد عورت کی توہین یا اس کو تکلیف پہنچانا نہیں ہے؛ بلکہ اصلاح مقصود ہے؛ اسی لئے اس کو تعزیر کے بجائے ''تادیب'' کا نام دیا گیا ہے، چنانچہ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی عورت کے بارے میں اندازہ ہو کہ سرزنش سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا اور اس کی اصلاح نہیں ہو سکے گی تو پھر اس پر ہاتھ اٹھانا درست نہیں؛ کیوں کہ مقصود اصلاح ہے نہ کہ انتقام اور اپنی آتش غضب کو بجھانا:

''وأما الضرب، فلا یجوز إلا إذا ظن إفادتہ لشدتہ''

(دیکھئے: شرح کبیر و حاشیہ دسوقی: ۲/ ۲۴۳)

اسی طرح فقہاء نے اس کی بھی صراحت کی ہے کہ اگر کوئی عورت ایسی درشت مزاج اور سخت جان ہو کہ سخت مار پیٹ کے بغیر اس کی اصلاح ممکن نہ ہو تب بھی اس طرح مار پیٹ کرنا جائز نہیں ہوگا:

''لا یجوز ضرب المبرح ولو علم أنھا لا تترک النشوز إلا بہ''

(الموسوعۃ الفقھیہ: ۴۰/ ۲۹۹، مادہ: نشوز)

واقعہ ہے کہ قرآن کی ان ہدایات اور فقہاء کی ان تصریحات میں بہت ہی توازن اور اعتدال ہے؛ لیکن تشدد انسداد سے متعلق مذکورہ قانون شوہر کو کسی بھی درجہ میں بیوی کی تادیب کا اختیار نہیں دیتا اور اسے ''تشدد'' سمجھتا ہے۔

شوہر کے قوّام اور صدر خاندان ہونے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ تمام مالی ذمہ داریاں مرد پر رکھی گئی ہیں، عورتوں کو ان سے بریٔ الذمہ رکھا گیا ہے؛ اسی لئے عورتوں کو ہدایت دی گئی کہ وہ گھر میں رہیں؛ تاکہ اپنے بچوں کی صحیح طور پر پرورش کرسکیں: {وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ} (الأحزاب: ۳۳) کسبِ معاش اور دوسری بیرونی ضروریات کی تکمیل مرد کے ذمہ ہے، اس میں مرد وعورت دونوں کی بھلائی ہے، مردوں کو گھر کی داخلی ذمہ داریوں سے فراغ حاصل ہوتا ہے، عورت کسبِ معاش کی اُلجھنوں سے نجات پاتی ہے، بچوں کو ماں کی ممتا ملتی ہے اور باپ اس کی ضروریات فراہم کرتا ہے، یہ عورت کی تحقیر نہیں؛ بلکہ اس کی رعایت ہے اور اس طرح عورت کو باندی نہیں بنایا گیا ہے؛ بلکہ اس کو ''گھر کا ملکہ'' قرار دیا گیا ہے، اس میں خاندانی نظام کا بقاء ہے اور اس سے بہت سی سماجی مصلحتیں متعلق ہیں۔

یہ قانون اس بات کو بھی زیادتی قرار دیتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو باہر کام کرنے اور ملازمت، کاروبار وغیرہ میں لگنے سے روکے یا اسے کسی فرد سے تعلق رکھنے سے باز رکھے، اس کے علاوہ طلاق شدہ، خلع شدہ اور داشتہ کو بھی بعض مسائل میں بیوی کا درجہ دیا گیا ہے، یہ ساری باتیں نہ صرف اسلامی تعلیمات کے مغائر ہیں؛ بلکہ مشرقی اور اخلاقی اقدار کو بھی پامال کرنے والی ہیں، افسوس کہ ہمارا آزاد ملک اور اسی طرح دنیا کے دوسرے ترقی پذیر ممالک مغربی قوموں اور ترقی یافتہ طاقتوں کے ایسے دباؤ میں ہے کہ وہ مغرب کی طرف سے مسلط ہونے والے ہر ایجنڈے پر لبیک کہتے جاتے ہیں اور اس کے حقیقت پسندانہ تجزیہ سے بھی قاصر ہیں، ذہن وفکر کی یہ غلامی شاید جسم اور زمین کی غلامی سے بھی بڑھ کر ہے۔

شمع فروزاں

نئے مسائل

اسلامک بینکنگ

اسلام دینِ فطرت ہے، اس لیے اس نے انسان کی فطری ضرورتوں کا گلا گھونٹنے کی کوشش نہیں کی ہے، بلکہ وہ ان ضرورتوں کو اخلاقی حدود کے اندر پوری کرنے کی تعلیم دیتا ہے، انسان کی ضرورتوں میں سرمایہ بھی ہے اور زندگی کے بیشتر ضروریات وہ سرمایہ ہی کے واسطہ سے حاصل کرتا ہے، وہ تاجروں کو پیسے دیتا ہے اور سامان خریدتا ہے، کرایہ دے کر مکان و دکان حاصل کرتا ہے، اسے علاج کے لیے فیس ادا کرنی پڑتی ہے، وہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھی پیسوں کا محتاج ہوتا ہے، سفر کی ضروریات پیسوں سے پوری ہوتی ہیں، غرض کہ قدم قدم پر انسان سرمایہ کا محتاج ہے، اسی لیے قرآن مجید نے اسے ''قوامِ حیات'' یعنی زندگی کے بقاء کا سامان قرار دیا ہے، اسی طرح قرآن نے مال کو خیر {وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ}(البقرہ: ۲۷۳) اور فضل {وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا}(الجمعہ: ۱۰) سے تعبیر کیا ہے، دنیا کے شاید ہی کسی مذہب میں مال و دولت کے لیے اتنی بہتر تعبیر اختیار کی گئی ہو۔

سرمایہ کے سلسلہ میں انسان کے لیے ایک ضرورت اس کی حفاظت کی ہے، گذشتہ زمانہ میں لوگ سونے اور چاندی کے سکّوں کو زمین میں دفن کیا کرتے تھے، اس لیے کہ اس وقت دولت کی حفاظت کا اس سے بہتر اور کوئی راستہ نہیں تھا، زمین کے اندر جو دفینے نکلا کرتے تھے، اور کہیں کہیں اب بھی نکلا کرتے ہیں، وہ یہی محفوظ کیا ہوا سرمایہ ہے، جب کاغذی کرنسی کا رواج ہوا تو اب اس طرح سرمایہ کی حفاظت دشوار ہوگئی —— سرمایہ سے متعلق دوسری ضرورت اس میں بڑھوتری کی ہے، اگر انسان اپنے سرمایہ میں اضافہ نہیں کر سکے تو کتنا بھی مالدار ہو مختصر مدت میں اس کا سرمایہ ختم ہو جائے گا، اس لیے قدیم زمانہ سے یہ رواج رہا ہے کہ سرمایہ دار اپنا سرمایہ محنت کرنے والوں کے حوالہ کرتے ہیں، اور نفع آپس میں تقسیم ہو جاتا ہے، کاغذی کرنسی کے مروّج ہونے کے بعد اس کی

ضرورت اور بھی بڑھ گئی، چونکہ سونا اور چاندی بذاتِ خود زر ہیں، اسی لیے اس کی قدر میں استحکام پایا جاتا ہے، بخلاف کاغذی کرنسی کے، کہ حقیقت میں یہ زر نہیں ہے، اس کو سماجی اور معاشی ضرورت کے تحت زر فرض کرلیا گیا ہے، گویا یہ ایک فرضی کرنسی ہے، اسی لیے اس کی قدر میں استحکام نہیں ہے اور مسلسل انحطاط پیدا ہوتا رہتا ہے، آج سے دس سال پہلے پانچ ہزار روپیہ میں ایک تولہ سونا لیا جاسکتا تھا، دس سال مزید پیچھے چلے جایئے تو اسی رقم میں پانچ تولے لیئے جاسکتے تھے، اور آج اس رقم میں ایک تولہ سونا بھی خرید نہیں کیا جاسکتا، ان حالات میں اگر سرمایہ کو نفع آور نہ بنایا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس کی قدر میں اضافہ نہیں ہوگا، بلکہ اس کی قدر گرتی چلی جائے گی، اور اپنی سابق قدر کے مقابلہ صفر کے قریب پہونچ جائے گی، یہ دوہری ضرورت ہے، جو موجودہ دور میں بینکنگ نظام کے وجود میں آنے اور ارتقاء کی منزلیں طے کرنے کا باعث ہوا۔

پھر ذرائع ابلاغ کی ترقی نے اس وقت پوری دنیا کو ایک گاؤں میں تبدیل کردیا ہے، اس قربت نے تجارت اور کاروبار کے فروغ میں نہایت ہی مؤثر اور اہم کردار ادا کیا ہے، تجارت جب کسی دور کے علاقہ سے ہو تو ایک اہم مسئلہ رقوم کی منتقلی اور طمانینت کا بھی درپیش ہوتا ہے، بینک ایسی تجارتوں میں بھی واسطہ بنتا ہے، اس طرح بینک اس وقت متنوع ضروریات کو پوری کرتے ہیں، اور موجودہ صنعتی اور تجارتی پھیلاؤ کے عہد میں نہایت اہم ضرورت بن چکے ہیں، بدقسمتی سے اتنا مفید معاشی ادارہ ان لوگوں کی فکر وخیال کے چنگل میں پروان چڑھا ہے، جو نہ صرف سود کو جائز کہتے ہیں؛ بلکہ سود ان کے قومی خمیر کا حصہ رہا ہے، میری مراد یہودیوں سے ہے، حالانکہ تورات میں بھی سود کو منع کیا گیا ہے، اور کوئی بھی مذہب اس کو روا نہیں رکھتا؛ لیکن یہودی قوم کا مزاج شروع سے یہ رہا ہے کہ پہلا درجہ دولت کا ہے، اس کے بعد ہی خدا کا درجہ ہے، اگر دولت بٹورنے اور حرص وہوس کو پوری کرنے میں کہیں خدا کا حکم آڑے آتا ہو تو یہود حکمِ خداوندی کو کنارے کردیتے ہیں۔

سود بنیادی طور پر غریبوں کا استحصال ہے، سود کی وجہ سے دولت مندوں اور غریبوں کے درمیان معاشی فاصلہ بڑھتا جاتا ہے؛ اس لیے تقریباً تمام ہی مذاہب میں سود کو منع کیا گیا ہے، غور کیجئے تو سود نظام فطرت کے بھی خلاف ہے، فطری نظام یہ ہے کہ سرمایہ کے ساتھ جب تک محنت شامل نہ ہو، وہ نفع آور نہیں ہوتا؛ کیوں کہ سرمایہ خود سرمایہ پیدا نہیں کرسکتا، سرمایہ کے ساتھ جب

محنت شامل ہوتی ہے، تو نفع حاصل ہوتا ہے، تاجر اسبابِ تجارت پر محنت کرتا ہے، دوڑ دھوپ کرتا ہے، وقت لگاتا ہے، تب اسے —— مثال کے طور —— پر ایک لاکھ پر دس ہزار کا نفع حاصل ہوتا ہے، اگر اس نے ایک لاکھ روپئے اپنی تجوری میں بند رکھے ہوئے ہوتے تو اس میں ایک روپیہ کا بھی اضافہ نہیں ہوتا، سودخوار اس نظامِ فطرت کے خلاف صرف پیسوں سے پیسے حاصل کرتا ہے، وہ اپنے پیسے تجوری میں محفوظ کرنے کے بجائے ''الف'' کے پاس محفوظ کراتا ہے، اور اس سے نفع کا مطالبہ کرتا ہے۔

دوسرا فطری اُصول یہ ہے کہ کاروبار میں نہ نفع متعین ہوتا ہے نہ نقصان، اس میں نفع کی امید بھی ہوتی ہے اور نقصان کا خطرہ بھی، بھلے ہی یہ ہوسکتا ہے کہ کسی ایک پہلو کا امکان زیادہ ہو، اسی لیے تجارت میں نفع کی امید کے ساتھ ساتھ نقصان کے خطرہ کو بھی قبول کیا جاتا ہے؛ لیکن سودخوار نفع کا تیقن چاہتا ہے اور نقصان کے خطرہ کو قبول کرنا نہیں چاہتا، اس میں یقیناً دوسرے فریق کا استحصال ہوگا، یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ کسی بٹائی دار کو اپنا کھیت حوالہ کریں، اور طے کردیں کہ نفع ہو یا نقصان ، تم کو اتنا غلّہ دینا ہی ہوگا، اب جس شخص کے پاس زمین نہیں ہے، وہ مجبوراً نفع کی امید پر آپ کی شرط کو قبول کرلے گا ؛ لیکن عین ممکن ہے کہ اگر قسمت نے یاوری نہیں کی تو آپ کے گھر کو دس کنٹل چاول آجائے اور قرض کے بوجھ سے دب کر وہ غریب کسان خودکشی کرلے۔

موجودہ بینکنگ نظام میں بینک کو براہِ راست تجارت کی اجازت نہیں دی گئی ہے، ہاں اسے اس بات کی اجازت ہے کہ ضرورت مندوں کو قرض دے، اور اس پر متعینہ شرح کے مطابق سود وصول کرے اور پھر اسی سود کا ایک حصہ رقم جمع کرنے والوں پر تقسیم کردے، اس معاملہ میں نہ بینک کا کھاتہ دار نقصان کا خطرہ قبول کرتا ہے اور نہ خود بینک اس خطرہ کو قبول کرنے کا روادار ہوتا ہے ، ظاہر ہے کہ یہ نفع آوری کا غیر فطری طریقہ ہے اور اس میں مقروضوں کا استحصال ہے، بعض لوگوں کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ جو لوگ بینک سے قرض لیتے ہیں، وہ بھی تو بزنس کے ذریعہ نفع حاصل کرتے ہیں اور اسی کا کچھ حصہ بینک کو ادا کرتے ہیں؛ اس لیے یہ بھی ایک طرح کی تجارت ہی ہے ؛ لیکن یہ محض مغالطہ ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ مقروض کو قرض سے نفع پہونچے ، اور اس کی تجارت اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے ؛ لیکن بینک بہر قیمت نفع وصول کرلیتا ہے، راقم الحروف

خود بعض ایسے حضرات سے واقف ہے، جو لاکھوں روپے زکوۃ کے طور پر ادا کرتے تھے اور بینک سے قرض لینے کی وجہ سے آج زکوۃ کے مستحق بن چکے ہیں، اس کے علاوہ بہت سے قرض تجارتی مقاصد کے لیے نہیں لئے جاتے؛ بلکہ ایسی ضرورتوں کے لیے لیئے جاتے ہیں، جن سے کوئی مالی نفع واپس نہیں آتا، جیسے علاج، لڑکیوں کی شادی، رہائشی مکان، ذاتی استعمال کی گاڑی وغیرہ، بینک اس سے بھی اپنا نفع وصول کرتا ہے؛ اس لیے بینک کے موجودہ نظام کو تجارت کا نام دینا محض دھوکہ دینا ہے۔

اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے اور تجارت کو جائز رکھا ہے، اور ضرورت مندوں کے لیے سودی قرض فراہم کرنے کی تلقین کی ہے؛ اس لیے اسلامی خطوط پر جو بینک قائم ہوگا وہ براہِ راست تجارت کرنے اور نفع آور یونیٹوں میں سرمایہ کاری کرنے کا مجاز ہوگا، اور بنیادی طور پر سرمایہ کاری کی چار صورتیں ہوں گی: ایک مضاربت، یعنی بینک سرمایہ فراہم کرے گا، کاروباری مہارت رکھنے والا شخص اس سرمایہ کو کاروبار میں لگائے گا، اور جو نفع ہو متعینہ تناسب کے مطابق دونوں میں تقسیم ہو جائے گا، دوسری صورت شرکت کی ہوگی کہ سرمایہ کا ایک حصہ بینک لگائے اور ایک حصہ خود محنت کرنے والا لگائے، اس مشترک سرمایہ پر جو نفع ہو، وہ طے شدہ تناسب کے مطابق تقسیم ہو جائے، تیسری صورت اجارہ (Lease) کی ہے، اجارہ سے مراد ہے کسی شئ پر اپنی ملکیت باقی رکھتے ہوئے اس کو کرایہ پر دینا، اور اس کا کرایہ وصول کرنا، خواہ مکانات ہوں، مشنریز ہوں، گاڑیاں ہوں، وغیرہ، چوتھی صورت 'مرابحہ' کی ہے، یعنی کسی شخص یا کمپنی کو کچھ اشیاء کی ضرورت ہو، بینک انہیں خرید کر زیادہ قیمت میں ادھار فروخت کرے، بنیادی طور پر سرمایہ کاری کی یہ چار جائز صورتیں ہیں، ان میں پہلی دونوں صورتیں زیادہ نفع آور ہیں؛ لیکن ان میں نقصان کا خطرہ بھی ہے، اور بعد کی دونوں صورتوں میں نفع نسبتاً کم ہوگا، لیکن نقصان کا خطرہ بھی کم ہے۔

بینک کاری کے اس اسلامی نظام کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے کاروبار کو فروغ ہوگا، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بینک تجارت کے لیے سرمایہ فراہم کرے گا، اور روزگار کے مواقع بڑھیں گے، دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سرمایہ کاروں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہونچے گا، کیوں کہ ابھی تو بینک کے نفع کا ایک محدود حصہ ہی کھاتہ داروں میں تقسیم کیا جاتا ہے، باقی نفع بینک کے نفع کے مالکان اور نیشنلائزڈ بینک

ہوں تو حکومت کی طرف لوٹ جاتا ہے؛ لیکن اسلامی بینک میں پورا نفع سرمایہ کاروں میں تقسیم ہوتا ہے، چند سال پہلے جب میں ملیشیا گیا اور وہاں کے اسلامک بینک جانے کا اتفاق ہوا تو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ عام بینک تو زیادہ سے زیادہ چودہ فیصد نفع دیتے ہیں، اور اسلامک بینک کا نفع بیس فیصد کے قریب پہونچ گیا ہے، یعنی تقریباً ایک تہائی کا فرق ہے، پھر ایک انسانی پہلو بھی ہے کہ اسلامک بینکنگ نظام میں غریبوں کا استحصال نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ قرض لینے والے اس نوبت پر آ گئے ہوں کہ انہیں خودکشی کرنی پڑی ہو، اور سب سے اہم اس کا روحانی پہلو ہے، سود کی حرمت مذاہب کی مشترک تعلیم؛ اس لیے کسی قوم میں سودخواری کی خو کا پیدا ہو جانا اچھی بات نہیں ہے، اس کا ایک اخلاقی پہلو یہ ہے کہ جب کسی معاشرہ میں سود کا لین دین بڑھ جاتا ہے، تو اس میں خودغرضی پیدا ہو جاتی ہے، وہ اپنے مجبور سگے بھائی کو بھی نفع کے بغیر قرض دینے کو تیار نہیں ہوتا، بلکہ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض دفعہ اگر اپنے والد کو کوئی رقم دی تو جائیداد میں زیادہ مقدار کا طلب گار ہو گیا کہ یہ رقم ہم نے اتنی مدت پہلے دی تھی، اب تک اگر یہ کاروبار میں لگی ہوتی تو کتنا نفع ہو جاتا؟ اس طرح کی سوچ معاشرہ میں سودخواری کے مروّج ہو جانے کا نتیجہ ہے۔

ہمارے موجودہ وزیر اعظم خود ماہر معاشیات ہیں اور اس میدان میں امتیازی حیثیت کے مالک ہیں، ان کی خواہش ہے کہ ہندوستان میں اسلامک بینکنگ شروع کی جائے، تاکہ جو لوگ موجودہ بینک کے نظام کو درست نہیں سمجھتے وہ اپنا سرمایہ اس شعبہ میں لگا سکیں؛ لیکن بدقسمتی سے وزارتِ خزانہ نے اس معقول تجویز پر کوئی توجہ نہیں دی، اب وزیر اعظم نے اس سلسلہ میں ایک کمیٹی بنائی ہے، جو ہندوستان میں اسلامک بینکنگ کے امکانات پر غور کرے گی، ابھی اس کمیٹی کا اعلان ہی ہوا تھا کہ بی، جے، پی والوں کی طرف سے چیخ و پکار شروع ہو گئی کہ اس سے ملک کی ایک اور تقسیم کی راہ کھل جائے گی، ایک تو بی، جے، پی کی فرسودہ اور فرقہ وارانہ ذہنیت لاعلاج ہے، جسے بدلا نہیں جا سکتا؛ کیوں کہ ایسی بات انہوں نے اس لیے نہیں کہی ہے کہ وہ ملک کے بہی خواہ ہیں، بلکہ اس کا مقصد ووٹ بٹورنا ہے؛ اس لیے جب تک ووٹ کی ضرورت ہے، فرقہ پرستی ان کے لیے ایک سیاسی مجبوری ہے؛ لیکن خود حکومت کو بھی چاہیے کہ ایسے مسائل کو مذہبی رنگ میں پیش کرنے کے بجائے عمومی حیثیت میں پیش کیا جائے، مثلاً اس کو اسلامک بینکنگ کے بجائے غیر سودی

بینکنگ کا نام دیا جائے، تو شاید اس طرح کے لایعنی اعتراضات کا سامنا نہ ہو، غرض سودی بینک کاری صرف مسلمانوں ہی کا مسئلہ نہیں ہے ؛ بلکہ یہ پوری انسانیت کا مسئلہ ہے، سود سے صرف مسلمانوں ہی کا استحصال نہیں ہوتا بلکہ تمام انسانوں کا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جن ملکوں میں اسلامک بینک قائم ہے، وہاں غیر مسلم حضرات بھی ایسے بینک کو ترجیح دیتے ہیں، اور بہت سے غیر مسلم بھائیوں کا سرمایہ بھی ان بینکوں میں مصروف ہتا ہے، جناب ایڈوانی اپنے آپ کو ایک مذہبی شخص خیال کرتے ہیں، اگر وہ اس بات کو پیش نظر رکھتے کہ دنیا کے کسی بھی مذہب میں سود کو پسند نہیں کیا گیا ہے، اور اس کا جو اخلاقی پہلو ہے، یعنی خود غرضی اور حرص و ہوس کا پیدا ہو جانا اور ایثار و اعانت کے جذبہ سے محروم ہو جانا، یہ تمام ہی مذاہب میں ناپسندیدہ باتیں ہیں، تو شاید وہ اس تجویز پر ایسا نامعقول طرز عمل اختیار نہیں کرتے، حقیقت یہ ہے کہ اسلامک بینکنگ نظام مسلمانوں ہی کے لیے نہیں پوری انسانیت کے لیے رحمت ہے، ہمارے ملک کے لیے اس میں ایک فائدہ کا پہلو اور بھی ہے کہ بہت سے مسلمان اپنے عقیدہ کے مطابق موجودہ بینکوں میں اپنی رقم 'ڈپازٹ' نہیں کراتے، اگر غیر سودی بینک بھی قائم ہو جائیں، تو مسلمانوں کا یہ سرمایہ بھی بینک کے ہاتھ میں آئے گا، حکومت کے وسائل میں اضافہ ہوگا، نیز اس سرمایہ کو کاروباری ترقی میں استعمال کیا جا سکے گا —— خدا کرے کہ ہمارے ملک میں ایسے بینکنگ نظام کو فروغ ہو، اور لوگوں کے لیے سود کی لعنت سے بچنے کی راہ ہموار ہو!

۱۶/فروری ۲۰۰۷ء

کال سنٹر کی ملازمت — لمحۂ فکریہ

ہمارا ملک ہندوستان کئی جہتوں سے خوش قسمت ملک ہے ، یہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے ، اس ملک کو آزاد ہوئے ساٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے ، اس طویل عرصہ میں سوائے سال دوسال کی ایمرجنسی کے کبھی جمہوریت کا اغوا نہیں کیا جاسکا ، جیسا کہ پڑوسی ملکوں میں آمرانہ طاقتیں کرتی رہتی ہیں ، کثیر مذہبی ، کثیر تہذیبی ، کثیر نسلی اور کثیر لسانی ملک ہونے کے اعتبار سے اس کا شمار دنیا کے دو تین گنے چنے ملکوں میں سے ہے ، اس وقت اس کی ایک امتیازی حیثیت افرادی صلاحیت اور ہنر مند کارکنوں کی فراوانی ہے ؛ چنانچہ ابھی مشرق بعید سے لے کر امریکہ تک پوری دنیا میں ہندوستان کے سائنسداں ، باصلاحیت ہنر منداور فرض شناس مزدور پھیلے ہوئے ہیں ، خلیجی اور مغربی ملکوں میں تو یہ حال ہے کہ بہت سے ملکوں کی معاشی ، صنعتی اور تجارتی ترقی ہندوستان اور ہندوستانی نژادافراد پر موقوف ہے ۔

مغربی ممالک میں وہاں کے معیارِ زندگی کے لحاظ سے تنخواہوں کا اوسط ہندوستان سے بہت زیادہ ہے اور وہاں کے لیبر قوانین میں مزدوروں کے لئے تحفظ کی بھی زیادہ رعایت ہے ؛ اس لئے یہ مختلف ممالک خاص کر امریکہ ہندوستان کے بڑے شہروں میں '' کال سنٹرس '' کھول رہے ہیں ، جہاں انکوائری کی اور مختلف دوسرے دفتری کاموں کی سہولت فراہم کی جاتی ہے ، ان سنٹرس سے امریکہ و یورپ میں مقیم گاہکوں کو اس طرح جوابات دیئے جاتے ہیں کہ گویا یہ سہولت امریکہ ہی سے فراہم کی جارہی ہے ، مغرب میں چوں کہ عورتوں کو کسب معاش کی کوششوں میں مردوں کے برابر لانے کا سلسلہ جاری ہے ، نیز مہمانوں سے گفتگو اور استقبال کی ملازمتیں تو گویا خواتین ہی کے لئے مخصوص ہیں ؛ اس لئے ان سنٹروں میں نوجوان لڑکوں کے ساتھ ساتھ کثرت

سے نوجوان لڑکیوں کا بھی تقرر ہورہا ہے اور پرکشش تنخواہیں دی جارہی ہیں ، ہندوستان میں ایسے کاموں کے لئے دس بارہ ہزار روپے ماہانہ کی تنخواہ بہت معیاری تصور کی جاتی ہے ؛ لیکن امریکہ و یورپ کے اعتبار سے یہ بہت ہی معمولی اور حقیر ہے، ایک ہزار ڈالر پر بھی شاید امریکہ میں کوئی شخص اس ڈیوٹی کو انجام دینے کے لئے تیار نہیں ہوگا اور کرنسی کی قدر میں فرق کی وجہ سے یہاں ڈھائی تین سو ڈالر لوگوں کے لئے خوش کن تنخواہ بن جاتی ہے ؛ اس لئے اس میں دونوں فریق کا فائدہ ہے۔

بہر حال ہندوستان میں پڑھے لکھے بے روزگار نوجوانوں کے لئے یقینا یہ ایک بڑی نعمت ہے اور اس سے روزگار کے وسیع مواقع پیدا ہورہے ہیں ؛ لیکن ضروری ہے کہ ہم اس مسئلہ پر اخلاقی اقدار اور اسلامی اصولوں کی روشنی میں بھی غور کریں ، اس جہت سے تین باتیں قابلِ توجہ ہیں :

پہلی بات یہ ہے کہ شریعت میں وسائل کا وہی حکم ہوتا ہے، جو مقاصد کا ہوتا ہے، اگر مقصد واجب کے درجہ کا ہے، تو اس کے لئے مطلوب وسائل بھی واجب ہوں گے، اور مقصود شرعاً ناجائز وحرام ہے تو اس کے لئے جس وسیلہ کو اختیار کیا جائے ، وہ بھی حرام ہی ہوگا ، بذات خود مسجد جانا واجب نہیں ہے ؛ لیکن جماعت میں شریک ہونا واجب ہے ؛ اس لئے اس مقصد کے تحت مسجد تک جانا بھی واجب ہوگا ، بازار جانا گناہ نہیں ہے ؛ لیکن شراب پینا گناہ ہے ؛ اس لئے اس نیت سے گھر سے بازار تک کا فاصلہ طے کرنا بھی ناجائز وحرام ہے، اسی بناء پر قرآن نے برّ وتقوی میں تعاون کا حکم دیا ہے اور معصیت اور ظلم وزیادتی میں تعاون سے روکا ہے :

{وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلاَ تَعَاوَنُوا عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ}

(المائدہ : ۲)

لہذا جب آدمی کسی کمپنی کے لئے کام کرے تو اسے اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ اس کمپنی کا کاروبار بنیادی طور پر حلال وجائز ہو، جس کمپنی کا بنیادی کاروبار ہی ناجائز ہو، جیسے شراب بنانے یا بیچنے والی کمپنی ، بینک ، انشورنس کمپنی ، فحش لٹریچر چھاپنے والی کمپنی ، تمبا کو اور اس کی مصنوعات کو فروغ دینے والی کمپنی ، اسلحہ بنانے والی کمپنیاں ، جن کا استعمال مغربی قوتیں ظلم وزیادتی اور دہشت

گردی کے لئے کرتی ہیں، وہ بے شمار انسانوں اور جانوروں کو ہلاک کرنے والے ہتھیار بناتی ہیں اور انہیں مجرمانہ طریقے پر استعمال کرتی ہیں، غیر شرعی ذبیحہ فراہم کرنے والی کمپنیاں، حرام مصنوعات پیدا کرنے والی کمپنیاں، ایسی کمپنیوں میں مسلمانوں کے لئے ملازمت کرنا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ گناہ اور معصیت میں تعاون ہے، ایسی کمپنیوں کے کال سنٹرس میں نہ لڑکوں کے لئے ملازمت جائز ہے اور نہ لڑکیوں کے لئے۔

دوسرا قابلِ توجہ پہلو یہ ہے کہ ان سنٹرس میں لوگوں کے نام بھی تبدیل کئے جاتے ہیں، اور انہیں یہودیوں اور عیسائیوں کے مماثل نام دئے جاتے ہیں؛ تاکہ گفتگو کرنے والے کو یہ احساس نہ ہو کہ ہندوستان یا کسی اور ملک کا شخص اس سے گفتگو کر رہا ہے، اول تو نام ایسا ہونا چاہئے ،جس سے مسلمانوں کی شناخت ظاہر ہو، رسول اللہ ﷺ نے ایسے ہی نام رکھنے کا حکم دیا ہے، تاہم اگر کمپنی کی طرف سے نام بدلنے پر اصرار ہو تو چوں کہ ایک شخص کے ایک سے زیادہ نام ہو سکتے ہیں؛ اس لئے ملازمت کے اوقات میں کوئی اور نام اپنی شناخت کے اظہار کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے؛ لیکن اس صورت میں بھی مناسب ہوگا کہ انبیاء بنی اسرائیل جیسے اسحاق، یعقوب، داؤد، سلیمان وغیرہ جیسے نام منتخب کئے جائیں؛ کیوں کہ انبیاء کے نام پر نام رکھنا مسنون ہے، اور اگر یہ بھی نہ ہو تو کم سے کم ایسا نام تو ہو کہ جس میں مشرکانہ معنی نہ پائے جاتے ہوں، ایسے ناموں کا رکھنا جن سے شرک کا اظہار ہوتا ہو، بہر حال جائز نہیں ہے۔

تیسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ عام طور پر یہ کال سنٹرس امریکہ وغیرہ کے دن کے اوقات کی رعیات سے شب کے وقت کام کرتے ہیں، ٹیکسیاں شہر کے مختلف محلوں سے لڑکوں اور لڑکیوں کو لے کر سنٹرس جاتی ہیں اور بعض اوقات تو ان کی ڈیوٹی پوری پوری رات ہوتی ہے، یہاں بھی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بہت سی دفعہ تنہا وقت گزارتے ہیں، رات کا وقت اور تنہائی کا یہ ماحول جن اخلاقی برائیوں کو جنم دے گا اور جنم دے رہا ہے، وہ محتاجِ اظہار نہیں؛ اسی لئے اسلام میں اجنبی مرد و عورت کی تنہائی کو انتہائی ناپسند کیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ

’’کوئی مرد کسی عورت کے پاس اس حال میں داخل نہ ہو کہ اس کے ساتھ

اس کا محرم رشتہ دار موجود نہ ہو''

(طبرانی عن ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجمع الزوائد: ۴/۳۳۶)

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں نصیحت فرمائی کہ

''عورتوں کے ساتھ تنہائی اختیار کرنے سے بچو، جب بھی کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ تنہائی اختیار کرتا ہے، تو شیطان ان دونوں کے درمیان داخل ہوجاتا ہے، یہ بات کہ کوئی شخص مٹی اور کیچڑ سے لت پت خنزیر کے ساتھ جمع ہو، اس سے بہتر ہے کہ ایک مرد کسی غیر محرم عورت کے کاندھے سے اپنے کاندھے کو ملائے'' (طبرانی عن ابی اُمامۃ رضی اللہ عنہ، حوالۂ سابق)

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

''یہ بات کہ تم میں سے کسی کے سر میں لوہے سے چوٹ پہونچائی جائے، اس سے بہتر ہے کہ وہ ایسی عورت کو ہاتھ لگائے جو اس کے لئے حلال نہ ہو'' (طبرانی عن معقل بن یسار رضی اللہ عنہ، حوالۂ سابق)

رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں غیر محرموں کے ساتھ تنہائی، ان کے ساتھ اختلاط، ان سے ہاتھ ملانا، ان سے ضرورتِ شدیدہ کے بغیر گفتگو کرنا اور گفتگو میں عورت کا لوچ دار رویہ اختیار کرنا کس قدر بری بات ہے؛ کیوں کہ یہ ساری چیزیں انسان کو گناہ کی طرف لے جاتی ہیں۔

مغربی معاشرہ کے لئے یہ کوئی قابل فکر مسئلہ نہیں ہے؛ اس لئے کہ انہوں نے اپنے آپ کو مذہبی اور اخلاقی قدروں سے پوری طرح آزاد کرلیا ہے؛ اس لئے ان کے لئے ان مسائل کی کوئی اہمیت نہیں ہے، فارسی زبان کا مشہور مقولہ ہے کہ ''جب آدمی حیا کی چادر اتار پھینکے، تو پھر اس کے لئے کس چیز کی اہمیت باقی نہیں رہتی، وہ سب کچھ کرسکتا ہے''، مغرب اس وقت اسی دور سے گزر رہا ہے، اس نے اخلاقی قدروں کو تار تار کرکے رکھ دیا ہے، پانی اور کھانے کی بھی کچھ قیمت ہوتی ہے؛ لیکن مغربی تہذیب کی نظر میں مذہب و اخلاق کی کچھ بھی قیمت نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے قریب بے حیائی کا اتنا غلبہ

ہو جائے گا کہ لوگ راستہ سے گزرتی ہوئی عورت کو برسرِ عام اپنی ہوس کا نشانہ بنائیں گے، اس وقت جو شخص یہ کہے گا کہ کم سے کم دیوار کے پیچھے تو چلے جاؤ، تو وہ ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کے درجہ کے لوگ ہوں گے، شاید وہ وقت مغرب میں آچکا ہے یا آنے کو ہے؛ اس لئے ان کے نزدیک اجنبی مرد و عورت کا اختلاط، بے پردگی اور تلذذ میں تمام حدود کو پار کر جانا معمولی سی بات ہے، مغرب اسی تہذیب کو مشرقی ملکوں پر مسلط کرنا چاہتا ہے اور اسلام اور مسلمانوں سے اس کی عداوت کا اصل سبب یہی ہے کہ مسلمانوں نے اب تک ایسے بے خدا تمدن اور بے حیا تہذیب کے سامنے سپر نہیں ڈالا ہے۔

حقیقت میں یہ مسئلہ صرف مسلمانوں کا نہیں ہے؛ بلکہ پورے ہندوستانی معاشرہ کا ہے، ہندوستانی سماج بنیادی طور پر ایسا سماج ہے، جو مذہب پر یقین رکھتا ہے، ہندو تہذیب میں بھی پردہ کا تصور رہا ہے، اجنبی مردوں اور عورتوں کے اختلاط کو بری نظر سے دیکھا گیا ہے اور عورتوں کی عفت و عصمت کو تقدس کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، ہندو روایات کے مطابق سیتا جی کو ان کے دیور لکشمن جی پہچان نہیں سکے؛ کیوں کہ انہوں نے کبھی اپنی بھاوج کا چہرہ دیکھا تک نہیں تھا اور رام جی نے راون کو شکست دینے کے بعد اپنی بیوی سیتا جی کو اسی وقت قبول کیا، جب کہ ان کی عفت و پاکدامنی کا امتحان کرلیا، ان واقعات کو ہندو قوم اسوۂ و نمونہ کی نظر سے دیکھتی ہے، عیسائیوں کے یہاں راہبات کا لباس آج بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ سوائے چہرہ کے ان کا پورا جسم چھپا ہوتا ہے؛ اس لئے یہ ایسی اخلاقی قدریں ہیں، جو تمام مذاہب کے درمیان مشترک و مسلّم ہیں؛ اس لئے یہ صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں، ہمارے پورے سماج کا مسئلہ ہے۔

بدقسمتی سے ہماری حکومت معاشی فوائد کے حصول کے لئے پوری طرح مغربی حکومتوں کے مطالبات کو قبول کرتی جارہی ہے، غیر ملکی کمپنیوں کے ساتھ خصوصی سہولتیں اور رعایتوں کا معاملہ کیا جارہا ہے؛ حالاں کہ وہ کثیر منافع حاصل کررہی ہیں، ایسی ہی کوششوں کا ایک حصہ یہ ہے کہ خواتین کے لئے رات کی ڈیوٹی پر جو پابندی تھی، اسے ختم کردیا گیا ہے، یہ عورتوں کے ساتھ کھلی ہوئی زیادتی اور ناانصافی ہے، اس سے نہ صرف ان کا جنسی استحصال ہوگا؛ بلکہ یہ ان کی صحت اور ان سے متعلق گھریلو ذمہ داریوں کے لئے بھی نقصان کا باعث ہوگا؛ اس لئے لڑکیوں کو تو یہ

ملازمت خاص کر رات کی ڈیوٹی بالکل ہی قبول نہیں کرنی چاہئے اور لڑکوں کے لئے بھی اس سے بچنا بہتر ہے ؛ البتہ اگر اس کے سوا کوئی مناسب راستہ موجود نہیں ہو تو احتیاط کے ساتھ اور اپنے دامنِ عمل کو آلائش سے بچاتے ہوئے ان ملازمتوں سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے۔

بہر حال کال سنٹرس کی ملازمتوں کو روزگار کا ایک نیا راستہ تصور کیا جا رہا ہے اور یقیناً اس سے بہت سے لوگوں کو معاشی فوائد پہونچ رہے ہیں ؛ لیکن اس کے اخلاقی اور دینی نقصانات معاشی فوائد سے بڑھ کر ہیں ؛ اس لئے اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے!

۹/مئی ۲۰۰۸ء

بم دھماکے — انسانیت کے خلاف جرم عظیم

بنگلور کے بم دھماکوں کا زخم مندمل بھی نہ ہو پایا تھا کہ احمد آباد میں بم دھماکوں نے قیامت مچادی اور تادم تحریر اخباری اطلاعات کے مطابق ۴۵ افراد ہلاک ہو چکے ہیں اور متعدد شدید زخمی ہیں، اس لئے مہلوکین کی تعداد میں اضافہ بھی ہوسکتا ہے، ملک میں بم دھماکوں کے واقعات کی اتنی کثرت ہوتی جارہی ہے کہ ایسے واقعات کا جو فطری اثر قارئین پر پڑنا چاہئے، وہ بھی کم ہوتا جارہا ہے؛ کیوں کہ مصیبت کتنی بھی بڑی ہو، اگر انسان بار بار اس سے دوچار ہوتو آنسو خشک ہوجاتے ہیں، ایک اردو شاعر کے بقول:

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

مگر حقیقت میں انسان وہی ہے، جو اپنے سینہ میں دل اور دل میں دھڑکنیں رکھتا ہو، یہ دھڑکنیں دوسرے انسان کے زخم پر تیز ہوجائیں، اپنے بھائی کی مصیبت اسے بے قرار کردے اور تڑپادے، جس انسان کو دوسرے انسانوں کا دکھ تڑپاتا نہ ہو، اسے اپنے آپ کو ٹٹولنا چاہئے، کہیں اس کے سینہ میں قدرت نے دل کے بجائے پتھر کی سِل تو نہیں رکھ دی ہے؟ کتنے مرد وعورت ہیں، جو لمحہ بھر میں موت کی آغوش میں جاپہونچے! موت کے ان سوداگروں نے معصوم بچوں اور ضعیف بوڑھوں کا بھی خیال نہیں کیا، مال واسباب جو بے زبان ہوتے ہیں، اور جو انسان کے لئے زندگی کی ایک سے ایک راحت فراہم کرتے ہیں، وہ بھی ان کی دستبرد سے بچ نہیں سکے، —— کیا اس سے خود ان قاتلانِ انسانیت کو کوئی نفع حاصل ہوا؟؟......انسان کتنا بھی گیا گزرا ہو، انسان کے گوشت سے اپنی بھوک نہیں مٹاتا، انسان کے خون سے اس کی پیاس نہیں بجھ پاتی، اور ایک انسان ہی پر کیا موقوف؟ درندے بھی اپنی جنس کو اپنی غذا نہیں بناتے ہیں، شیر، شیر کو اور بھیڑیا، بھیڑیئے کو اپنا لقمہ نہیں بناتا؛ لیکن افسوس کہ انسان جب اپنی سطح سے گرتا ہے، تو درندوں کو بھی شرمندہ کردیتا ہے،

شاید شیطان بھی ایسے انسانوں پر قہقہہ زن ہوگا کہ یہ دن رات ہمیں کوستا تو ہے، لیکن سفا کی وخونخواری پر اتر آئے تو ہمیں بھی مات دے دیتا ہے۔

بنیادی مسئلہ ''انسانی شرافت'' کے احساس کا ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو کرامت وتوقیر سے نوازا ہے، خشکی اور تری کو اس کے قدموں میں بچھا دیا ہے، اسے پاکیزہ غذا عطا فرمائی ہے اور اسے دوسری مخلوقات پر فضیلت دی ہے:

{وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلاً}

(الاسراء:۷۰)

انسان کا وجود بہ ظاہر چھوٹا بھی ہے اور نازک بھی؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا اعزاز یہ ہے کہ یہ پوری کائنات اس کے لئے بنائی اور بسائی گئی ہے: {هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا} (البقرۃ:۲۹) —— خالق کائنات کی طرف سے اس کا پاس ولحاظ اس قدر ہے کہ سورج اور چانداور اس کی گردش بھی حضرت انسان ہی کے لئے ہے:

{وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ} (النحل:۱۲)

—— اس کے لئے تخلیق کا جو ڈھانچہ رکھا گیا ہے، خدا کی نظر میں وہ سب سے بہتر ڈھانچہ ہے: {لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِىْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ} (التین:۴) —— اس سے بڑی توقیر وتکریم اور کیا ہوسکتی ہے کہ خالق نے اس مخلوق کو اس وسیع وعریض اور بھر پور دنیا میں اپنا خلیفہ یعنی اپنا نمائندہ بنایا ہے: {وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ} (الانعام:۱۶۵) —— اور اس کے جدامجد کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ فرشتوں سے انہیں سجدہ کرایا گیا ہے اور شیطان کو اس سے انکار کی وجہ سے راندۂ درگاہ کیا گیا ہے۔ (البقرہ:۳۴)

انسانی تکریم کا اولین تقاضہ اس کی جان ومال کا احترام ہے، قرآن مجید نے خوب کہا ہے کہ جس نے ایک انسان کو قتل کیا، اس نے پوری انسانیت کو قتل کیا اور جس نے ایک شخص کی جان بچائی، گویا اس نے پوری انسانیت کی جان بچائی:

{مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ

جَمِيْعًا وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا }

(المائدہ:٣٢)

آدمی بہر حال قابل احترام ہے، خواہ وہ کسی نسل کا ہو، کسی علاقہ کا ہو، کسی زبان کا بولنے والا ہو اور کسی مذہب اور عقیدہ کا ماننے والا ہو، اس پہلو سے کوئی امتیاز روا نہیں ہے، کسی شخص پر ناحق حملہ کرنا یا اس کی جان لینا قطعاً حرام اور اسلام کی نگاہ میں سخت ترین گناہ ہے: { وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ } (الانعام: ١٥١) —— اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقعہ پر اس کو اہل ایمان کے بنیادی اعمال میں سے قرار دیا ہے کہ وہ شرک کا، قتل ناحق کا یا زنا کا مرتکب نہ ہو، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبیرہ گناہوں میں بھی زیادہ سنگین گناہوں کو شمار کراتے ہوئے سب سے پہلے شرک کا اور اس کے بعد قتل کا ذکر کیا ہے: ''أكبر الكبائر الإشراك بالله وقتل النفس'' (بخاری، حدیث نمبر: ٦٨٧١) —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو ہجرت سے پہلے اہل مدینہ پر سردار مقرر کیا، اور ان سرداروں کو ''نقیب'' کا لقب دیا گیا، ان سے جن باتوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لی —— اور اگر آج کی اصطلاح میں کہا جائے کہ حلف لیا تو بے جا نہ ہوگا —— وہ یہ تھیں کہ ہم شرک نہیں کریں گے، چوری نہیں کریں گے، زنا نہیں کریں گے، ناحق کسی کی جان نہیں لیں گے، کسی کا مال نہیں چھینیں گے اور نافرمانی نہیں کریں گے، (بخاری، عن عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ، حدیث نمبر: ٦٨٧٢) —— غور کیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نمائندہ سے جن باتوں کا عہد لیا ہے، ان میں چھ کے من جملہ چار وہ ہیں، جن کا تعلق انسانی جان و مال اور عزت وآبرو کے احترام سے ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے کسی فرق و امتیاز کے بغیر انسانی تکریم کو کتنی زیادہ اہمیت دی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تین انسان سب سے زیادہ مبغوض ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فہرست میں اس شخص کو بھی شامل رکھا، جو ناحق کسی انسان کے خون کا پیاسا ہو: ''و مطلِّب دم امرء بغير حق ليهريق دمه'' (بخاری، حدیث نمبر: ٦٨٨٢)

اس بات کی وضاحت مناسب ہوگی کہ جان کسی مسلمان کی ہو یا غیر مسلم کی، خدا پر اس کے حق کے مطابق ایمان رکھنے والے کی ہو یا ایمان نہ رکھنے والے کی، ہر ایک قابل احترام ہے، اگر خدا نے دنیا میں صرف مسلمانوں کو جینے کا حق دیا ہوتا اور غیر مسلموں کو اس حق سے محروم رکھا ہوتا تو کیا

اس کے لئے یہ بات دشوار تھی کہ وہ خود ہی ایمان نہ لانے والے کو موت کی نیند سلا دے؟ اس طرح خود بخود پوری دنیا تنہا مسلمانوں سے آباد رہتی؛ لیکن اللہ تعالیٰ کو ایسا منظور نہیں ہے، اگر دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم نہ ہوں، انہیں کائنات کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع میسر نہ ہو، انسان خدا کی اطاعت پر اسی طرح مجبور ہوں، جیسے پہاڑ کھڑے رہنے پر اور سمندر اپنی متلاطم لہروں کے ساتھ دوڑتے رہنے پر مجبور ہے، تو پھر دنیا میں انسان کے امتحان کا مقصد بھی کیسے پورا ہوتا، اچھوں اور بروں کے درمیان خط امتیاز کیوں کر کھینچا جاتا اور کس طرح جنت ودوزخ کے پیٹ بھرے جاتے؟ اس لئے کفر بذات خود ایسی بات نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے کسی انسان کو قتل کر دینا جائز ہو، قرآن نے اس سلسلہ میں واضح کر دیا ہے کہ دین ومذہب کے معاملہ میں زور زبردستی اور جبر واکراہ نہیں ہے: {لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغي} (البقرہ:۲۵۶) —— اور یہ کہ ایک ایسا سماج — جس میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے ہوں —— میں صحیح اور قابل عمل طریقہ یہ ہے کہ اگر وہ ایک دوسرے کی فکر سے مطمئن نہ ہوں تو ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہوئے اپنے اپنے طریقہ پر قائم رہیں: {لکم دینکم ولي دین}

(الکافرون:٦)

اللہ تعالیٰ نے امن پسند غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کی تعلیم دی ہے:

{ --- أَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا إِلَيْهِمْ ، إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ }

(الممتحنہ:۸)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کسی ایسے غیر مسلم کو جس کے ساتھ امن کا معاہدہ ہو، قتل کیا تو وہ جنت کی خوشبو سے بھی محروم رہے گا؛ حالاں کہ اس کی خوشبو چالیس سال کے فاصلہ سے محسوس کی جاسکتی ہے: ''من قتل معاهدا لم یرح رائحة الجنة'' (بخاری، حدیث نمبر:۳۱۶۶) —— ایک اور روایت میں ہے کہ جس نے کسی ایسے غیر مسلم کو قتل کیا، وہ جنت سے محروم رکھا جائے گا: ''حرم اللہ علیه الجنة'' (أبوداؤد، حدیث نمبر:۲۷٦۰)

یہ تو عام انسانوں کا حکم ہے، بچے اگر خدانخواستہ کسی کا قتل کر دیں، تب بھی ان کو مناسب سزا تو دی جائے گی، مگر قتل نہیں کیا جائے گا؛ کیوں کہ وہ ابھی احکام شرعیہ کے مکلف نہیں ہیں، رسول اللہ

ﷺ نے فرمایا کہ بچے جب تک بالغ نہ ہوجائیں، ان سے قلم اٹھالیا گیا ہے:

"رفع القلم عن ثلاثة : عن النائم حتی یستیقظ وعن المبتلی حتی یبرأ وعن الصبي حتی یکبر " (سنن أبو داؤد، حدیث نمبر: ۴۳۹۸، ۴۴۰۲)

بعض وہ جرائم جن میں مردوں کے لئے سزائے موت ہے، ان میں بھی عورتوں کے لئے عمر قید کی سزا رکھی گئی ہے، یہاں تک کہ جنگ —— جس میں انسان قانون کی ساری حدوں کوتوڑ دیتا ہے، —— کے موقعہ پر بھی رسول اللہ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ عورتوں اور بچوں پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک غزوہ میں ایک عورت مقتول پائی گئی تو آپ ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا: **''۔۔۔ فنھی رسول اللّٰہ ﷺ عن قتل النساء والصبیان''** (مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۴۴) —— اسی طرح آپ ﷺ نے مُثلہ یعنی زندہ یا مردہ انسان کے اعضاء کو کاٹ دینے اور صورت مسخ کردینے سے بھی منع فرمایا: **''وینھانا عن المثلۃ''** (ابوداؤد، عن سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ، حدیث نمبر: ۲۶۷۳) —— یہ بات ظاہر ہے کہ بم دھماکوں کے ذریعہ جو انسانی ہلاکتیں ہوتی ہیں، ان میں خواتین اور بچے بھی شکار بنتے ہیں؛ بلکہ چوں کہ یہ بھاگ نہیں پاتے؛ اس لئے اکثر اوقات وہ زیادہ نشانہ بنتے ہیں، نیز جو لوگ دھماکوں میں مارے جاتے ہیں، ان کا چہرہ اکثر مسخ ہوکر رہ جاتا ہے اور جسم کے چیتھڑے اڑ جاتے ہیں؛ اس لئے یہ تو مثلہ کی بدترین شکل ہے۔

بم دھماکوں کی جو صورت ہمارے ملک میں پیش آرہی ہے، اگر قرآن کی تعبیر پر غور کیا جائے تو یہ **''فساد فی الارض''** یعنی اللہ کی زمین میں بگاڑ پیدا کرنا ہے، جان و مال کی ہلاکت و بربادی کے درپے ہونے والوں کو قرآن مفسد قرار دیتا ہے:

{ وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِيْ الأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لاَيُحِبُّ الفَسَادَ } (البقرہ: ۲۰۵)

بم دھماکوں کا مقصد بھی جان و املاک کی تباہی و بربادی ہے، جو خدا کی نظر میں انتہائی ناپسندیدہ اور قابل نفرت فعل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ایسے لوگوں پر لعنت ہے اور ان کے لئے بد ترین انجام ہے: **{أُوْلَئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ}** (الرعد: ۲۵) —— اللہ

کی لعنت کا ان پر اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کے کان نصیحت کی باتوں کو سننے سے بہرے اور ان کی آنکھیں نصح وموعظت کے نقوش کو پڑھنے سے اندھی ہوجاتی ہیں: { **فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَى أَبْصَارَهُمْ** } **محمد:۲۳)**

اسلامی قانون میں سب سے سخت سزا ایسے ہی تخریب پسند مفسدین کی رکھی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> ''بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے برسر پیکار ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں، ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کیا جائے یا سولی پر چڑھایا جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں الٹے کاٹ دیئے جائیں یا وہ جلاوطن کردئے جائیں، ان کے لئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی دردناک عذاب ہے'' **(المائدہ:۳۵)**

اسی کو فقہ کی اصطلاح میں ''حرابہ'' کہتے ہیں، ان کے جرم کی نوعیت اور اس میں شدت کے لحاظ سے مختلف سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں سے الٹے ہاتھ پاؤں کاٹ دینا اور سولی دینا ایسی سزائیں ہیں، جو کسی اور جرم میں نہیں رکھی گئی ہے، اگر جرم سخت ہو اور اس پر دی جانے والی سزا سخت نہ ہو، تو مجرم کے پنجۂ استبداد کو تھامنا ممکن نہیں؛ اسی لئے اسلام نے جرائم کے لحاظ سے سزائیں رکھی ہیں۔

بہرحال جن انسان نما درندوں نے بھی اس کا ارتکاب کیا ہو، وہ یقیناً انتہائی قابل نفرت ہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ دو اور جہتوں کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے، ایک یہ کہ دلیل وثبوت کے بغیر کسی شخص یا قوم کی طرف شک کی سوئی گھما دینا اور انہیں مجرم کی حیثیت سے پیش کرنا ہرگز درست نہیں اور ایسے واقعات کو اس ناشائستہ حرکت کے لئے بہانہ بنانا بجائے خود جرم ہے، رسول اللہ ﷺ نے خوب ارشاد فرمایا کہ حکمراں اگر لوگوں میں تہمت کا متلاشی ہو تو وہ سماج میں فساد و بگاڑ پیدا کردیتا ہے: ''**أن الأمير إذا ابتغى الريبة في الناس أفسدهم**'' (أبوداؤد، حدیث نمبر: ۴۸۸۹)—— حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اگر تم نے لوگوں کی قابل ستر باتوں کے پیچھے پڑے تو تم فساد پیدا ہونے کا باعث بنوگے: **إنك إن اتبعت عورات الناس أفسدتهم**'' (ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۸۸۸) بلا

دلیل وثبوت کسی گروہ کو شکوک وشبہات کا ہدف بنانا اور پھر اس کے ساتھ ثابت شدہ مجرموں کی طرح کا معاملہ کرنا جذبۂ فساد کو بڑھاتا ہے، ہندوستان میں ٹاڈا اور پوٹا کا قانون بنا، کشمیر، مہاراشٹر، گجرات اور آسام میں ایسے واقعات کو روکنے کے لئے خصوصی قوانین موجود ہیں؛ لیکن کیا ان قوانین نے ایسے جرائم کا خاتمہ کردیا؟—— یہ ارباب اقتدار کے لئے سوالیہ نشان ہے، اگر بے قصوروں کو قصوروار ٹھہرایا جائے، ایک شخص قصوروار ہو اور پورے گروہ کو مجرم قرار دیا جائے تو اس سے مجرمانہ جذبات پروان پڑھتے ہیں، انسان جرم سے باز رہنے کے بجائے اور زیادہ جرم کا ارتکاب کرنے لگتا ہے، جہاں بھی اور جب بھی یہ طرز عمل اختیار کیا گیا ہے، منفی نتائج ہی سامنے آئے ہیں؛ اس لئے حکومت کو پوری دیانت داری کے ساتھ مجرموں کو تلاش کرنا چاہئے، یہ صحیح انداز فکر نہیں ہے کہ دھماکہ مسجد میں ہو یا مندر میں، مسلمان آبادیوں میں ہو یا غیر مسلم آبادیوں میں، ہر جگہ مجرم مسلمانوں ہی کو سمجھا جائے، فرقہ پرست جماعتیں بہ بانگ وہل آتشیں اسلحہ کی مشق کریں، فرقہ وارانہ فسادات میں ان کی مجرمانہ حرکتیں ٹی وی کے اسکرین پر دیکھائی جائیں اور برادران وطن کو خودکش دستہ بنانے کی دعوت دیں، مگر انہیں کچھ نہیں کہا جائے اور مظلوم مسلمانوں کو ہر جگہ قربانی کا بکرا بنایا جائے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ امن اور انصاف ایک دوسرے سے مربوط ہیں، اگر بارش کے پانی کی نکاسی کے لئے نہریں اور نالے موجود ہوں، تو پانی آبادیوں میں نہیں پھیلے گا؛ لیکن اگر ان کی نکاسی کا نظم نہ ہو، تو ہزار تدبیر کرلی جائیں، پانی تباہی مچا کر رہے گا، اسی طرح اگر مظلوموں کو انصاف حاصل ہوتا رہے، انہیں اطمینان ہو کہ پولیس انہیں ظالموں سے بچائے گی، عدالت انہیں انصاف فراہم کرے گی تو وہ غیر قانونی راستہ اختیار نہیں کریں گے؛ لیکن اگر کسی شخص نے اپنے بوڑھے باپ یا جوان بیٹے کو خون میں تڑپتے ہوئے دیکھا ہو، کسی کے سامنے اس کی ماں بیٹی کی عزت وآبرو کا خون کیا گیا ہو، کسی کی آنکھوں نے اپنی دکان اور کاروبار کو لٹتا ہوا دیکھا ہو اور پھر اسے کوئی ایسا دروازہ بھی میسر نہ ہو، جو انصاف دے سکے؛ بلکہ الٹے اسی کو ملزم بھی گردانا جاتا ہو تو ایسے شخص کے لئے قانون ایک بے جان اور بے معنی چیز ہو کر رہ جاتی ہے، جو قانون طاقتوروں کے لئے سہارا ہو اور کمزوروں کی فریاد پر توجہ نہیں دیتا ہو، وہ مظلوموں کی نظر میں ایک بے جان لاش بن جاتا ہے؛

حالاں کہ اسلام ظلم کا جواب بھی ظلم سے دینے کو پسند نہیں کرتا ہے اور بہر صورت قانون کے دائرہ میں رہ کر قدم اٹھانے کی تلقین کرتا ہے؛ لیکن جب انسان مغلوب الجذبات ہوتا ہے تو وہ ایسی نصیحتوں کو بھول جاتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمارے آباء واجداد نے انگریزوں کے خلاف معرکہ آرائی نہیں کی ہوتی۔

اس لئے ضرورت ہے کہ ملک کے مذہبی عناصر ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر آگے آئیں اور پوری قوم کو امن وآشتی اور انسانیت کے احترام کا سبق دیں، ارباب سیاست کی لغت سے ''انصاف، انسانی اخوت، خیر خواہی اور بے غرض محبت'' کے الفاظ مٹ چکے ہیں؛ اس لئے ان سے اس کام کی توقع رکھنا آگ سے پیاس بجھانے کی امید رکھنے کے مترادف ہے، یہ کام اہل مذہب کے انجام دینے کا ہے، جب تک لوگوں میں انسانی جان و مال کی حرمت کا احساس نہ پیدا ہو، ایسے واقعات کا تدارک ممکن نہیں ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ دلیل وثبوت کے بغیر کسی شخص یا گروہ کو مورد الزام ٹھہرانے سے گریز کیا جائے اور یہ بھی کہ سماج میں ہر شخص کے لئے انصاف کے حصول کو یقینی بنایا جائے اور کوئی مظلوم وستم رسیدہ اس احساس میں مبتلا نہ ہو پائے کہ وہ انصاف نہیں حاصل کر سکتا، اس وسیع منصوبہ بندی کے ساتھ جہد مسلسل کے ذریعہ ہی ہم ایسے امن دشمن افراد کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

یکم/ اگست ۲۰۰۸ء

مسلمان اور ذرائع ابلاغ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ آخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ، وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ}

(الانفال: ٦٠)

''اور جہاں تک ممکن ہو دشمنانِ اسلام کے مقابلہ کے لیے قوت اور جنگی گھوڑے تیار رکھو، جن سے تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے علاوہ دوسرے دشمنوں کو خائف کر سکو، جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ انہیں جانتا ہے اور اللہ کے راستہ میں تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے، تمہیں اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کی طرف سے چوکنا رہنے کا حکم دیا ہے اور اس بات کو ناپسند کیا ہے، کہ وہ غفلت اور بے خبری کی زندگی بسر کریں، پھر قرآن نے ایک جامع تعبیر اختیار کی ہے کہ دشمن کے مقابلہ اپنی بھرپور طاقت کو مجتمع رکھنا چاہیے، اس میں ایسی تعبیر اختیار نہیں کی گئی جس سے صراحتاً عسکری و فوجی قوت ہی مراد ہو، قوت میں عسکری اور غیر عسکری، مادّی اور معنوی ہر طرح کی قوت شامل ہے؛ البتہ آگے جنگی گھوڑوں سے خاص فوجی طاقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ وہ اسلامی حکومتیں اس کی مخاطب ہیں جو دشمنوں سے برسرِ پیکار ہوں، اللہ تعالیٰ نے اس بات کو بھی بیان فرمایا کہ اس طاقت کا مقصود دوسروں کی جان و مال کو خطرہ میں

ڈالنا اور دنیا کے امن و آشتی پر غارت گری کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد دشمن کی حریصانہ نظر کو خوف زدہ کرنا اور ان کے جارحانہ حوصلہ کو توڑنا ہے، اسی کو قرآن نے تُرْہِبُوْنَ بِہٖ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، یعنی ایسی طاقت جو دشمن کو مرعوب کرنے والی ہو۔

آگے اللہ تعالیٰ نے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا ذکر فرمایا ہے، جس میں اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ طاقت کی تیاری (اعدادِ قوت) میں سرمایہ اور مالی تعاون کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے، چنانچہ اس مقصد کے لیے جو کچھ خرچ کیا جائے، وہ اللہ کے راستہ ہی میں خرچ کرنا ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے اور قیامت تک انسانیت کے لیے رہبر و رہنما ہے؛ اسی لیے قرآن میں ایسی تعبیرات اختیار کی جاتی ہیں جو ہر دَور کا ساتھ دے سکیں اور ہر زمانہ کے وسائل پر ان کی تطبیق آسان ہو۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں قوت مہیا رکھنے کی بات بہت ہی معنی خیز اور قابلِ توجہ ہے۔ ہر دَور میں طاقت کا ایک ہی سبب نہیں ہوتا؛ بلکہ مختلف ادوار میں آلاتِ قوت اور اسبابِ طاقت جداگانہ ہوتے ہیں، ہمارے اس دور میں ایک بہت بڑی طاقت ذرائع ابلاغ ہیں، ذرائع ابلاغ کسی گروہ کو بامِ اقتدار پر پہنچا تا بھی ہے، اور تختۂ دار پر لٹکاتا بھی ہے، وہ چاہے تو بے قصوروں کو جرم کے کٹہرے میں کھڑا کر دے اور چاہے تو مجرموں کو معصوم و بے گناہ بنادے، سماج کا دل و دماغ ذریعۂ ابلاغ کی مٹھیوں میں ہے؛ اس لیے میڈیا اس دَور کی بہت بڑی طاقت ہے اور یقیناً {**اَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ**} میں شامل ہے۔

رسول اللہ ﷺ جب نبی بنائے گئے تو آپ ﷺ نے اس کے اعلان اور ایمان کی دعوتِ عام کے لیے خاص طور پر صفا کی چوٹی کا انتخاب فرمایا، یہ محض کوئی اتفاقی واقعہ نہیں؛ بلکہ اہل مکہ کا طریقہ تھا کہ جب بھی کسی اہم بات کی خبر دینی ہوتی، صفا کی چوٹیوں پر چڑھ کر آواز لگاتے، یہ اس بات کی علامت سمجھی جاتی کہ کوئی اہم بات پیش آئی ہے، جس سے لوگوں کو باخبر کرنا مقصود ہے، اس لیے تمام اہل مکہ اہتمام کے ساتھ جمع ہو جاتے اور گوش بر آواز ہو کر اس اعلان کو سنتے، گویا یہ اس زمانہ میں مکہ کا سب سے بڑا ذریعۂ ابلاغ تھا۔ جس طرح آج پورے شہر تک کسی خبر کو پہنچانے کے لیے اخبارات کا سہارا لیا جاتا ہے اور اس میں اشتہارات شائع کرائے جاتے ہیں، اسی طرح اس دور میں صفا کی پہاڑی سے اعلان کئے جاتے تھے۔

سیرت کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حج کے موقع پر بھی دعوتِ اسلام کا کام کیا کرتے تھے؛ حالانکہ اس زمانہ میں حج میں بہت سی منکرات اور برائیاں اہلِ مکہ نے اپنی طرف سے شامل کرلی تھیں، یہاں تک کہ بعض لوگ احترام کے نام پر کعبہ کی بے احترامی کرتے تھے اور مرد دن میں اور عورتیں رات میں بے لباس طواف کیا کرتے تھے، منیٰ اور عرفات میں اللہ تعالیٰ کی حمد وستائش کے بجائے لوگ اپنے آباء واجداد کی تعریف کے نغمے گاتے اور اشعار پڑھتے تھے، عکاظ کا میلہ تو خالص تجارتی میلہ تھا، اس میں وہ تمام رنگ رلیاں ہوا کرتی تھیں اور شراب وکباب کی محفلیں آراستہ کی جاتی تھیں جو عیش کوشیوں اور سرمستیوں بلکہ بدمستیوں کے لوازم میں سے ہیں، لیکن اس میلہ میں بھی آپ ﷺ پہنچتے اور لوگوں تک حق کی دعوت پہنچاتے، اہلِ مدینہ حج کے اجتماعات کے ہی برکت سے اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے اور پھر ایسے جاں نثار ہوئے کہ تاریخ عالم میں ایسی جاں نثاری اور خود سپردگی کی مثال نہیں ملتی۔

ان اجتماعات میں جانا اور وہاں دعوتِ حق پہنچانا اس زمانہ کے طاقتور ترین اور وسیع الاثر ذرائع ابلاغ سے استفادہ کی بہترین مثال ہے، اس لیے اپنے عہد کے ذرائع ابلاغ سے فائدہ اٹھانا اور ان تک رسائی حاصل کرنا صرف مصلحت کا تقاضا نہیں؛ بلکہ اسلامی تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ہے۔ افسوس کہ جہاں اور بہت سے پہلوؤں سے ہم نے غفلت کی راہ اختیار کی ہے، وہیں ذرائع ابلاغ کی طرف سے ہماری بے توجہی بھی ایک قومی گناہ سے کم نہیں۔

یہودیوں کے کم تعداد میں ہونے کے باوجود معاشی اور سیاسی پالیسیوں پر ان کے غلبہ کا اصل راز یہی میڈیا کی طاقت ہے، جس نے ان کی پروپگنڈہ کی صلاحیت کو بے پناہ کردیا ہے، دس سال پہلے کے اعداد وشمار کے مطابق پوری ریاستہائے متحدہ امریکہ سے مجموعی طور پر یہودیوں کے ایک ہزار سات سو انسٹھ روزنامے شائع ہوتے ہیں، ماہنامے، پندرہ روزے، سہ ماہی، شش ماہی اور سالانہ جرائد اس کے علاوہ ہیں، (مغربی میڈیا اور اس کے اثرات: ۱۲۸) یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہودی اخبارات ورسائل صرف امریکہ اور یورپ میں چھپتے ہیں، بلکہ دنیا کے اکثر ممالک ان کی آماجگاہ ہیں، خود عالمِ اسلام میں ترکی سے یہودیوں کے آٹھ ہفت روزے اور دو ماہنامے، مراکش سے دو

ہفت روزے، دو ماہنامے اور چار سالنامے اور ایران سے ایک ہفت روزہ شائع ہوا کرتا ہے۔ سنگا پور اور فلپائن جیسے چھوٹے سے ملک میں بھی ان کے جرائد ورسائل کی تعداد بالترتیب دس اور نو ہیں۔

امریکہ میں ٹیلی ویژن کی پانچ کمپنیاں ہیں، ان میں سے چار یہودیوں کی ہیں، اے بی سی، سی بی ایس، این بی سی۔ ان کمپنیوں کے ذریعہ صرف امریکہ میں سات سو سے گیارہ سو تک ٹیلی چینل کام کرتے ہیں اور اپنے پروگرام پوری دنیا میں سیاروں کے ذریعہ نشر کرتے ہیں۔ (دیکھئے: مغربی میڈیا اور اس کے اثرات: ۱۲۰) یہودیوں کے زیر اثر شائع ہونے والے اخبارات اپنی تعدادِ اشاعت کے اعتبار سے صفِ اوّل کے اخبارات ورسائل ہیں، مثلاً نیویارک ٹائمس کی اشاعت بارہ لاکھ سے زیادہ ہے، مشہور سائنسی رسالہ ریڈرس ڈائجسٹ کی تعداد واشاعت پونے دو کروڑ کے قریب ہے۔ امریکہ میں یہودیوں کی آبادی کا تناسب محض ۲ء۹ فی صد ہے، لیکن ان کی ذرائع ابلاغ کی طاقت کا یہ حال ہے کہ امریکہ میں کل ۶۵ /ملین روزنامے قارئین تک پہنچتے ہیں، ان میں سے ۶۲ /ملین اخبارات کے مالکین بھی یہودی ہیں، پھر اخبارات میں نوے فیصد کارکن یہودی ہیں اور ان کو پوری دنیا میں تقسیم کرنے کی سترہ سو پینتالیس ایجنسیاں اور اشاعتی ادارے ہیں، یہ سب یہودیوں کے قبضہ میں ہیں۔ (مغربی ذرائع ابلاغ: ۱۲۹)

یہودیوں نے ذرائع ابلاغ پر غلبہ حاصل کر کے نہ صرف اپنی تجارت اور معیشت کو فروغ دیا، بلکہ اسے عیسائیت کی تباہی کا وسیلہ بھی بنایا، اس مقصد کے لیے یہودی ذرائع ابلاغ نے عریانیت اور آزاد جنسی تعلقات کی دعوت کو اپنا خاص موضوع بنالیا، مکالموں، نغموں اور تصویروں کے ذریعہ آبرو باختگی اور بے عفتی کو عیسائی معاشرہ میں اس درجہ رواج دیا کہ امریکہ و یورپ کا عیسائی سماج شراب وشباب کی بدمستیوں میں پوری طرح غرق ہو چکا ہے اور اس طرح اس غفلت کوش، اپنے انجام سے بے خبر اور قوتِ عمل سے محروم معاشرہ پر یہودیوں نے مکمل معاشی غلبہ حاصل کرلیا ہے اور ان کو اپنا کھلونا بنا رکھا ہے۔

عیسائی دنیا کو تباہ کرنے کے بعد اب ان کا نشانہ عالمِ اسلام، عالمِ عرب اور مشرقی ممالک ہیں، مسلمانوں اور عربوں پر یہودی ذرائع ابلاغ کی دوہری یلغار ہے، ایک طرف فلموں، ڈراموں اور مکالموں کے ذریعہ تصور پیدا کیا گیا ہے کہ مسلمان عموماً اور عرب خصوصاً جاہل، شدت پسند، مجرم

خو،قتل وخونریزی کے عادی، بے وقوف وکند ذہن،غریب وقلاش اورعیش پرست ہوا کرتے ہیں اورعرب،عورتوں کے دیوانے اورشہوت میں ایسے اندھے ہوتے ہیں کہ انہیں اگراس طرح کی کوئی رشوت دی جائے تو وہ فوراًرام ہوجاتا ہے۔اسلامی شعائر کی بے حرمتی کے لیےبھی اشاعتی ذرائع کا استعمال کیا جاتا ہے،عریاں تصویروں کوقرآنی آیات کے ہالہ میں شائع کرنے کے کئی واقعات سامنے آچکے ہیں۔مغربی میڈیا کا عربوں کے ساتھ کس قدرتمسخرآمیز اورتوہین انگیز رویہ ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ C.N.N جیسی مشہور عالمی ٹی،وی کمپنی ایک صابن کا اشتہار اس طرح دیتی ہے:''یہ صابن ہر چیز صاف کرسکتا ہے،حتیٰ کہ گندے عربوں کوبھی''اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مغربی اور یہودی میڈیا اسلام سے،مسلمانوں سے اورعربوں سےکیسی نفرت کا صور پھونکتا ہےاوردنیاکےسامنےان کی کیسی تصویر بناتا ہے۔

دوسری طرف ٹی،وی اوردوسرے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ عالم عرب میں بے حیائی وفحاشی کوفروغ دینے کی بھرپورکوشش کی جارہی ہے، عالم عرب میں اپنی ذہانت اورقائدانہ صلاحیت کے اعتبار سے مصرکوایک امتیازی مقام حاصل ہے؛اس لیےسب سے پہلے اورسب سے زیادہ اسی خطہ کومغرب نے اپنا ہدف بنایا ہے۔مصری ٹی،وی کےنوچینلوں سے روزانہ ۱۶۶ / گھنٹے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں، ان میں دینی پروگراموں کا تناسب محض ساڑھے تین فیصد ہے۔(مغربی میڈیا: ۲۰۳)مصرمیں فلمیں اورناولیں ایسے ناموں سے منظرعام پرآرہی ہیں کہ ان ناموں ہی سے شرم و حیااورعفت وپاکبازی کا خون ہوتا ہے،اکثرعرب ممالک میں امریکی اورمغربی فلمیں(جوزیادہ تر یہودیوں کانتیجۂ فکرہوتی ہیں)دیکھی جاتی ہیں،یاان کےعربی ترجمے ناظرین وقارئین تک پہنچتے ہیں ، عالم عرب پران کا نہایت ہی منفی اثر مرتب ہورہا ہے، ہندوستان پر حالیہ برسوں میں مغربی تہذیب وثقافت جس قوت کے ساتھ حملہ آوری ہوئی ہے اورجس تیزی سے مغربی فیشن ہندوستان کےمشرقی سماج کواپنی گرفت میں لیتا جارہا ہے،وہ ایک کھلی حقیقت ہےاورشاید ہی کوئی حساس دل ہوجواس کی کسک کومحسوس نہ کرتا ہو۔

اس لیےضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان ذرائع ابلاغ کی طرف توجہ دیں اورمیڈیا تک رسائی حاصل کریں،ہندوستانی میڈیا پرسنگھ پریوار کےغلبہ کی وجہ سے مسلمانوں کوگذشتہ نصف

صدی میں جونقصان اٹھانا پڑا ہے وہ نا قابلِ تلافی اور نا قابل بیان ہے؛ اس لیے ضروری ہے کہ ذرائع ابلاغ میں مسلمان اپنا اثر ورسوخ بڑھائیں، اس کے لیے منصوبہ بند طریقہ پر چند کام کرنے ہوں گے: اوّل ملک کے مختلف علاقوں سے ذہین و باصلاحیت مسلمان طلباء کو جرنلزم کا کورس کرانا اور انہیں انگریزی اور مقامی زبانوں کے اخبارات وغیرہ میں داخل کرنا، دوسرے جولوگ صحافت کے پیشہ سے وابستہ ہیں یا جو دوسرے ذرائعِ ابلاغ میں مصروفِ کار ہیں، وقتاً فوقتاً مختلف عنوانات سے انہیں دعوت دینا اور مسلمانوں کے مسائل اور اسلام کے بارے میں ان کو صحیح معلومات فراہم کرنا اور ان کی غلط فہمیاں دور کرنا، تیسرے اپنے مسائل آپ پیش کرنے کے لیے ایسے چینل قائم کرنا جس کی پالیسی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو، اس کا خوشگوار تجربہ قطر کا الجزیرہ چینل ہے، جو غلط فہمیوں کو دور کرنے اور حقائق کو پیش کرنے میں بہتر کردار ادا کر رہا ہے اور خود مغربی ممالک تک بھی حقائق کو پہنچانے میں اس نے کسی قدر کامیابی حاصل کی ہے، ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو ایسی تدبیر اختیار کرنی ہوگی، تا کہ برادرانِ وطن کے قلوب میں شکوک وشبہات کے جو کانٹے چبھوئے جارہے ہیں وہ انہیں نکالنے میں کامیاب ہوسکیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا انگریزی اخبار ایک خواب ہے، نہ معلوم کہ تعبیر اس کی قسمت میں ہے یا نہیں؟ یہ بات نسبتاً آسان ہے کہ مختلف علاقوں کی مقامی زبان میں مسلمان اپنا اخبار نکالیں، جیسا کہ اس وقت ملیالم اور گجراتی زبان میں مسلمانوں نے اپنا اخبار نکالنے میں کامیابی حاصل کی ہے، گجرات کے حالیہ فساد میں ظلم و جور کا جو رقص ہوا ہے، اس میں بعض شر پسند گجراتی اخبارات کا بنیادی کردار ہے، جنہوں نے واقعات کو توڑ مروڑ کر غلط طریقہ پر پیش کیا اور ہندو عورتوں کی عصمت ریزی کی غلط اطلاع نے آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا ہے۔ ان حالات میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمان مقامی زبانوں خاص کر ہندی میں اپنا اخبار نکالیں، کم سے کم ہندی، تمل، مراٹھی، اڑیا اور بنگالی زبانیں ایسی ہیں کہ صرف مسلمان قارئین کے ذریعہ اخبار کو زندہ رکھا جاسکتا ہے۔

غرض ذرائع ابلاغ عصرنو کا طاقتور ہتھیار ہے اور اس میں اپنا اثر ورسوخ پیدا کرنا اور اس رسوخ کو دینی اور قومی مفادات کے لیے استعمال کرنا وقت کا بہت بڑا اجہاد!

۱۹ / دسمبر ۲۰۰۸ء

ظلم کے خلاف احتجاج

''تابعین''، یعنی جن بزرگوں نے صحابہ ﷡ کو دیکھا ہے، ان میں ایک معروف اور صاحب عزیمت بزرگ امام سعید بن جبیرؒ گزرے ہیں، یہ حضرت عبداللہ بن عباس ﷛ کے خاص شاگردوں میں تھے، اس کے علاوہ حضرت علی ﷛، حضرت عبداللہ بن عمر ﷛ اور بہت سے صحابہ ﷡ سے ملاقات اور استفادہ کا موقع ملا تھا، ان کی شہادت ۹۵ھ میں حجاج بن یوسف کے ہاتھوں ہوئی، حجاج ظلم و جور کا پیکر تھا، حضرت حسن بصریؒ کے بقول: اگر تمام امتوں کے ظلم کو جمع کیا جائے اور امت محمدیہ میں صرف حجاج بن یوسف کے ظلم کو ایک پلڑے میں رکھا جائے تو حجاج کا ظلم بڑھ جائے گا، سعید بن جبیرؒ حضرت علی ﷛ کے قدر شناسوں اور اہل بیت سے محبت رکھنے والوں میں سے تھے اور حجاج کی اہل بیت سے بغض و عداوت اپنی انتہاء کو پہونچی ہوئی تھی؛ اس لئے عرصہ سے وہ سعید بن جبیر کی تلاش میں تھا اور یہ اس ظالم سے چھپے ہوئے تھے۔

آخر حجاج کے جاسوسوں اور لالچی خوشامدیوں نے گرفتار کر کے حجاج کے حوالہ کر دیا، آپ جب حجاج کے پاس لے جائے گئے تو اس سے پوچھا: تمہارا نام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: سعید بن جبیر، حجاج نے کہا: تم شقی بن کسیر ہو، ''سعید'' کے معنی ''نیک بخت'' اور ''شقی'' کے معنی ''بدبخت'' کے ہیں، ''جبیر'' ٹوٹی ہوئی چیز کے پورے کرنے والے کو کہتے ہیں، اور ''کسیر'' ٹوٹی ہوئی شئ کو، گویا حجاج نے امام سعید بن جبیر کی تحقیر کے لئے ان کے نام کے بالکل برعکس اہانت آمیز نام ان کے لئے استعمال کیا، آپ نے فرمایا: میری ماں بمقابلہ تمہارے میرے نام سے زیادہ واقف تھی، حجاج نے کہا: تو بھی بدبخت ہے اور میری ماں بھی بدبخت ہے، آپ نے فرمایا: غیب کا علم تم کو نہیں ہے، اللہ کو ہے، حجاج نے کہا: میں تم کو اس دنیا کے بدلے شعلہ بار دوزخ میں پہنچادوں گا، آپ نے

فرمایا: اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ تمہارے اختیار میں ہے، تب تو میں تم کو خدا بنالیتا۔

حجاج نے پوچھا: محمد (ﷺ) کے بارے میں تم کیا کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: وہ تو نبی رحمت اور امام ہدایت ہیں اور اگلے پچھلے تمام انسانیت سے بہتر ہیں۔

حجاج نے پوچھا: ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ آپ نے کہا: وہ تو صدیق، خلیفۂ رسول تھے، اور سعادت و نیک بختی کے ساتھ انہوں نے زندگی گزاری، نیز انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے طریقہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی، حجاج نے پوچھا: عمر (رضی اللہ عنہ) کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟ آپ نے فرمایا: وہ فاروق ہیں، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے پسندیدہ تھے، اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے طریقہ پر زندگی گزاری، حجاج نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی؟ آپ نے کہا: انہوں نے جیش عسرت (غزوۂ تبوک) کے لئے سامانِ رسد فراہم کیا، بئر روضہ (ایک کنواں کا نام) کو مسلمانوں کے لئے حاصل کیا، جنت میں اپنا گھر خریدا، یعنی ایک خاص موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اس کی بشارت دی تھی، نیز وہ ظلماً شہید کئے گئے، حجاج نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں دریافت کیا؟ آپ نے فرمایا: وہ رسول اللہ ﷺ کے چچازاد بھائی تھے، انہیں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہوا، وہ صاحبزادی رسول حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر تھے، اور حضرات حسنین کے والد۔

حجاج نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ان کی رائے دریافت کی؟ آپ نے فرمایا: تم اس سلسلہ میں زیادہ واقف ہو، حجاج نے کہا: تم اپنے علم کے مطابق واضح کرو، آپ نے کہا: میں جو کہوں گا اس سے تمہیں خوشی نہیں ہوگی، حجاج نے دوبارہ اصرار کیا، آپ نے کہا: اس سلسلہ میں مجھے معاف رکھو، حضرت سعید بن جبیر نے یہ بات اس لئے کی کہ مسئلہ خلافت میں حضرت علی مرتضی کرم اللہ وجہہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان جو اختلاف ہوا، اس میں وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برحق سمجھتے تھے، جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی نقطۂ نظر یہی تھا، اور اہل سنت والجماعت کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے، جب کہ حجاج حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حمایت میں اتنا غلو کرتا تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو برسر منبر برا بھلا کہنے میں بھی اس کو جھجک نہیں تھی اور اللہ سے بے خوف ہو کر یاوہ گوئی کرتا رہتا تھا۔

حجاج نے کہا کہ میں تم کو اتنی بے دردی سے قتل کروں گا کہ نہ تم سے پہلے کسی کو اس طرح قتل

کیا اور نہ آئندہ کروں گا ، امام سعید بن جبیرؒ نے فرمایا: پھر تو تم میری دنیا خراب کروگے اور اپنی آخرت، حجاج نے پوچھا: تم کس طرح قتل ہونا پسند کروگے؟ آپ نے فرمایا: یہ تو تم اپنی پسند سے کرو؛ کیوں کہ جس طرح تم مجھے قتل کروگے، آخرت میں اللہ تعالی تجھے اسی طرح قتل کریں گے، حجاج نے کہا: کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں معاف کردوں؟ آپ نے فرمایا: اگر اللہ معاف کردیں تو ٹھیک ہے اور اگر تم معاف کرنا چاہتے ہو تو مجھے تم سے کوئی معذرت کرنی نہیں ہے، حجاج نے اپنے جلاد کو بلایا کہ تلوار اور چمڑے کا وہ ٹکڑا لائے جسے مقتول کے نیچے بچھایا جاتا تھا، امام سعید بن جبیرؒ بے ساختہ ہنسنے لگے، حجاج کے غصہ کی آگ اور تیز ہوگئی ، اس نے پوچھا یہ قتل ہوتے ہوئے تمہارے ہنسنے کا باعث کیا ہوا؟ آپ نے فرمایا: میں یہ سوچ کر ہنسا کہ تم اللہ کے مقابلہ کتنے جری ہو اور اللہ تمہارے سلسلہ میں کتنے حلیم و بردبار ہیں، حجاج کوئی جواب نہیں دے سکا اور اس نے قتل کا حکم جاری کردیا، آپ نے قبلہ کی طرف اپنا رخ کیا اور وہی آیت پڑھی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پڑھی تھی: {إني وجّهت وجهي للّذي فطر السمٰوٰت والأرض حنيفا وما أنا من المشركين} یعنی میں نے اپنا رخ زمین و آسمان کے خالق کی طرف پوری یکسوئی اور تابعداری کے ساتھ کرلیا، اور میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرا سکتا۔

حجاج نے چڑھ کر آپ کا چہرہ قبلہ کی طرف سے پھیر دیا، آپ نے پڑھا: ''فأينما تولوا فثم وجه الله'' جدھر بھی رخ کرو اللہ ہی کا رخ ہے، حجاج نے جل بھن کر کہا: اسے زمین پر اوندھا کردو، آپ نے پڑھا: {منها خلقناكم وفيها نعيدكم ومنها نخرجكم تارة أخرى} حجاج نے اپنی بدبختی کو انتہاء پر پہنچاتے ہوئے کہا کہ اسے ذبح کردو، چنانچہ حضرت سعید بن جبیر کو ذبح کردیا گیا، انہوں نے شہید ہوتے ہوئے تین بار کلمہ طیبہ پڑھا، اور تیسری دفعہ کلمہ پورا ہونے سے پہلے ہی آپ کی زبان بند ہوگئی، آپ کا مستجاب الدعوات ہونا لوگوں میں معروف تھا، چنانچہ آپ نے اخیر وقت میں دعاء فرمائی کہ اے اللہ! اس کو میرے بعد کسی اور کے قتل پر مسلط نہ فرما! تذکرہ نگاروں نے نقل کیا ہے کہ حالاں کہ ان کی عمر اس وقت ۵۷ سال کی تھی ؛لیکن شہادت کے وقت بہت خون نکلا، جب حجاج نے اطباء سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے اس کی وجہ بتائی کہ قتل کئے جانے کے وقت ان کا قلب نہایت پرسکون تھا؛ اس لئے خون اپنے معمول کے مطابق موجود تھا، امام سعید بن جبیر کی

شہادت پر امام احمد نے فرمایا کہ حجاج نے ایک ایسے شخص کو قتل کیا ہے کہ روئے ارض پر کوئی ایسا شخص نہیں جو ان کے علم کا محتاج نہ رہا ہو۔

ادھر حجاج کا حال یہ ہوا کہ پندرہ ہی دنوں میں ہلاک ہوگیا، اس کے پیٹ میں نہایت تکلیف دہ زخم ہوگیا جس میں کیڑا پڑ گیا تھا، جو اسے تڑپا تا رہتا تھا، اسے احساس تھا کہ سعید بن جبیر کی بددعاء اس کو اپنی گرفت میں لئے ہوئی ہے، چنانچہ چیختا رہتا تھا: ''مالی وسعید؟''یعنی سعید کے ساتھ میرا کیا معاملہ ہوگا؟ وہ اس دن سے سو نہیں سکا، وہ کہتا تھا، جب بھی میں سونا چاہتا ہوں، سعید میرے پاؤں کو پکڑ لیتا ہے، آج سعید بن جبیر کی عظمت کے سامنے پوری امت کی چشم احترام جھک جاتی ہے، دوسری طرف حجاج بن یوسف کا ظلم و جور بھی ضرب المثل سا ہوا ہے، اور اسی حیثیت سے اس کا نام لیا جاتا ہے؛ حالاں کہ حجاج سے قرآن مجید کی ایک خدمت بھی منسوب ہے؛ لیکن وہ رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کا مصداق ہے کہ اللہ تعالی فاسق وفاجر لوگوں سے بھی اپنے دین کی خدمت لے لیا کریں گے: ''**إن الله ليؤيد هذا الدين برجل فاجر**''

حجاج کے مظالم کا بازار عالم اسلام کے جس خطہ میں گرم تھا وہ ''عراق'' ہے پھر جب بنو امیہ کا زوال ہوا اور بنو عباس برسر اقتدار آئے تو عباسی فرمارواؤں میں بھی ایک ایسا ظالم حکمراں سامنے آیا، جس کی خونریزی اور خون آشامی کی وجہ سے تاریخ میں اس کا نام ہی ''سفاح'' پڑ گیا، اس نے نہ صرف زندوں کو اپنا نشانہ بنایا، بلکہ بنو امیہ کی قبریں تک کھود ڈالیں اور مُردوں کو بھی نہیں بخشا، عجیب اتفاق ہے کہ عراق کی سرزمین بار بار ظالم حکمرانوں کے ستم کا نشانہ بنتی رہی ہے، کئی آمروں اور ڈکٹیٹروں نے اس ملک میں خون کے دریا بہائے ہیں؛ لیکن ماضی قریب میں امریکی صدر بش اور برطانوی وزیر اعظم نے مل کر جو مقتل سجائے ہیں اور ظلم و بربریت کا جو رقص کیا ہے، اس نے پہلے کے سارے مظالم کو مات کر دیا ہے، امریکہ اور مغرب کی بے معنی جنگ نے تقریباً ۱۲ / لاکھ مردوں عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو شہید کر دیا ہے، زخم کھانے والوں کا بے آبروئی سہنے والوں اور بے گھر اور بے در ہو جانے والوں کی مقدار اس کے علاوہ ہے۔

عراق کے نہتے عوام اس جور وظلم کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھے، لیکن آخر وہ اپنی، دلوں کی نفرت کو کس طرح چھپاتے؟ اور اپنے ملک میں سجنے والے مقتلوں کو دیکھ کر کس قدر ضبط سے کام

لیتے ؟ چنانچہ جب بش وداعی خطاب کے لئے پہنچے اور امیدوں کا خواب سجا کر بغداد گئے، کہ ان کی خوب پذیرائی ہوگی اور عراق میں ان کا شکریہ ادا کیا جائے گا تو ایک صحافی منتظر زیدی سے برداشت نہ ہوسکا، اور اس نے یکے بعد دیگرے اپنے دونوں جوتے بش پر پھینک مارے، اگرچہ بش اس سے بچنے میں کامیاب ہوگئے، گو جوتے کی زد سے وہ بچ گیا ہو؛ لیکن اس کے جھوٹے وقار اور ظالمانہ پندار پر اس سے جو چوٹ لگی ہے، اس نے ایک دلچسپ تاریخی واقعہ کی صورت اختیار کرلی ہے، یہ جوتا عراق وافغانستان سے لے کر شمالی امریکہ تک ہر جگہ دلچسپ موضوع بنا ہوا ہے، بش کے خلاف خود امریکہ میں وہائٹ ہاؤس کے سامنے جوتاریخی ریلی نکالی گئی، جس کمپنی کا یہ جوتا تھا اسے مشرق وسطی، یورپ اور شمالی امریکہ سے ڈیڑھ لاکھ جوتوں کا آڈر مل چکا ہے اور اس نے اپنے کارکنوں میں ڈیڑھ سو ملازمین کا اضافہ کیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس واقعہ سے امریکہ یا بش کا کوئی مادی نقصان نہیں ہوا، لیکن پھر بھی اس واقعہ کی اہمیت ہے ؛ کیوں کہ اسلام ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ برائی کے خلاف جس درجہ کا احتجاج ممکن ہو کیا جائے، اور کم سے کم دل میں اس کے تئیں نفرت وناپسندیدگی کے جذبات ضرور ہونے چاہئیں، یہ جوتے کا ''وداعی تحفہ'' اسی جذبہ نفرت کا اظہار واعلان ہے۔

کیسے کیسے ظالم تھے، جو اپنے آپ کو اس کائنات کا مالک سمجھتے تھے، لیکن آخر ان کی شوکت وسطوت کا ستارہ غروب ہوگیا، جب رات بڑی ہوتی ہے اور تاریکی کی چادر اس پر تنی رہتی ہے تو بعض دفعہ لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ شاید اس رات کے بعد کوئی صبح مقدر نہیں ہے، خدا کی طرف سے دی جانے والی ڈھیل ظالموں کی جرأت بڑھاتی جاتی ہے، اور مظلوموں کی ناامیدیوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ؛ لیکن کوئی رات ایسی نہیں جس کی صبح نہ ہو اور کوئی خزاں ایسی نہیں جس کے دامن میں بہار کا پیغام بھی موجود نہ ہو، البتہ ضروری ہے کہ قوموں میں ظالم کو ظالم کہنے کی جرأت باقی رہے، ظلم سے نفرت اور مظلوموں سے ہمدردی کا جذبہ اس کے اندر موجزن ہو اور خدا کی قدرت سے ناامیدی سے وہ اپنے آپ کو بچائے رکھے تو ظالموں کا آخری انجام ہزیمت ورسوائی ہے، اور مظلوموں کے لئے بالآخر ظفرمندی وسرفرازی مقدر ہے : { لا تهنوا و لا تحزنوا و أنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين } !!

۲/جنوری۲۰۰۹ء

یوگا — ایک تجزیہ

اسلام کی نظر میں صحت اللہ کی امانت ہے، اس کی حفاظت نہ صرف جائز ؛ بلکہ واجب ہے، کوئی بھی ایسا عمل، جو انسانی صحت کو برباد کرنے والا ہو، درست نہیں ؛ اسی لئے شریعت میں ایسی چیزوں کو منع فرمایا گیا ہے، جو نشہ پیدا کرنے والی، یا جسم کو نقصان پہونچانے والی ہو، نشہ آور چیزوں کو ''مسکر'' کہتے ہیں اور نقصان دہ چیزوں کو'' مفتر'' :''**نهى النبی ﷺ عن كل مسكر و مفتر**'' (سنن أبي داؤد، کتاب الأشربۃ، باب النہی عن المسکر ،حدیث نمبر:۳۶۸۶) —— اسلام میں صفائی ستھرائی کا ایک پورا نظام مقرر کیا گیا ہے، قضاء حاجت کے ساتھ استنجاء کو ضروری قرار دیا گیا ہے، ہر نماز کے لئے وضوء لازم کیا گیا ہے، ایسے اسباب کی بناء پر غسل واجب قرار دیا گیا، جن کی بار بار نوبت آتی ہے، ناخن کاٹنے کی ترغیب دی گئی، ختنہ کا حکم دیا گیا، جسم کا فاضل بال صاف کرنے کو فرمایا گیا، سوتے وقت چراغ بجھا دینے کو کہا گیا؛ کیوں کہ اس کا دھواں انسان کے لئے نقصان دہ ہے، زمین، فضا اور پانی کو آلودگی سے بچانے کی ہدایت کی گئی، غور کیا جائے تو ان سب کا مقصد صحت انسانی کی حفاظت اور بیماریوں سے بچاؤ ہے۔

دوسری طرف علاج کی ترغیب دی گئی اور طبی تحقیق کرنے والوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے آپ ﷺ نے فرمایا: بوڑھاپے اور موت کے سوا کوئی بیماری ایسی نہیں، جس کے لئے اللہ نے دوا نہ پیدا فرمائی ہو:

''**إن اللّٰہ عز و جل لم ينزل داء إلا أنزل له دواء إلا الموت**''

(المعجم الکبیر ،حدیث نمبر:۸۹۶۹)

ایسے کھیلوں کی اجازت دی گئی، جو جسم کو توانائی کو برقرار رکھنے میں مدد و معاون ہو، جیسے گھوڑ

سواری، دوڑ، تیر اندازی اور کُشتی وغیرہ؛ کیوں کہ یہ صحت کی برقراری کے لئے فطری علاج کا درجہ رکھتے ہیں؛ اس لئے ایسی ورزشیں جو صحت کی حفاظت میں مددگار ہو اور جن کے ذریعہ انسان بیماریوں سے بچ سکتا ہو، جائز ہی نہیں مستحسن ہے، اس طرح کی ورزشیں زمانہ قدیم سے مروج رہی ہیں، مسلمانوں کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا؛ بلکہ بعض حضرات کا تو خیال ہے کہ نماز کی حرکات وسکنات میں بھی بندگی کے ساتھ ساتھ صحت و زندگی کا پہلو ملحوظ ہے اور نماز کے مختلف افعال کے ذریعہ جسم کے مختلف جوڑ اور ہڈیوں کی ورزش بھی ہوتی جاتی ہے، اس زمانہ میں ورزش کے جو طریقے نکلے ہیں، ان میں ایک جوڈو، کراٹے بھی ہیں، جس کے ذریعہ انسان کے اندر مدافعت کی قوت بھی بہم پہونچتی ہے، ورزش میں بنیادی طور پر یہ بات ضروری ہے کہ ستر کا لحاظ رکھا جائے اور جسم کے جن حصوں کو چھپانا شرعاً واجب ہے، انہیں چھپایا جائے، افسوس کہ ورزش کی بہت سی صورتوں میں اس کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے اور محض ایک چڈی پہن کر کُشتی کھیلی جاتی ہے یا ورزش کی جاتی ہے، یہ صورت یقیناً ناشائستہ اور اخلاق کے مغائر ہے، اس اصول کی رعایت کے ساتھ ورزش کی جو بھی صورت ہو، وہ شرعاً جائز ہوگی، آج کل تو اس کے لئے بڑے بڑے ''جیم'' وجود میں آچکے ہیں، جس میں وزن اٹھانے، گھونسہ مارنے، مشینی سائکلیں چلانے اور جسم کے مختلف اعضاء کی تقویت کے لئے مخصوص ورزشیں کرنے کا انتظام ہے، بلکہ اس کے لئے مربی بھی ہوتے ہیں، جیسا کہ عرض کیا گیا، اگر ستر کی رعایت کے ساتھ یہ ورزشیں ہوں، تو کوئی قباحت نہیں؛ بلکہ ایک حد تک ان کو مستحب بھی کہا جاسکتا ہے۔

''یوگا'' — جو اس وقت پوری دنیا میں رواج پا رہا ہے، اور جسے عام طور پر ہندوستان کی ایجاد سمجھا جاتا ہے — بھی بظاہر ورزش کی ایک صورت معلوم ہوتی ہے، یوگا سیکھانے والوں کا دعوی یہی ہے کہ یہ ورزش کا ایک طریقہ ہے، یوگا کے مقاصد اور اس کے فوائد اتنے زیادہ بتائے گئے ہیں کہ گویا یہ ہر بیماری کے لئے اکسیر ہے، یوگا کے مقاصد اور اس کے طریقۂ کار کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے بارے میں مسلمانوں کی طرف سے دو مختلف نقطۂ نظر سامنے آئے ہیں، بعض حضرات نے یوگا کے مقاصد پر نظر رکھا ہے کہ اس کے ذریعہ صحت کا حصول اور جسمانی تقویت مقصود ہے اور یہ جائز مقاصد ہیں؛ اس لئے یوگا کرنے میں کوئی حرج نہیں؛ البتہ اتنی احتیاط کرنی

چاہئے کہ جب غیر مسلم شرکاء ''اوم'' کہیں '' تو مسلمان ''اللہ'' کہیں، اس نقطۂ نظر کا اظہار زیادہ تر مسلمان دانشوروں کی جانب سے ہوا ہے، ارباب افتاء کی طرف سے غالباً اس طرح کی بات سامنے نہیں آئی ہے، ایک مشہور معتبر ادارہ کے ذمہ دار کی طرف سے یہ بات ضرور کہی گئی ہے، مگر وہاں کے دارالافتاء نے اس سلسلہ میں فتویٰ صادر نہیں کیا ہے۔

بعض اہل علم نے یوگا کے طریقۂ کار پر نظر رکھا ہے، انہوں نے اسے ناجائز قرار دیا ہے؛ کیوں کہ یوگا میں جو حرکات وسکنات اور جسم کے لئے جو وضع اختیار کی جاتی ہے، وہ بدھسٹوں اور ہندوؤں کے طریقۂ عبادت سے کافی ملتی جلتی ہے، جیسے ایک خاص وضع پر بیٹھنا، ہاتھ جوڑنا، ہاتھ جوڑ کر اور پیشانی سے لگا کر نمسکار کرنا، اوم کہنا وغیرہ، اس کے علاوہ سورج پرستی کا رنگ بھی اس میں نمایاں ہے؛ کیوں کہ سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کے وقت یوگا کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے اور اسی کی طرف رخ کر کے ورزش کی جاتی ہے، جن حضرات نے اس پہلو کو سامنے رکھ کر یوگا کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا ہے، ان میں عالم اسلام کے علماء کی بڑی تعداد ہے، انڈونیشیا میں علماء کی مجلس نے اس کو حرام قرار دے دیا ہے، ملیشیا کی مجلس اسلامی نے بھی اسے ناجائز کہا ہے، یہ بات بھی ظاہر ہے کہ بدھسٹوں کے قریب ہونے کی وجہ سے ان ممالک کے لوگ ان کے طریقۂ عبادت سے زیادہ واقف ہیں، عالم عرب کے اہل علم نے بھی عام طور پر یہی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے، اس سلسلہ میں مصر کے مفتیٔ اعظم شیخ علی جمعہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، سعودی عرب اور کویت کے اہل علم نے بھی اسے ناجائز ہی سمجھا ہے۔

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ جو لوگ یوگا کرتے ہیں، وہ ہندو یا بدھ عقائد پر یقین رکھتے ہیں، ان کا مقصد تو عام طور پر ورزش اور حفظانِ صحت ہوتا ہے؛ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام میں غیر مسلموں کا تشبہ اختیار کرنے کو منع کیا گیا ہے، یوں تو تہذیبی اور تمدنی جہتوں سے بھی غیر مسلموں کی مماثلت اختیار کرنے کو منع کیا گیا ہے؛ لیکن غیر مسلم جن کاموں کو مذہبی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں، ان کی مشابہت سے بچنے کا زیادہ تاکیدی حکم آیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے مختلف ہدایات کے ذریعہ اس کو مؤکد فرمایا ہے، جیسے: یہود یوم عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے، آپ ﷺ نے اس کے ساتھ ایک اور روزہ کے اضافہ کا حکم دیا، یہود رات کا کچھ حصہ گذرنے کے بعد روزہ افطار کرتے تھے، آپ

ﷺ نے مسلمانوں کو غروب آفتاب کے ساتھ ہی روزہ افطار کرنے کا حکم فرمایا، عیسائی حضرات روزہ میں گفتگو کو بھی ممنوع سمجھتے تھے، اسلام میں نہ صرف اس کی اجازت دی گئی؛ بلکہ روزہ کی وجہ سے ترک گفتگو کو بھی منع کیا گیا، سورج پرست قومیں طلوع آفتاب، غروب آفتاب اور جس وقت سورج نصف آسمان پر ہو، اس وقت سورج کی عبادت کیا کرتی تھیں، رسول اللہ ﷺ نے ان تینوں اوقات میں نماز پڑھنے کو منع فرمایا؛ چنانچہ فقہاء قریب قریب اس بات پر متفق ہیں کہ ان تینوں اوقات میں نوافل یا فرائض کا پڑھنا جائز نہیں۔

شریعت کے اس مزاج کو فقہاء و محدثین نے ہر جگہ برتنے کی کوشش کی ہے، اس طرح نماز پڑھنا کہ نمازی کے عین سامنے چراغ جل رہا ہو، اسے آتش پرستوں ک مشابہت کی وجہ سے منع کیا گیا، چوں کہ بعض قومیں ہتھیار کی اور بعض قومیں جانوروں کی پرستار تھیں؛ اس لئے مشہور محدث امام بخاریؒ اپنی کتاب میں یہ عنوان قائم کرنے پر مجبور ہوئے کہ ''نمازی کے سامنے جانور یا ہتھیار رکھ سکتے ہیں یا نہیں؟'' اس طرح نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے کہ کوئی تصویر نمازی کے سامنے ہو؛ کیوں کہ اس سے تصویر پرستی کی بو آتی ہے، جو بہت سی مشرک قوموں میں مروج ہے، اس بات کو بھی پسند نہیں کیا گیا کہ نمازی کے عین سامنے کوئی شخص اس طرح بیٹھا یا کھڑا ہو کہ اس کا چہرہ نمازی کی طرف ہو کہ بادشاہ پرست قومیں اس طرح اپنے بادشاہوں اور بزرگوں کی پرستش کیا کرتی تھیں، غرض کہ قدم قدم پر اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ ظاہری طور پر بھی مسلمانوں کے طریقۂ عبادت میں غیر مسلموں کے طریقۂ عبادت سے مماثلت نہ پیدا ہو۔

اگر اس پہلو کو سامنے رکھا جائے، تو یہ بات سمجھ میں آتی کہ صرف ورزش ہونے کی بناء پر یوگا کو جائز قرار دینا درست نہیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے طریقۂ کار میں غیر مسلموں سے مشابہت کے رنگ کو سامنے رکھا جائے، اس میں شبہ نہیں کہ ''یوگا'' کے حرکات وسکنات عام ورزشوں کی طرح محض ایک ورزش نہیں، بلکہ اس میں مذہبی رنگ بھی ہے یا کم سے کم مذہبی شخصیتوں نے اس فن کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس میں مذہبی رنگ پیدا کر دیا ہے، جب ہی اس میں ''نمسکار'' بھی ہے، ''اوم'' کا لفظ بھی ادا کیا جاتا ہے، جو لوگ اس کی تربیت دیتے ہیں، وہ خود مذہبی شخصیت ہیں اور اپنی وضع قطع میں پوری طرح مذہب کی نمائندگی کرتے ہیں اور عام طور پر مذہبی چمتکار کے طور پر اسے

دیکھا جاتا ہے، بعض دفعہ خیال ہوتا ہے کہ ہندوستان میں سنگھ پریوار والوں کا کہنا ہے کہ ''ہندوتوا'' تمام ہندوستانیوں کی تہذیب کا حصہ ہے اور ان کے مشترک طریقۂ زندگی سے عبارت ہے؛ اس لئے تمام مذہب والوں کو اس میں شریک ہونا چاہئے، کہیں ایسا تو نہیں کہ یوگا اسی کوشش کا حصہ ہو اور اس کا مقصد بالواسطہ طریقہ پر ہندوستان میں بسنے والی مذہبی اقلیتوں کا ہندوکرن کرنا ہو۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آدمی جب کسی عمل میں شریک ہوتا ہے، تو آہستہ آہستہ اس سے مانوس ہوتا جاتا ہے، بیگانگت دور ہونے لگتی ہے اور انسان کے لئے وہ عمل قابلِ قبول ہو جاتا ہے؛ اسی لئے جو مسلمان غیر مسلم بھائیوں کے ماحول میں شب و روز رہتے ہیں اور ان کی مذہبی اور تہذیبی تقریبات میں شرکت کرتے رہتے ہیں، وہ آہستہ آہستہ فکری طور پر اسے قبول کرتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض دفعہ اپنی شناخت کو گم کر جاتے ہیں، ارتداد کا خطرہ ان پر منڈلاتا رہتا ہے؛ اس لئے ''یوگا'' کی مروجہ شکل کو اگر ہم حرام نہ کہیں، تو اس کے مکروہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں، مسلمانوں کی اس میں شرکت ان کے تشخص کے لئے ایک خطرہ ہے اور موجودہ حالات میں جب کہ مسلمانوں کو غیر مسلم سماج میں ضم کرنے کی مسلسل کوششیں ہو رہی ہیں اور ان کے اپنے دین پر ثابت قدمی کو شدت پسندی اور بنیاد پرستی کا نام دیا جا رہا ہے، انہیں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے کہ کہیں ان کو پھنسانے کے لئے کوئی دامِ ہم رنگ زمین تو نہیں بچھایا جا رہا ہے۔

۲۰/فروری ۲۰۰۹ء

فطرت سے بغاوت

کچھ عرصہ پہلے ہندوستان کی راجدھانی دہلی کی یادگار جگہ ''انڈیا گیٹ'' پر ایک احتجاجی ریالی نکالی گئی، یہ لوگ حکومت کے خلاف مظاہرہ کررہے تھے اور مطالبہ کررہے تھے کہ ہندوستان میں مرد کی مرد سے اور عورت کی عورت سے شادی کی اجازت دی جائے، یہ واقعہ اس لئے زیادہ اہم ہے کہ مرکزی وزیر ڈاکٹر داس کا بھی یہی نقطۂ نظر تھا کہ اگر دو مردوں یا دو عورتوں کی باہمی رضامندی سے ہم جنسوں میں نکاح کیا جارہا ہے تو اسے قانونی تحفظ دیا جائے اور جرم نہیں سمجھا جائے، نیز ضابطہ فوجداری ہند آئی، پی، ایل کے تحت مذکور جرائم کی فہرست سے اسے نکال دیا جائے، چنانچہ یہ معاملہ اب کچھ لوگوں کی طرف سے سپریم کورٹ تک پہنچ چکا ہے اور سپریم کورٹ نے مرکزی حکومت سے اپنا موقف واضح کرنے کو کہا ہے، اس سلسلہ میں جہاں وزارت صحت ہم جنسی کے نکاح کو درست قرار دینے کے حق میں ہے، وہیں وزارت داخلہ اس کے خلاف ہے اور اس کا کہنا ہے کہ اس سے بہت سے مسائل کھڑے ہوجائیں گے اور اس کے ناجائز استعمال کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔

حکومت نے ابھی اس پر اپنا جواب داخل نہیں کیا ہے؛ لیکن اس وقت ہندوستان پر ترقی کا جونشہ سوار ہے اور جس کے لئے وہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو مغربی اقوام اور حکومتوں کا دست نگر سمجھتا ہے، اس کے تحت اگر ہندوستان کبھی مغربی ملکوں کے دباؤ میں آکر اس طرح کی قانون سازی کو قبول کرے اور اسے جائز قرار دے دے تو اس پر حیرت نہیں ہونی چاہئے؛ کیوں کہ انسانی نفسیات یہ ہے کہ جب اس میں معاشی فارغ البالی کی طمع پیدا ہوجاتی ہے تو اس کے لئے خوشامد اور خود سپردگی کی کوئی سرحد باقی نہیں رہتی اور اپنے عزت ووقار کا سودا کرنا بھی اس کے لئے آسان

ہو جاتا ہے۔

خدا نے انسان کی صنفی ضرورت کو پورا کرنے ہی کے لئے مردوں اور عورتوں کو پیدا فرمایا ہے اور یہ نظام ابتداء انسانیت سے ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور بہشت کو ان کا مسکن بنایا، جہاں راحت وسکون کے تمام اسباب موجود تھے؛ لیکن پھر بھی اسے کافی نہیں سمجھا گیا اور حضرت حواء علیہا السلام کی شکل میں ایک عورت کو حضرت آدم علیہ السلام کا جوڑا بنایا گیا: {وَ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا} (النساء: ۱)؛ کیوں کہ زندگی گزارنے کے لئے مرد اور عورت کی رفاقت سے صرف انسان کی صنفی خواہشات ہی پوری نہیں ہوتی ہے؛ بلکہ اس سے نسل انسان کی افزائش بھی ہوتی ہے، خاندان وجود میں آتے ہیں اور انسان کے اندر صنف مخالف کی طرف رغبت کی جو فطری کیفیت رکھی گئی ہے، اس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے لئے سکون کا ذریعہ بنتے ہیں، نیز انسان کو خوشگوار زندگی گزارنے کے لئے تقسیم کار کی ضرورت ہوتی ہے کہ ایک فریق گھر کے باہر کے کام کرے اور ایک فریق گھر کے اندر کی دنیا کو دیکھے، ایک فریق سے بچوں میں کسی قدر خوف ہو اور دوسرا فریق اس کے لئے پیار و محبت کا پیکر ہو، مردوں اور عورتوں کی چوں کہ صلاحیتیں الگ الگ ہیں؛ اس لئے ان دونوں کا اشتراک تقسیم کار میں معاون ہوتا ہے، اگر دونوں فریق ایک ہی طرح کی صلاحیتوں کے حامل ہوتو معاشرتی زندگی کے امور کی ان کے درمیان مناسب طور پر تقسیم نہیں ہو پائے گی۔

غرض کہ ازدواجی زندگی کا مرد اور عورت کے ذریعہ وجود میں آنا خدا کی بنائی ہوئی فطرت ہے، اس کی خلاف ورزی درحقیقت قانون فطرت سے بغاوت ہے اور خدا کی بنائی ہوئی فطرت سے بغاوت ایسا جرم ہے کہ آخرت سے پہلے دنیا ہی میں انسان کو اس کی سزا دی جاتی ہے، خواہ افراد کو ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے انفرادی طور پر دی جائے یا پوری قوم یا اس کا غالب حصہ اجتماعی حیثیت میں بداعمالی کا مرتکب ہو اور اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے، چنانچہ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ سب سے پہلے اس برائی میں جو قوم مبتلا ہوئی، وہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم تھی، جو اردن میں بحر مردار کے جنوب میں واقع سدوم نامی شہر میں قیام پذیر تھی؛ چنانچہ اسی لئے اس برائی کا نام عربی زبان میں لواطت اور لاطینی زبان میں سدومی (sodomy) پڑ گیا، قرآن مجید میں اس قوم کی بدخصلتی،

حضرت لوط علیہ السلام کی طرف سے اصلاح کی کوشش اور پھر اس قوم پر اللہ کے غیر معمولی عذاب کا تفصیل سے نقشہ کھینچا گیا ہے:

''اور اسی طرح ہم نے لوط کو پیغمبر بنا کر بھیجا، جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ کیا تم لوگ ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو کہ تم سے پہلے ساری دنیا جہاں میں کسی نے ایسا نہیں کیا؟ (وہ یہ کہ) تم عورتوں کو چھوڑ کر خواہش نفسانی پوری کرنے کے لئے مردوں پر مائل ہوتے ہو، حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ حد سے گذر جانے والے ہو اور لوط کی قوم سے اس کے سوا کچھ جواب نہ بن پڑا کہ وہ (آپس میں) کہنے لگے کہ ان لوگوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو، کہ یہ بڑے پاک بنتے ہیں، تو ہم نے لوط کو اور ان کے گھر والوں کو تو بچالیا، مگر اس کی بیوی (نہ بچی) کہ وہ انہی لوگوں میں رہی جو عذاب میں رہ گئے تھے اور ہم نے ان پر پتھروں کا مینہ برسایا تو دیکھو ان مجرموں کا انجام کیسا ہوا؟''

(الأعراف :۸۰-۸۴)

قرآن مجید کا یہ بیان اور اس فعل کی وجہ سے عذاب الٰہی کا نزول ہی اس برائی کی شناعت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے؛ لیکن اس کے علاوہ حدیثوں میں بھی کثرت سے اس کی مذمت کا ذکر آیا ہے، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تم جس قوم کو لوط کا عمل کرتے ہوئے دیکھو تو اس فعل کا ارتکاب کرنے والے کو بھی قتل کر دو اور اس شخص کو بھی جس کے ساتھ یہ فعل کیا جا رہا ہو، (ترمذی، حدیث نمبر: ۱۴۵۶، ابوداؤد، حدیث نمبر: ۴۴۶۲) حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ قوم لوط کا عمل کرنے والوں پر لعنت ہے، (دیکھئے: جمع الفوائد، حدیث نمبر: ۲۵۹۵) ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کس مرد کے ساتھ برائی کرے یا کسی عورت کے ساتھ غیر فطری راستہ میں برائی کرے، اللہ اس کی طرف نظر رحمت نہیں اٹھائیں گے:

''لا ینظر اللّٰہ إلی رجل أتی رجلاً أو امرأۃ فی الدبر''

(ترمذی، حدیث نمبر: ۱۱۶۶)

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مرد کے مرد کے ساتھ اور عورت کے عورت کے ساتھ جنسی تعلق کو قرب قیامت کی علامتوں میں سے قرار دیا ہے:

" إن من أعلام الساعة وأشراطها أن يكتفي الرجال بالرجال والنساء بالنساء " (طبرانی کبیر، عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حدیث نمبر: ۱۰۵۵٦)

—— آج امریکہ اور مختلف مغربی ملکوں میں ہم جنسی کے نکاح کی یا تو قانونی طور پر اجازت دے دی گئی ہے یا وہ اس کی اجازت دینے کے قریب ہیں، یہ یقینا اسی حدیث کا مصداق ہے، جس کے ممنوع ہونے پر دنیا کے تمام مذاہب متفق ہیں، افسوس کہ یہود ونصاریٰ نے خود اپنے دین اور اپنی مذہبی کتابوں کو اس طرح پس پشت ڈال دیا ہے کہ گویا وہ کوڑا کرکٹ ہیں، بائبل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نکاح میں حضرت سارہ علیہا السلام اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے ہونے کا، حضرت یعقوب علیہ السلام کی بیوی کا، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام اور مختلف پیغمبروں کی ازواج مطہرات کا ذکر موجود ہے، ہندو مذہب میں شری رام جی کی بیوی کی حیثیت سے سیتا جی کا نام مشہور ہے، رام جی کے والد اور والدہ کا ذکر بھی ملتا ہے، رادھا نامی خاتون کرشن جی کی طرف منسوب ہیں، غرض کہ تمام مذہبی کتابوں میں مرد وعورت کے جوڑے کا تصور موجود ہے اور کبھی بھی مرد کی مرد عورت کی عورت کے ساتھ ازدواجی زندگی کا تصور نہیں ملتا ہے، جو لوگ خدا اور مذہب کے منکر ہیں، وہ اس غیر فطری ازدواج کے قائل ہوتے تو شاید کم حیرت ہوتی؛ لیکن افسوس کہ جو لوگ اپنے آپ کو انبیاء کی طرف منسوب کرتے ہیں اور آسمانی کتابوں کے حامل ہونے کے مدعی ہیں، وہی اس وقت فطرت کے خلاف بغاوت میں پیش پیش ہیں۔

مذہب اور اخلاق کی ترازو میں تو یہ ہے ہی جرم عظیم؛ لیکن عقل اور طبی تجربات بھی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ انتہائی نارو فعل ہے، قوم لوط کے بعد یہ برائی جن قوموں میں اجتماعی طور پر پھیلی ان میں قدیم یونان بھی ہے، حد یہ ہوگئی کہ یونانیوں نے اس بے ہودہ فعل کو (Greek love) کا

نام دے دیا، یہاں تک کہ یہ اخلاقی انارکی اس ترقی یافتہ قوم کی مکمل تباہی کا باعث بن گئی، اسی طرح کی صورت حال قدیم ایرانی تہذیب میں بھی پیش آئی، افسوس کہ اس دور میں یہ اخلاقی بیماری نہ صرف واپس آرہی ہے، بلکہ اخلاقی دیوالیہ پن کی انتہاء ہے کہ اسے قانونی جواز بھی دیا جارہا ہے؛ لیکن خدا کی نافرمانی اور فطرت سے بغاوت ایسی چیز ہے کہ وہ انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی، چنانچہ ایڈز کی بیماری کے جو ابتدائی واقعات امریکہ کی ریاست سانفرانسکو میں سامنے آئے، وہ ایسے ہی نوجوان لڑکوں میں، جو ہم جنسوں سے تعلقات رکھتے تھے، پھر بدکردار خواتین تک بھی یہ بیماری پہونچی اور ان کے واسطہ سے پیٹ میں پرورش پانے والے معصوم بچے بھی اس کا شکار ہوئے اور لاکھوں لوگوں کو اس بیماری نے اپنا لقمۂ تر بنالیا۔

یہ بات میڈیکل دنیا میں پوری طرح تسلیم شدہ ہے کہ ایڈز کی بیماری کا بنیادی سبب ہم جنسی ،جنسی انحراف کے دوسرے طریقے اور پاکیزہ زندگی سے محروم ہونا ہے اور اس سے بڑی آفت یہ ہے کہ جب ایک شخص اپنی بدکاری کی وجہ سے اس بیماری کا شکار ہوجاتا ہے تو پھر اس کے ذریعہ بہت سے بے قصور اور معصوم لوگ اس کا شکار بنتے چلے جاتے ہیں، یہ اللہ کی طرف سے ایک طرح کا عذاب ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> ''جب بھی کسی قوم میں بدکاری کی کثرت ہوجائے گی یہاں تک کہ وہ کھلے عام اس کا ارتکاب کرنے لگیں گے ان میں پلیگ اور ایسی تکلیف دہ بیماریوں کا ظہور ہوگا، جو ان کے گذشتہ لوگوں میں کبھی بھی پیدا نہ ہوئی ہوگی''
>
> **''۔۔۔ لم تظهر الفاحشة فی قوم قط ، حتی یعلنوا بها إلا فشا فیهم الطاعون، والأوجاع التی لم تکن مضت فی أسلافهم الذین مضوا''**

(سنن ابن ماجۃ، عن عبداللہ بن عمر ﷺ، حدیث نمبر: ۴۰۱۹)

ہندوستان ہمیشہ سے ایک مذہبی ملک رہا ہے، یہ مختلف مذاہب کا گہوارہ ہے، یہاں بڑے بڑے اخلاقی رہنما اور صوفیا گزرے ہیں، شرم و حیاء اور عزت و پاکدامنی کو ہمیشہ یہاں ایک جوہر

گراں مایہ سمجھا گیا ہے، اس ملک میں ہم جنس پرستی کو جائز قرار دینے کی کوشش نہایت افسوس ناک اور اس سے بڑھ کر شرم ناک ہے، یہ فطرت سے بغاوت اور اللہ کے عذاب کو دعوت دینا ہے؛ اس لئے ہندوؤں، مسلمانوں اور تمام مذہبی فرقوں کا فریضہ ہے کہ وہ باہمی اشتراک واتحاد کے ساتھ اس غیر شریفانہ اور بیہودہ تحریک کو ابتدائی مرحلہ میں ہی ناکام و نامراد بنادیں، عوامی شعور بیدار کریں، نوجوانوں کو اس کی مضرتوں سے آگاہ کریں، حکومت کو ایسی ناشائستہ باتوں کو قبول کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کریں اور مغرب سے تہذیب کے نام پر بدتہذیبی اور عقل کے نام پر بے عقلی اور آزادی کے نام پر نفس اور شیطان کی غلامی کا جو سیلاب آرہا ہے، سب مل کر اس پر بند باندھنے کی کوشش کریں!!

۲۸/نومبر ۲۰۰۸ء